معین بیتی

ڈاکٹر سید معین الحقؒ

معین بیتی

(خود نوشت سوانح ڈاکٹر سید معین الحق صاحب مرحوم)

+++

تصحیح و ترتیب

ڈاکٹر انصار زاہد خان

مسز ممتاز معین الحق

+++

شایع کردہ

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی - کراچی

۳۰ ڈاکٹر معین الحق روڈ

کراچی - ۵

۱۹۹۳

For Mr Raza Ali

with Compliments From

[signature] 28.4.94

Raza Ali

Author, Freelance Journalist

Member:

- ★ Rawalpindi/Islamabad Union of Journalists.
- ★ Council of Social Sciences, Pakistan.
- ★ Trust for Global Peace, Islamabad.
- ★ Pakistan Historical Society, Karachi.
- ★ Pak-India Peoples Forum for Peace & Democracy, Islamabad.

214, St # 100, I-8/4,
Islamabad-Pakistan
Tel: 051-4436744
Mob: 0333-5591890
E-mail: razaali_journalist@hotmail.com

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

مطبوعات نمبر ۸۰

سنہ ۱۹۹۳ء

قیمت -/Rs. 200

فہرست مضامین

صوفیاء

صفحہ

صفحہ

ڈاکٹر سید معین الحق مرحوم سنہ ۱۹۴۸ء میں

ڈاکٹر سید معین الحق مرحوم اپنے چھوٹے بھائی سید رشید الحق صاحب
اور بڑے صاحبزادے سید احمد عبدالحق صاحب کے ساتھ
جو درمیان میں بیٹھے ہیں

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

مورخ عصر جناب محترم ڈاکٹر سید معین الحق رح نے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ تمام عمر پرورش لوح و قلم، درس تدریس اور تحقیق علمی میں مصروف رہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان میں مساعدت حالات کے باوجود پوری جان فشانیوں کے ساتھ جو بنیادی اور اساسی کام کیے ہیں ان میں ایک کارخیر "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" کا قیام ہے۔ یہ سوسائٹی اپنی تاریخ قیام (۱۹۵۰ء) سے تادم تحریر بھرپور مالی تعاون سے محروم رہی ہے اور وزارتوں میں صاحبان اقتدار کی تگ و تاز کا ہدف بھی۔ بہ ایں ہمہ اس سوسائٹی کو یہ کریڈٹ حاصل ہے کہ اس نے عالمی حلقہ ہائے تاریخ کی نظروں میں پاکستان کی لاج رکھی ہے اور ایک سہ ماہی مجلے (سال اجرا ۱۹۵۳) کی معرفت عالم پاکستان کو سربلند اور سرفراز رکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخی تحقیق و تصنیف کی اشاعت میں سوسائٹی کی ہسٹری کانفرنسوں اور علمی تحقیق پر مبنی بے شمار کتب نے اس ملک میں تاریخی تحقیق ومطالعے کی بنیاد بھی رکھی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الحق رح کی زندگی ہمہ جہت عبارت علم و عمل رہی ہے۔ وہ ایک طرف موضوع تاریخ کی بہ ہمہ ہمت آفرینی داد دیتے رہے ہیں دوسری طرف علم و ادب سے ان کی وابستگی

نے ان کو مرتبہ بلند عطا کیا ہے۔ اس کے علی الرغم ڈاکٹر سید معین الحق رح نہایت خاموشی، یکسوئی اور حد درجہ انہاک کے ساتھ سیرت رسول اکرم ص پر فکر و تدبر کرتے رہے۔ انہوں نے سیرت پاک ص کے ناقدین اور خاص طور سے مستشرقین کے افکار کا عالمانہ جائزہ لیا اور تحقیقی نظائر اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کی آراء کا تجزیہ کیا اور محققانہ و عالمانہ انداز میں ان کا تردیدی جواب دیا، جن کے وہ سزاوار تھے۔ انگریزی زبان میں جناب محترم ڈاکٹر سید معین الحق کی یہ تصنیف سیرت نگاری کی ایک منفرد شان رکھتی ہے جو حسن خیال اور تاریخ کے جمال فکر کی آئینہ دار ہے۔

سیرت طیبہ ص کے آخری صفحے پر وہ نظر ثانی کر چکے تھے اور پیش حرف تحریر فرما رہے تھے کہ ان کو وجع القلب نے پریشان کیا اور چند ہی ساعتوں میں وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور شفاعت رسول ص کے حق دار قرار پائے۔

مستزاد یہ کہ نہایت قربت کے باوجود خود مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے محترم ڈاکٹر سید معین الحق رح نہایت خاموشی کے ساتھ "معین بیتی" بھی تحریر فرما رہے ہوں۔

اگر ڈاکٹر صاحب کو "معین بیتی" پر نظر ثانی کا موقع مل جاتا تو شاید وہ اس میں حذف و اضافہ کرتے۔ ان کے رفیق کار محترم جناب ڈاکٹر انصار زاہد خان صاحب اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عالم و فاضل اہلیہ محترمہ ممتاز معین صاحبہ نے اس حق بیتی کو سنبھال لیا اور کسی ترمیم کے بغیر اسے مرتب کرکے شایع کردیا ہے۔

"معین بیتی" نہ صرف ڈاکٹر معین الحق کی کامیاب زندگی کے روز و شب کی ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ ایک دور کی تاریخ سے بھی یہ عبارت ہے۔ یہ ہمہ "معین بیتی" ایک کتاب درس بھی ہے ان لوگوں کے لئے کہ جو اپنی زندگیوں کو مقصدیت دینے کے خواہاں ہیں۔ اچھا ہوا کہ مرحوم نے اپنی پرخار زندگی کے لیل و نہار رقم کردئیے ورنہ یہ بانجھ احسان فراموش ملت ایک انسان رفیع کی خدمات بلند کو فراموش کردیتی۔

حکیم محمد سعید

۲۲ - ستمبر - ۱۹۹۳ء

تمہید

یہ امر میرے لئے واقعی انتہائی مسرت کا باعث ہے۔ کہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اپنے سابق جنرل سکریٹری اور ریسرچ ڈائریکٹر' سید معین الحق مرحوم کی سوانح یاد داشتیں شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت ہی مستحسن اقدام ہے۔ یہ سوانحی مقالہ جس کو ہم برصغیر کی سماجی' معاشرتی' تہذیبی اور مذہبی تاریخ سے تعبیر کرسکتے ہیں' تین دھائیوں پر محیط واقعات پر مشتمل ہے۔ جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص دلکش انداز اور انتہائی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور آن کا یہ منفرد انداز تحریر ہی ہے۔ جو آن کو دوسرے ہم عمر تاریخ دانوں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

اس سوانحی مقالے میں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی زندگی سے لے کر آخری آیام تک کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دلکش اظہار بیان اور دلچسپ انداز تحریر کی نمایاں خصوصیات کے علاوہ اس دستاویز کی ایک بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مختلف النوع موضوعات کا احاطہ' کرتے ہوئے آن سے متعلق بڑی اہم اور قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جن سے برصغیر کی مذہبی' سیاسی اور سماجی ارتقاء پر نہ صرف سیر حاصل روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ بعض ایسے گوشے بھی وا ہوتے ہیں۔ جو اب تک عام قاری کی آنکھ سے اوجھل رہے ہیں۔

تعارف

یہ سنہ ۶۳ کے زمانے کی بات ہے جب میں نے کراچی یونیورسٹی میں .Ph. D کے سلسلہ میں داخلہ کی درخواست دی تھی۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے اس سلسلہ میں بڑی رہنمائی کی۔ داخلہ کی تمام کارروائی مکمل کرائی اور گائیڈ کے لئے ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی صاحب مرحوم کا نام تجویز کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ ادارہ نیشنل کالج سے جہاں میں جولائی سنہ ۱۹۶۳ سے جنرل ہسٹری پڑھا رہا تھا نزدیک ہی ہے لیکن میرا کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے بتائے ہوئے پتہ پر تقریباً نو بجے صبح میں وہاں پہنچ گیا۔ سوسائٹی کے دفتر و لائبریری بالائی منزل پر واقع تھے۔ سردی کا موسم تھا اور وہاں اس وقت صرف ایک معمر صاحب ریسرچ روم کے سامنے کرسی پر بیٹھے دھوپ کا مزا لے رہے تھے (بعد میں یہاں ایک اور کمرہ تعمیر ہو گیا) ان صاحب سے سلام دعا ہوئی۔ فرمانے لگے کہ آپ کون ہو اور کہاں سے تعلق ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ میری جائے پیدائش آگرہ ہے تو چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔ بولے کون سے محلہ سے تعلق ہے؟ میں نے الجھتے ہوئے جواب دیا' نئی بستی سے' کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان صاحب کو ان باتوں سے کیا تعلق جبکہ میں صرف لائبریری دیکھنا چاہتا تھا۔ "نئی بستی" کے نام سے ان کی آنکھوں میں

ایک چمک پیدا ہوئی فرمایا کس کے لڑکے ہو؟ جب میں نے اپنے والد کا نام بتایا تو بولے مفتی انتظام اللہ شہابی کو جانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں خاندان میں اکثر ان کا تذکرہ سنا ہے اور انجمن اسلامیہ (آگرہ) کی لائبریری میں انکی کتابیں اور قلمی مسودے بھی دیکھے ہیں (بلکہ کچھ کتابوں کے کتابت شدہ مسودے بھی وہاں محفوظ تھے) کہنے لگے میں ہی انتظام اللہ شہابی ہوں اور تمہارے تایا کا دوست بھی ہوں۔پھر بڑی محبت سے باتیں کرتے رہے تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر معین الحق صاحب سکریٹری سوسائٹی نیچے اپنے دفتر میں تشریف لے آئے تو مجھے لے جا کر بڑی اپنائیت سے بلوایا۔ ڈاکٹر صاحب نے بعد میں تذکرہ کیا کہ مفتی صاحب نے یہ کہہ کر میری سفارش کی تھی کہ یہ میرا بھتیجا ہے اس کا خاص خیال رکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مفتی صاحب مرحوم کی بات کا مان رکھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور ڈاکٹر معین الحق مرحوم سے یہ میرا پہلا تعارف تھا جو ایک طویل ہم سفری کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت دیدی۔ کراچی میں لائبریریاں نہ ہونے کے برابر تھیں ہسٹاریکل سوسائٹی کی قیمتی و منفرد لائبریری سے مجھے اپنی تحقیقات میں بہت مدد ملی۔کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے پاس نشست کا موقع ملتا تھا جو تاریخ اور تاریخی تحقیقات پر ان کے نظریات و ارمودات سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا۔ میری درخواست پر انہوں نے مجھے سوسائٹی کا باقاعدہ رکن بنالیا۔

یہ زمانہ ہسٹاریکل سوسائٹی میں تاریخی تحقیقات کا بہترین زمانہ تھا۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ پر کام جاری تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اچھے کام کرنے والے جمع کر رکھے تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ان میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ صاحب علم ہی نہیں تھے بلکہ علم کا ایک خزانہ تھے۔ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا، وہ ہمہ صفت آدمی تھے ان کے نحیف جثہ کو دیکھ کر ان کی انرجی اور سرگرمیوں کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک طرف وہ انجمن اسلامیہ کراچی کے اہم آدمی تھے اور اس کے اداروں کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے تھے دوسری طرف سوسائٹی میں تحقیقات میں لگے رہتے تھے۔ سوسائٹی کے کاموں کے علاوہ بھی انہوں نے دائرہ معین المعارف قائم کرایا اور اسکا سہ ماہی رسالہ بصائر شائع کرایا جو بدقسمتی سے ان کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔ ان سب باتوں کے علاوہ مفتی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ڈاکٹر صاحب سے لگاؤ اور وفاداری کا جذبہ تھا۔ انہوں نے آڑے وقت میں ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا بلکہ ایک دور تک ان کے مشورے ڈاکٹر صاحب کی نجی و ذاتی زندگی میں بھی شامل رہے۔

دوسری نمایاں شخصیت پروفیسر غضنفر علی خان صاحب مرحوم کی تھی جو عربی، فارسی، سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ طبقات ابن سعد کا انگریزی ترجمہ ان کی علمی کاوش کا بہترین نمونہ ہے۔ مرنجان مرنج آدمی تھے۔ کھرے پٹھان، لودھی حکمرانوں سے نسبی تعلق پر فخر اور مزاح کا ایک انداز کہ جو اجنبی کو شروع میں چونکا دے۔ وہ آخری دم تک سوسائٹی سے منسلک رہے جب سوسائٹی کی مالی حالت بہت سقیم

ہوگئی تو انہوں نے اردو بورڈ میں کام کرنے کا ارادہ کیا۔ تقرری نامہ بھی مل گیا لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔

مرحوم ڈاکٹر ایوب قادری بھی اس زمانے میں سوسائٹی ہی میں ریسرچ اسکالر تھے۔ انہیں اردو تاریخ نویسی و تراجم میں جو مقام حاصل ہوا اس میں ڈاکٹر معین الحق صاحب مرحوم' پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور غضنفر صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔ بعد میں بوجوہ وہ علیحدہ ہوگئے۔

سوسائٹی کا کتب خانہ تاریخ کے موضوع پر اپنی نوعیت کے چند منفرد کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت تک حالات ایسے ہوگئے تھے کہ کوئی باقاعدہ لائبریرین نہیں تھا لائبریری کو اس وجہ سے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

دفتر میں منظور احمد صاحب آفس سپرنٹنڈنٹ و منیجر برائے فروخت کتب کا کام کرتے تھے ان کی مدد کیلئے احسان الحق صاحب مرحوم ایک مقرہ مشاہرہ پر ٹائپ وغیرہ کا کام کرتے تھے آپ ڈاکٹر صاحب کے برادر خورد تھے. ان کے انتقال کے بعد سے آج تک سوسائٹی کو جزوقتی ٹائپسٹ سے کام چلانا پڑ رہا ہے۔ منظور احمد بھی ریٹائر ہونے کے بعد ایک مقررہ مشاہرہ پر دفتر کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی اور ڈاکٹر صاحب سے ان کی ذاتی وفاداری مثالی بھی ہے۔ نائب قاصد و چوکیدار کی حیثیت سے محمد خان مرحوم و خمین گل تھے۔ خمین گل بھی تیس سال خدمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوگئے۔ اسطرح سوسائٹی کا تمام کام عارضی' اور مقررہ مشاہرہ پر کرایا جارہا ہے جو ایسے ادارے کیلئے یقیناً

مناسب نہیں لیکن حالات کے تحت ہم اس پر مجبور ہیں۔

حالانکہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور ڈاکٹر معین الحق صاحب مرحوم کی ذات لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے اور سوسائٹی ڈاکٹر صاحب کی چہیتی اولاد کا درجہ رکھتی تھی لیکن وہ سوسائٹی سے ہٹ کر خود اپنی ذات کی شناخت رکھتے تھے اور پاکستان و مسلمانان برصغیر جنوبی ایشیا میں ایک نامور مورخ اور مصنف کی حیثیت رکھتے تھے انہیں تاریخ نویسی اور تحقیقات کے ہر شعبہ پر عبور حاصل تھا۔ ان کے تراجم خصوصاً تاریخ فیروز شاہی' طبقات ابن سعد' ابن خلکان کی وفیت الاعیان سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ بے شمار فارسی کتب کی بذات خود یا اس خادم کی رہنمائی کرتے ہوئے' انہوں نے تصحیح کی' تنقیدی و تشریحی حاشیوں کا اضافہ کیا خصوصاً ذخیرۃ الخوانین (۳ جلد) نجات الرشید' بحرالاسرار فی معرفت الاخیار' تذکرۃ الامراء کیول رام (۳ جلد) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ تاریخ کی سائنٹفکٹ اور تحقیقی تجزیہ و توجیہ کو پسند کرتے تھے۔ بغیر سند اور مستند حوالے کے وہ کبھی کسی تاریخی واقعہ یا حقیقت کو نہ تو تسلیم کرتے تھے اور نہ تحریر میں لاتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی معرکتہ آرا تصنیف Great Revolution of 1857, Islamic Thought and Movements کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ انفرادی کتب کے علاوہ انہوں نے چند مشہور تاریخی سلسلہ وار کتب کی پلاننگ اور اشاعت میں بھی حصہ لیا۔ خود بھی مضامین لکھے دوسروں سے بھی لکھوائے' ان میں History of Freedom Movement سب سے پہلے (۴ جلد) اور حال میں شروع ہونے والی

Road to Pakistan (دو جلد) سر فہرست ہیں یہ طویل المدت پلاننگ ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک نسل نئے اسکالرز اور مورخین کی اپنے پیچھے چھوڑی ہے جن میں اکثر خود اپنی اپنی جگہ معمر، مستند اساتذہ اور اسکالرز میں شمار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کام کرنے کی صلاحیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بھی، جب کے بیشتر لوگ ازکار رفتہ ہوجاتے ہیں، صبح ۹ بجے سے تقریباً ایک ڈیڑھ بجے دوپہر تک کام کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے یہ سال اپنی آخری کتاب انگریزی میں سیرۃ النبی کی تالیف میں گزار دئیے۔ باوضو ہوکر وہ ہمہ تن محو ہوکر یہ کام کرتے رہے اور ۳۲ ابواب پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرتب کی جو تقریباً ۱۲۰۰ فل اسکیپ ٹائپ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ اس کی نظرثانی بھی کرچکے تھے۔ آخری دنوں میں انھیں خواب میں ندا سنائی دی کہ بہت دیر کر رہے ہو۔ ۱۹ اکتوبر ۸۹ء جمعرات کے دن دوپہر کے ڈیڑھ بجے تک حسب دستور کام کرتے رہے اور اپنی آخری کتاب کے Preface کا ایک صفحہ لکھاجس کا ایک جملہ تھا کہ الحمداللہ آج یہ مبارک کام پورا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری بڑی خوبی ان کی انتظامی صلاحیت تھی جو ایک اسکالر میں عام طور سے یا تو مفقود ہوتی ہے یا نمایاں نہیں ہونے پاتی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نظریاتی نصب العین کے ساتھ ساتھ عملی فکر و تجزیہ کی صلاحیتیں

بھی رکھتے تھے۔ سوسائٹی کا قیام، اس کے کتب خانے کی اساس، آفس اور کمپوزنگ یونٹ کا قیام اس کا واضح ثبوت ہیں۔ انتظامی تفکرات نے انھیں اکثر بیخوابی سے دوچار کیا لیکن اس کا اثر کبھی بھی ان کے روزمرہ کے علمی مشاغل میں حارج نہیں ہوا۔ چند وجوہات کے سبب انھیں اردو کالج سے علیحدہ ہونا پڑا، یونیورسٹی میں ملازمت نہیں ملی اور انھیں اپنی تمام توجہ سوسائٹی کی طرف مبذول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ شروع میں انھیں سوسائٹی سے مستقل مشاہرہ ملتا رہا لیکن جب مالی حالت سقیم ہوگئی تو تقریباً پچھلے دس پندرہ سال سے وہ صرف ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا اعزازیہ ہی لیتے رہے بلکہ طویل عرصہ تک سوسائٹی سے مکان کا کرایہ بھی نہیں لیا۔ اکثر یہ اعزازیہ بھی کئی کئی ماہ تک ادا نہیں ہوتا تھا بلکہ اکثر چپراسی وغیرہ کی تنخواہ کیلئے ہم اکثر ان سے قرض لے لیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود سوسائٹی کا تحقیقاتی و طباعت کا کام بہت کم متاثر ہوا بہرحال اس کی رفتار کم ضرور ہوگئی۔ کم تر سے کم تر وسائل اور افراد کے ساتھ درویشانہ بے نیازی کے ساتھ کام کرنے میں عجب لطف اور کیفیت ہے۔ الحمداللہ سوسائٹی نے اس درویشانہ طریق پر کام کر کے سخت سے سخت وقت گزار دیا وہ دور بھی جب کہ گرانٹ بالکل روک دی گئی۔ گذشتہ سالوں سے یہ گرانٹ بتدریج کم ہوتی رہی لیکن اس کے باوجود ہم نے تقریباً ۵ ہزار صفحات پر مبنی کتب اور سہ ماہی جنرل شایع کیا۔ یہ پاکستان کا واحد تحقیقاتی تاریخی بین الاقوامی تسلیم شدہ سہ ماہی جنرل ہے جو ۳۸ سال سے مسلسل شایع ہو رہا ہے۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب کے عملی طرز عمل کا اس وقت ثبوت سامنے آیا جب میں نے ایک ساتھ کمپوزیٹر کی شکایت کی کہ وہ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ چونکہ مالی استحکام نہ تھا اور ایسے لوگ آسانی سے نہیں مل سکتے تھے جو دو دو اور تین تین ماہ تک تنخواہ نہ ملنے کے باوجود کام کرتے رہیں اس لئے کاریگر کی تبدیلی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ انہوں نے سمجھایا کہ جب عادتیں راسخ ہوتی ہیں تو تبدیلی نہیں ہوسکتی اگر اس آدمی سے کام لینا ہے تو جیسا بھی ہے لینا ہوگا اس کے برے بھلے پہلو سب ہی قبول کرنے ہونگے۔ واقعتہً اگر اس وقت اس آدمی کو نکال دیا جاتا تو دوسرا رکھ نہیں سکتے تھے، طباعت کا کام بالکل بند ہوجاتا۔

سوسائٹی کی بگڑتی ہوئی مالی حالت اور اس خطرہ کے پیش نظر کہ نہ جانے سرکاری گرانٹ کب بند ہوجائے ڈاکٹر صاحب نے بہت غور و خوض کیا اس کی ایک وجہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سے حکومت وقت کی ناراضگی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنے کو ہٹانے کی تجویز پیش کی تاکہ سوسائٹی کا کام متاثر نہ ہو۔ آخری صورت حال تو یہی تھی کہ سوسائٹی کو ختم کردیا جائے۔ یہ سب سے آسان راستہ تھا کچھ لوگ جو ہمارے طرز فکر سے متفق نہیں شاید اس اقدام پر مطمئن ہوتے۔ حکومت کو بھی کوئی غم نہ ہوتا اور ہماری دردسری بھی ختم ہوجاتی۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ تاریخ اسلام و جنوبی ایشیائی تاریخ کی بہتر صحیح عکاسی کا کام پورا نہ ہوسکے گا یہ طے

ہوا کہ کم از کم جرنل جاری رکھا جائے اور کتب کی اشاعت بند کردی جائے۔ لیکن جب نیت بخیر ہو تو اللہ بھی راستہ دکھا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے حکیم سعید صاحب اور ان کے بڑے بھائی صاحب حکیم حمید صاحب کو ایک لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ سوسائٹی کی صدارت سنبھال لیں اور بعد میں اصرار کیا کہ یہ فریضہ وہ تاحیات قبول فرمالیں۔ حکیم صاحب کو تامل ہونا لازمی تھا یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، ایک بیمار و لب گور ادارہ کو سنبھالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان کی ساکھ و عزت کا مسئلہ بھی تھا۔ بہرحال حکیم صاحب تیار ہوگئے۔ انہوں نے رسالہ کی طباعت اپنے ذمہ لیلی اور ایک معقول گرانٹ کا انتظام ہمدرد فاؤنڈیشن سے کرادیا۔ حال ہی میں Road to Pakistan بھی ہمدرد فاؤنڈیشن کے تعاون سے ہی شایع ہوئی ہے جسے اللہ کے شکر سے قبول عام حاصل ہورہا ہے۔

ذاتی طور پر میرا اور ڈاکٹر صاحب کا تعلق شاگرد و استاد کا تھا۔ وہ میری تربیت کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ جب بھی کوئی نیا تحقیقاتی نکتہ سامنے آتا مجھ سے ضرور تذکرہ فرماتے۔ یوں سمجھئے کہ ان کے پاس ایک دوگھنٹہ کی نشست علمی اعتبار سے کئی کتابوں کے مطالعہ کے برابر ہوتی تھی۔ یہ علمی فراخدلی بہت کم اسکالرز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آخری سالوں میں سوسائٹی کے انتظامی امور میں انہوں نے مجھے ہمیشہ شریک رکھا بلکہ بعض اوقات کسی وجہ سے میری غیرحاضری کی بنا پر فیصلہ ملتوی کردیا کرتے تھے۔ مجھے بھی ہمیشہ یہ اطمنان رہا کہ علمی مسئلہ ہو

یا انتظامی ڈاکٹر صاحب تو موجود ہیں۔ ان جیسی دوررس سوجھ بوجھ اور ڈرافٹنگ کی قابلیت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ پاکستان کے مورخین میں قدیم و جدید کے امتزاج کا ایسا نادر نمونہ اور اسکالر آسانی سے نہیں ملے گا۔ ان کے انتقال سے ایک دور بھی ختم ہوگیا اور ایک خلا پیدا ہوگیا جو آسانی سے پر نہیں ہوگا۔

انتقال سے ایک دن پہلے کام ختم کرکے دوپہر کے وقت مجھ سے کچھ دیر گفتگو کرتے رہے۔ ایک دو روز سے ان کی طبیعت مالش کرتی رہتی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ عارضۂ قلب کے سبب ہے جو عرصہ سے چل رہا تھا۔ دوسرے دن جمعہ کو ۱۱ بجے کہ قریب ہمیں کل چپراسی آیا اور کہنے لگا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے آپ کو بلایا ہے۔ میں احتیاتاً biochemic کی دوائیں ساتھ لے گیا۔ شانوں کے بیچ اور کندھوں میں سخت درد تھا، بیچینی سے کبھی اٹھ رہے تھے اور بیٹھ رہے تھے۔ ان کے گھروالے سب جمع تھے درد والی جگہ کی سکائی جاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد آرام آگیا۔ اور سوگئے۔ میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر گھر آگیا۔ نماز کے وقت فون آیا کہ انہیں دوسرا دورہ بیماری کا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دور جدید کہ وہ عظیم معلم مورخ ہم سے جدا ہوگیا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے مشن کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ثمہ آمین!

سب لوگوں کے کہنے سے خصوصاً پروفیسر ظفر حسین خان کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے خاموشی سے اپنی یاد داشتوں کو

مرتب کرنا شروع کیا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ نا مکمل خود نوشت ان کے کاغذات سے برآمد ہوئی۔ یہ نا مکمل ہے اور سوسائٹی نے اسے بلاترمیم شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح میں بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی ذاتی اور خاندانی شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کسی شخصیت کے بارے میں معاندانہ یا سخت لہجہ استعمال نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا تذکرہ بھی کھل کر نہیں کیا۔

اس ضمن میں بیگم پروفیسر معین الحق کی کاوشیں بھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے تقریباً ۴۰ سال کا طویل عرصہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزارا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت قائم رکھنے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ خود تاریخ اسلام کی پروفیسر ہیں اور لکھنے پڑھنے سے شغف رکھتی ہیں۔ کالج کی انتظامی ذمہ داریوں اور امور خانہ داری کی مصروفیات نے ان کا بیشتر وقت لیلیا لیکن پھر بھی وہ لکھنے پڑھنے کے عمل میں کسی نہ کسی حد تک شریک رہیں۔ ان کی دو کتب انگلش میں حضرت عائشہ کی سیرت اور علیگڈھ تحریک مشہور ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ کی رکن رہی ہیں اور اس وقت نائب صدر کے عہدے پر فائض ہیں۔ خود نوشت سوانح کے فائل انہوں نے ہی دریافت کئے۔ اس کا انگلش ترجمہ بھی کردیا اور اسے وہ Memoir کی شکل میں شایع کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں بھی ان کے مشورے برابر سے شامل ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے برادر خورد رشیدالحق صاحب نے ایک علیحدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر اسے بھی اس کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ان کے خاندانی شجرہ کی نقل اور فوٹوؤں کے لئے ہم ان کے خاندان اور بیگم معین الحق صاحبہ کے شکرگزار ہیں۔

ہم اپنے صدر محترم جناب حکیم سعید صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے حسب معمول سوسائٹی کے اس کام میں بھی دلچسپی لی ہے اور اس کی اشاعت میں ہماری ہمت افزائی کی ہے۔

ڈاکٹر انصار زاہد خاں
جنرل سیکریٹری

باب اول

روھیلکھنڈ کی تاریخ پر طائرانہ نظر

ہمارے خاندان کا تعلق، مرادآباد سے اسی وقت سے ہے جب سے اس شہر کی بنیاد پڑی بلکہ بعض روایات کے مطابق راقم الحروف کے جد علیٰ حضرت شاہ ابراھیم صاحب رح، وہاں شہر کی تعمیر سے پہلے ھی آکر مستقل طور پر مقیم ھوگئے تھے اس لئے مناسب اور ضروری معلوم ھوتا ھے کہ اس علاقے کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

دھلی اور اودھ کے درمیان ایک وسیع اور زرخیز علاقہ ھے جس کے مختلف حصوں کو گنگا، جمنا اور ان کی بعض شاخوں نے شاداب بنادیا ھے اس کو عام طور پر روھیلکھنڈ کہا جاتا ھے، کیوں کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں روھیلہ سرداروں نے جو شمال مغربی سرحدی علاقہ سے یہاں آئے تھے، اس علاقہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کے زوال کا یہ وہ دور تھا جس میں مرکز کی کمزوری اور شاھی امراء کی نااتفاقیوں اور خانہ جنگیوں سے فائیدہ اٹھا کر بعض طاقتور اور با اثر سرداروں نے نیم خود مختار ریاستیں قائم کرلی تھیں اسی زمانہ میں روھیلکھنڈ، کے سرداروں نے خود مختار حیثیت

حاصل کرکے اپنے علاقہ میں نظم و ضبط قائم کرلیا تھا۔ مستند مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طوائف الملوکی اور سیاسی کشمکش کے دور میں، روہیلہ سرداروں کی حکومت دوسری معاصر حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم اور کامیاب تھی۔ قدرتی وسائل کی فراوانی اور امن و امان قائم ہونے کے باعث یہاں کے لوگ خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کررہے تھے، روہیلہ سردار جن میں علی محمد خان، حافظ رحمت خان اور نجیب الدولہ کو خاص طور پر تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے، علم دوست اور معارف پرور حکمران تھے، ان ہی کی اور ان جیسے دوسرے ارباب اقتدار کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علمی و ادبی اور اس کے ساتھ تہذیب و تمدن کی ترقی میں روہیلکھنڈ کے لوگ بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور کی عظیم ادبی شخصیتیں اور شعراء، دہلی و لکھنؤ کے درباروں ہی سے منسلک تھے، لیکن اگر ہم عام لوگوں کی حالت اور ان کے معیار زندگی کا بغور معائنہ کریں تو یہاں کے لوگ دہلی اور اودھ کے لوگوں سے پیچھے نظر نہیں آئیں گے، بلکہ امن و امان کے لحاظ سے یہ علاقہ کسی حد تک ان سے بہتر ہی تھا[1]۔ سنہ ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت میں، نجیب الدولہ اور دوسرے روہیلہ سرداروں نے جو کارنامہ انجام دیا، وہ بین شہادت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ صرف میدان جنگ ہی کے شہسوار نہ تھے، بلکہ دینی و قومی شعور میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے، مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور اقتدار سے مغلیہ سلطنت ہی کو نہیں بلکہ مسلم معاشرے کو جو عظیم خطرہ تھا، اس کی طرف شاہ ولی اللہ نے جب مسلم رہنماؤں

اور سرداروں کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی[2] تو، اس کا سب سے زیادہ گہرا ردعمل روہیلہ سردار نجیب الدولہ پر ہی ہوا، اور اسی کی کوشش سے مسلم حکمران یکجا جمع ہوگئے، یہاں اس کامیابی کی اہمیت اور ہماری تاریخ پر اس کے گہرے اثرات کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں، لیکن اس قدر اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ نجیب الدولہ ہی کی کوشش سے نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ نے اس جنگ میں حصہ لیا[3] باقی مسلم حکمران، روہیلہ سرداروں کے علاوہ، خاموش رہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس فیصلہ کن معرکہ میں روہیلہ سرداروں نے نہایت اہم اور ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔

بہرحال، روہیلکھنڈ کی آزاد اور خود مختار حیثیت اور روہیلوں کی حکومت زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکی، پانی پت کی کامیابی کے بعد نجیب الدولہ نے اپنی زندگی کے بقیہ دس سال (۱۷۶۱ تا ۱۷۷۱) دہلی کی حالت درست کرنے میں صرف کئے۔ اس کو جزوی کامیابی ضرور ہوئی، لیکن انحطاط اور انتشار کی قوتیں اتنا زور پکڑ چکی تھیں کہ شاید کلی طور پر اب ان کو روکنا تقریباً نا ممکن تھا، مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی جو اسی سال (۱۷۷۱) مرہٹوں کی مدد اور سرپرستی میں انگریزوں کے قبضہ سے نکل کر الہ آباد سے دہلی پہنچا تھا، اپنے اجداد کی ان خصوصیات سے محروم تھا، جن کی بدولت وہ لوگ انتہائی نازک اور مشکل ترین حالات کا مقابلہ کرکے کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے تھے، اس کی مدت بادشاہی طویل تھی، لیکن اس پورے عرصے میں وہ پہلے مرہٹہ سردار سندھیہ اور بعد میں انگریزی حکومت کے زیر اثر رہا۔ جس سے

مغلیہ سلطنت کے اقتدار اور وقار کو اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ لوگوں میں یہ الفاظ' محاورہ کے طور پر رائج ہوگئے کہ شاہی شاہ عالم از دہلی تا پالم۔ شاہ عالم کی پالیسی کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس نے شروع ہی سے روہیلوں کی مخالفت کی اور ان کو ختم کرنے کا تہیہ کرلیا۔ سندھیہ کو ''فرزند دلپسند'' اور نجیب الدولہ کے خاندان کو اپنا دشمن بنایا۔

روہیلوں کے لئے شاہ عالم سے زیادہ خطرناک شجاع الدولہ نواب وزیر ثابت ہوا' اودھ اور روہیلکھنڈ' ایک دوسرے سے متصل تھے چنانچہ ظاہری دوستی کے ساتھ دلوں میں رقابت بلکہ مخالفت کے جذبات بھی پنہاں تھے' ان کی شدت اس لئے اور بھی زیادہ ہوگئی تھی کہ اودھ کا حکمران خاندان شیعہ اور روہیلہ سردار سنی تھے۔ دونوں اپنے عقائد اور مذہبی خیالات میں بہت متعصب تھے' اور حقیقت' یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے مسلم معاشرے کی نمایاں خصوصیت شیعہ سنی اختلافات اور تعصب نظر آتا ہے۔ ان اختلافات نے اسلامی یگانگت اور مسلمانوں کے اقتدار کو جو صدمہ پہنچایا ہے اور ان کے زوال کی رفتار کو جس حد تک تیز کیا ہے' وہ تاریخ کا عظیم المیہ ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اس سے وہ سبق حاصل نہیں کیا جو ان کو کرنا چاہئے تھا' تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود ہم اپنی ان کمزوریوں کو دور نہ کرسکے' بلکہ فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ اب ہم لوگ علاقائی تعصب کا بھی شکار ہیں!

۱۷۷۴ میں اودھ اور روہیلوں میں جنگ ہوئی' جس کا تاریخ میں جنگ روہیلہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے' اس کے اسباب

یہ تھے: مرہٹوں کے مطالق خبریں اڑ رہی تھیں کہ وہ روہیلکھنڈ کے علاقہ میں لوٹ مار اور غارت گری کرنے والے ہیں' چنانچہ وہاں کے حکمران حافظ رحمت خان نے اودھ سے معاہدہ کیا کہ اگر ایسا ہو تو نواب وزیر کی فوجیں ان کی مدد کے لئے آئیں اور اس امداد کے معاوضہ میں وہ چالیس لاکھ روپیہ کی رقم نواب وزیر کو ادا کریں گے۔ اتفاق سے مرہٹوں نے روہیلکنڈ پر حملہ نہیں کیا اور روہیلکھنڈ محفوظ رہا۔ مگر نواب وزیر نے چالیس لاکھ کا مطالبہ کیا' حافظ رحمت خان نے انکار کیا۔ شجاع الدولہ نے کمپنی کی حکومت سے جو اسی زمانہ میں ان کی دوست بنی تھی' مدد لے کر روہیلکھنڈ پر حملہ کردیا' ان کی مشترکہ افواج نے اس زرخیز اور پر امن علاقہ کو پامال کیا اور وہاں کے لوگوں پر ایسا ظلم و تشدد کیا کہ دوسری اقوام کے لوگ بھی حیرت زدہ ہوکر رہ گئے۔ سینکڑوں گاؤوں کو جلا کر خاک کردیا گیا' لٹیرے سپاہیوں نے بے شمار دولت لوٹی اور ہزارہا انسانوں کا خون بہ گیا۔ انگریزوں نے نواب سے خرچ کے علاوہ چالیس لاکھ روپیہ بھی لے لئے۔ نواب نے روہیلکھنڈ کا سارا علاقہ اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ ایک نا کردہ گناہ کے نام پر ایک قوم کی تباہی و بربادی اور اس کی حکمرانی کے خاتمہ کی یہ داستان' اپنی مثال آپ ہی ہے' روہیلوں نے انگریزوں کو کبھی ناراض تک ہونے کا موقع نہیں دیا تھا' لیکن ان ہی کی تیغ ستم نے اس قوم کا گلا کاٹا[3]۔

اودھ کو انگریزوں کی مدد سے اپنا علاقہ وسیع کرنے کا یہ موقع ضرور ملا اس کی وسعت اور ترقی کی مثال اس بکرے کی سی ہے جس کو ذبح کرنے کے لئے قصاب موٹا کرتا رہتا ہے۔ فرق صرف

یہ ہے کہ بکرا ایک ہی ضرب سے ذبح ہوتا ہے لیکن اودھ کی زرخیز اور مالدار ریاست کو کمپنی کے ارباب اقتدار ایک مدت تک مختلف طریقوں سے نوچتے کھسوٹتے رہے، یہاں تک کہ آخرکار ۱۸۵٦ میں اس کو اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔ روھیلکھنڈ کا علاقہ جس پر جنگ روھیلہ کے بعد اودھ کا قبضہ ہوا تھا، لارڈ ولزلی کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں انیسویں صدی کے آغاز میں، نواب اودھ نے اپنی دوست (کمپنی) کو دے دیا۔ اسی وقت، مرادآباد انگریزی حکومت میں شامل ہوا۔

شہر مرادآباد

شہر کی حیثیت حاصل کرنے سے پہلے یہ بستی، چوپالہ کہلاتی تھی، شاہ جہاں کے عہد میں یہاں کے زمیندار نے بغاوت کی، اس کو فرو کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے رستم خان دکھنی، حاکم سنبھل کو متعین کیا گیا۔ باغیوں کو پسپا کرکے اس نے ایسے اقدامات کئے، جو اس کے فرائض سے باہر تھے، اور شہنشاہ کی ناراضگی کا باعث ہوا، رستم خان نے چوپالہ کو شہر کی حیثیت دے کر اس کا نام رستم نگر رکھا تھا، لیکن اس کو یہ مشورہ دیا گیا، کہ دربار میں حاضر ہوکر معافی مانگے اور شہنشاہ کی خدمت میں عرض کرے کہ اس نے جو نیا شہر آباد کیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کا نام شہزادہ مراد کے نام پر رکھے، جو اسی زمانہ میں پیدا ہوا تھا، یہ تدبیر کارگر ہوئی اور رستم خان نئے شہر کا حاکم مقرر ہوگیا، ۱٦۵۸ میں شہزادہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان، سموگڈھ کی لڑائی میں رستم خان شاہی

افواج کی طرف تھا، اسی جنگ میں وہ مارا گیا۔ یہاں مرادآباد کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں، لیکن یہ ضروری کہا جاسکتا ھے کہ وہ جلد ھی اھمیت اختیار کرنے لگا، اور مغلیہ حکومت کی طرف سے بعض امراء یہاں کے حاکم مقرر ھوئے، مثال کے طور پر نظام الملک بانئی ریاست حیدرآباد، روھیلہ اقتدار کے زمانہ میں اس نے اور بھی ترقی کی، مسلمانوں کی آبادی یہاں اکثیریت میں تھی اور عقائد کے لحاظ سے ان کی بہت بڑی تعداد سنی تھی، نوابان اودھ کے زیر حکومت رہنے اور ان کی شیعہ نوازیوں کے باوجود یہاں مسلمانوں میں سنیوں کی ھی اکثریت رھی اور ان کے مقابلہ میں شیعہ آبادی، تعداد کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، روھیلکھنڈ کا سارا علاقہ نوابان اودھ نے برطانوی حکومت کے سپرد کردیا، اور اس علاقہ میں زندگی کے ان شعبوں میں ترقی ھوتی رھی جن میں انگریزی حکومت کے تحت دوسرے علاقوں کے لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ میں مرادآباد کا حصہ

لارڈ ولزلی (۱۷۹۸-۱۸۰۵) کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ طے کرلیا کہ برصغیر پر انگریزوں کا اقتدار قائم ھونا چاھئے، چنانچہ اس کے لئے اقدامات شروع کردئیے گئے، بڑی ریاستوں میں حیدرآباد اور اودھ نے تو فوراً ھی ھتیار ڈال دئیے، اور انگریزوں کی بالادستی تسلیم کرلی، مرھٹوں نے اور ان سے بھی زیادہ میسور کے شیر دل حکمران سلطان ٹیپو نے مقابلہ کیا ان دونوں کے خلاف کمپنی نے جنگ کی اور یکے بعد دیگر دونوں کو ختم کردیا۔

ٹیپو سلطان کے جہاد اور شہادت سے تاریخ کے ایک عظیم باب کی ابتدا ہوئی سب تو نہیں لیکن کچھ حساس اور دور اندیش رہنماؤں کے دل میں کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ حاصل کرنے اور اس کے لئے جہاد کرنے کے جذبات موجزن ہونے لگے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم سید احمد شہید (ف - ۱۸۳۰) نے اٹھایا' وہ رائے بریلی (اودھ) میں پیدا ہوئے تھے' حربی تربیت امیر خاں کی فوج میں رہ کر حاصل کی تھی' وہ شاہ عبدالعزیز دہلوی (ف ۱۸۲۳) کے شاگرد اور خلیفہ تھے' اس زمانہ میں رنجیت سنگھ کے مظالم اور سختیوں کی وجہ سے پنجاب اور شمال مغربی سرحدی علاقوں پر مسلمانوں کی حالت ان مسلمانوں سے کہیں زیادہ خراب اور نازک تھی جو انگریزوں کی حکومت کے تحت تھے' چنانچہ سید احمد نے اسی علاقہ میں جہاد کا علم بلند کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس دور کے حالات کے پیش نظر یہ ایک بلند اور عظیم منصوبہ تھا' اور اس کو عملی شکل دینے کے لئے جو کوشش سید احمد خاں اور ان کے همراهیوں نے کی وہ لایق تحسین ہے۔ برصغیر کے شمالی علاقوں کا دورہ کرکے انہوں نے مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کیا' اور بالآخر مجاهدوں کی ایک عظیم جماعت لے کر وسط هند اور سندھ کے علاقوں سے گذر کر شمال مغربی علاقہ میں پہنچے۔ ان کی جماعت میں سب علاقوں کے لوگ شامل تھے' اور انتہائی جوش اور جذبہ ایثار کے ساتھ' اپنے وطنوں' اور عزیزوں کو خیرباد کہہ کر سرفروشی کے لئے نکلے تھے۔ اس تحریک کے لئے بڑی کشادہ دلی سے مسلمانوں نے چندہ دیا' اور مجاهدین کے جانے کے بعد بھی مختلف علاقوں سے ان کو روپیہ بھیجا جاتا رہا۔ یہ امر

قابل ذکر ہے کہ اس مہم کے لئے سب سے پہلی تھیلی جو سید احمد کو پیش کی گئی' وہ مرادآباد کے مسلمانوں کی طرف سے تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس علاقہ کے دینی اور قومی جذبات کسقدر مستحکم تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سید احمد شہید نے بالا کوٹ کی جنگ میں شکست کھائی اور جام شہادت پیا' لیکن ان کا اور ان کے همراهیوں کا ایثار اور جان نثاری رائگاں نہیں گئی' بالاکوٹ کی جنگ کے آٹھ سال بعد ہی رنجیت سنگھ مرگیا اور سکھوں کا زوال شروع ہوگیا۔ دس سال کے اندر ان کا علاقہ انگریزی حکومت میں شامل ہوگیا۔

سکھ ریاست پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی سیاسی' معاشری اور اقتصادی زندگی میں ایسی انقلابی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں' جن کا ردعمل یہاں کے لوگوں پر بہت گہرا ہوا' تفصیلات کا ذکر کئے بغیر یہ بتلایا جاسکتا ہے کہ صنعت و تجارت کے سلسلہ میں کمپنی کی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی تھی' اس کے نتیجہ میں یہاں کی قدیم صنعتیں ختم ہوتی جارہی تھیں' بلکہ تجارت میں بھی زیادہ فائدہ انگلستان کے تاجروں کوہی ہوتا تھا' ہندوستان کی حکومت پر قرضہ کا بوجھہ برابر بڑھ رہا تھا' مذہبی زندگی میں عیسائی مشنری تبلیغ کے نتیجہ میں جن کو حکام کی سرپرستی حاصل تھی کافی تعداد میں لوگ اپنا مذہب چھوڑکر عیسائی ہو رہے تھے' اس کے علاوہ بعض ایسی اصلاحیں حکومت کی طرف سے کی جارہی تھیں جو لوگوں کو ناگوار تھیں سب سے آخر میں' لیکن شاید اثر کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اقدام' فوج کے لئے ایک نئی رائفل کا استعمال تھا جس کے کارتوس منہ سے کھولنے پڑتے تھے' ان

پر جو کاغذ ھوتا تھا اس میں سور کی اور گائے کی چربی لگائی جاتی
تھی، چنانچہ ھندو اور مسلمان، دونوں قوموں کے سپاھیوں کو اس
سے سخت ناگواری تھی، اور اس کا استعمال شروع ھونے کے
بعد ھی فوج میں بے چینی بڑھ گئی، اودھ کے الحاق سے بھی فوج
کے بہت سپاھی بے چین تھے کیوں کہ وہ اسی علاقہ کے
رھنے والے تھے۔

اسی زمانہ میں جب کہ فوج میں بے چینی پھیلنے لگی تھی،
بعض دینی اور سیاسی رھنماؤں نے لوگوں کو جہاد کے لئے تیار
کرنے اور اپنی آزادی واپس لینے کے لئے تیار کیا۔ ان رھنماؤں میں
سے جنھوں نے اس سلسلہ میں نمایاں مقام حاصل کرلیا ھے، اسی
دور کے ایک صوفی شیخ، شاہ احمد اللہ شاہ، مولوی سرفراز علی
اور کانپور کے عظیم اللہ خان، خاص طور پر قابل ذکر ھیں۔
اول الذکر نے گوالیار کے ایک بزرگ محراب شاہ قلندر سے اسی
شرط پر بعیت کی تھی کہ وہ اپنی زندگی نصاریٰ کے خلاف جہاد کے
لئے وقف کریں گے انھوں نے یہ وعدہ پورا کیا۔ وسیع پیمانہ پر اس
کام کے لئے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔[6]

جنگ آزادی میں مرادآباد کا حصہ

ان محبان وطن کی کوششوں نے سارے برصغیر میں بے چینی
کی لہر دوڑادی۔ اور لوگ ایک عظیم انقلاب کے لئے تیار ھوگئے،
بانیان تحریک نے خفیہ طور پر نہایت کامیابی سے مختلف طبقوں
کو تیار کیا تھا، اور کمپنی کی فوج میں مسلمان اور ھندو سپاھیوں
کو اپنے ساتھ کرلیا تھا۔[7] انھوں نے طے کیا تھا کہ تمام رسالے

ایک ھی دن[8] علم بغاوت بلند کریں گے اور اپنے انگریز افسروں کو
گرفتار یا قتل کردیں گے۔ اس کے بعد اسلامی جھنڈا جس کو وہ
محمدی جھنڈا کہتے تھے، نصب کردیا جائے گا اور نئی اور آزاد
حکومت کا اعلان کردیا جائے گا۔ لیکن انقلابیوں کی بد قسمتی کہ
تین ھفتہ، تاریخ مقررہ سے قبل، میرٹھ کے ایک رسالہ نے جوش میں
آکر بغاوت کردی اس سے انقلاب کے سارے منصوبے کا نظام
بگڑ گیا اور انقلابیوں اور حکومت کے درمیان ایک طویل اور
باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع ھوگیا، جس کے لئے بانیان انقلاب
تیار نہ تھے۔ نتیجہ یہ ھوا کہ ان کو پوری تیاری کے بغیر جنگ
لڑنا پڑی، جس کے لئے وہ تیار نہ تھے، چنانچہ ان کو شکست ھوئی
اور برطانوی سپاھیوں نے، ان سے ایسا وحشیانہ انتقام لیا کہ تاریخ
کے صفحات اس قسم کی مثالیں بہت کم پیش کرتے ھیں، لاکھوں
کی تعداد میں آزادی کے ان پروانوں نے ھمت و شجاعت اور
جانثاری کے بے مثال مظاھرے کرکے تاریخ میں ھمیشہ کے لئے اپنا
مقام پیدا کرلیا۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اگرچہ کہ ابتدا میں اس تحریک میں ھندو اور مسلمان
دونوں قومیں شریک تھیں لیکن بہت جلد ھندو رھنماء چند
مستثنیات[9] کے علاوہ، پیچھے ھٹ گئے، اور جنگ کے آخری اور سب
سے زیادہ خطرناک دور میں مسلمان ھی میدان عمل میں قائم رھے،
اور جنگ اور اس کے بعد منتقمانہ اقدامات اور مظالم کا سارا
بوجھ ان ھی کو برداشت کرنا پڑا، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ

مسلمانوں کی قومی زندگی کی جڑیں ہل گئیں، سیاست اقتصادیات، علم ادب، غرضیکہ ہرشعبہ زندگی میں ان کو نا قابل تلافی صدمہ پہنچا۔ یوں تو جنگ آزادی کے اثرات برصغیر کے ہر علاقے میں پہنچے، مگر دہلی کے بعد اودھ اور روہیلکھنڈ نے اس جنگ میں سب سے زیادہ نمایاں کردار ادا کیا، اور اس کے آخری باب لکھنؤ، شاہ جہان پور اور بریلی ھی میں لکھے گئے۔

دوسرے شہروں کی طرح، مرادآباد نے بھی اس انقلاب میں نمایاں حصہ لیا، یہاں بھی اکثر دوسرے مقامات کی طرح، انقلاب کی تنظیم اور تیاری میں، نیز اس کے دوران علماء اور مشائخ نے رہنمائی اور مدد کی۔ ان میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو اور ان کے ہمراہی[10] قابل ذکر ہیں۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی ان کے مکان پر حملہ ہوا اور اسی کشمکش میں وہ شہید ہوگئے۔ ایک اور قابل ذکر شخصیت مولوی کفایت علی کافی ہیں، جو اس جنگ میں شہادت پانے کے علاوہ بحیثیت ایک نعت گو شاعر کے بھی ہماری تاریخ یں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ شاہ بلاقی صاحب مرادآباد کے ایک بزرگ شیخ تھے، جن کا مزار شہر کے باہر اب بھی موجود ہے، ان کے پوتے شاہ بولن کو بھی سزائے موت دی گئی تھی کیوں کہ وہ انقلابیوں کو اپنی خانقاہ میں ٹھہراتے تھے۔ مرادآباد میں انقلابیوں کے سردار وہاں کے ایک رئیس نواب مجدالدین عرف منجو خان تھے۔

جنگ آزادی کے خاتمہ پر برطانوی فوجوں نے جن میں ہندوستانی سپاہی بھی شامل تھے، مسلمانوں سے بہیمانہ انتقام لیا،

اس لئے کہ انگریزی حکام اور سیاست دانوں کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ اس عظیم انقلاب اور جنگ آزادی کی ذمہ داری جس کو وہ بغاوت کہتے تھے، مسلمانوں پرھی ہے۔ انفرادی طور پر بعض ہندو رہنماء اور سپاہی اس میں ضرور شریک تھے لیکن من حیث القوم، مسلمان ھی مجرم قرار دیئے گئے، اور حد یہ کہ انتقام خوف ناک اور وحشیانہ مظاہروں اور ناقابل بیان سفاکی اور بہیمیت کا نشانہ وہی بنے یا ان میں اودھ اور روہیلکھنڈ اور ان کے متصل علاقوں میں رہنے والے مسلمان، خاص طور پر برطانوی مظالم کے شکار ہوئے، ہندوؤں نے مقامی حالات سے فائدہ اٹھایا، مخبری کے فرائض انجام دئیے اور دوسرے ایسے طریقے اختیار کئے، جس سے انگریز حکام یہ سمجھنے لگے کہ یہ لوگ حکومت کے بہی خواہ اور وفادار ہیں، ان خدمات کے صلہ میں ان کو وسیع پیمانہ پر جائدادوں اور انعامات کے ذریعہ نوازا گیا، یہ مسلمانوں کی وہی جائدادیں اور جاگیریں تھیں جو ان کی بغاوت کے جرم میں ضبط کی گئی تھیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کے مخلوط ہندو مسلم معاشرے میں ایک قوم اچانک پستی میں گرگئی۔

سیاسی اور اقتصادی پستی نے پوری قوم کو پژمردہ کردیا، اور حالات زندگی کو دیکھ کر ایسا خیال ہوتا تھا کہ شاید مسلمان اب من حیث القوم ہمیشہ ذلت اور خواری میں رہیں گے ان کا مستقبل قطعی طور پر تاریک نظر آتا تھا، جنگ آزادی سے پہلے ہی مغربی تعلیم حاصل کرنے اور مغربی تمدن کو جزوی طور پر اختیار کرنے میں ہندو قوم ان سے آگے بڑھ چکی تھی[11] اور انقلاب کے بعد ان کی پس ماندگی اور پس روی، یقینی طور پر خطرناک حد تک

بڑھ جاتی، اگر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار، ایک ایسی
تحریک کی بنیاد نہ رکھتے جس نے ان کو نئی اور جدید زندگی کی
راہ دکھلائی، اور جس کو ہم اس لحاظ سے انیسویں صدی کے
نصف آخر کی تاریخ کا ایک اہم باب کہہ سکتے ہیں۔

سید احمد خان نے جو ۱۸۱۷ میں پیدا ہوئے تھے، قدیم
طرز کی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن ان کا عہد طالب علمی اور
زندگی کا ابتدائی دور اس ماحول میں گذرا، جس کا نمایاں حصہ
مغلیہ سلطنت کا زود رفتار زوال اور مسلم معاشرے کا بڑھتا ہوا
انحطاط تھا اس کے ساتھ ہی برطانوی اقتدار کا اثر برابر پھیلتا جا رہا
تھا، سید احمد خان کی پیدائش سے چودہ سال پہلے سنہ ۱۸۰۳
میں جنرل لیک مع اپنی فوج کے دھلی میں داخل ہوا تھا، اس
وقت اس نے مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم
کرلیا تھا، اور اس سے یہی معاہدہ کیا تھا کہ کمپنی کی حکومت
شاہی علاقہ جات کا انتظام کرے گی اور ایک مقررہ رقم بادشاہ
کی خدمت میں ہر سال پیش کش کے طریقہ پر پیش کیا کرے گی،
حالات سے فائدہ اٹھا کر برطانوی حکام نے ایسے اقدامات شروع
کردئے جن کے ذریعہ ان کے اختیارات برابر کم ہوتے گئے، شاہ عالم
نے سنہ ۱۸۰۶ء میں وفات پائی، ان کے بیٹے اور جانشین اکبر شاہ
ثانی اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر کے عہد حکمرانی (۱۸۰۶-
۱۸۵۶) میں شہنشاہ اور کمپنی کے درمیان، اقتدار اعلیٰ اور
پیش کش کی رقم کے مسئلوں پر ایک طویل اور ختم نہ ہونے والا
تنازعہ جاری رہا۔ اس میں تو شک نہیں کہ قوت کمپنی کے پاس
تھی اور اس کے حکام نے شہنشاہ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو

بھیڑیے کا بکری کے بچہ کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے
کہ ان آخری مغل شہنشاہوں نے اپنی بے بسی کے باوجود اپنے
اقتدار اعلیٰ کی قانونی حیثیت کے متعلق برطانوی استعمار کے آگے
کبھی سر تسلیم خم نہ کیا، ہر موقع پر انہوں نے برطانوی حکومت
اور اس کے حکام کو یہ یاد دلایا کہ قانونی طور پر اقتدار اور
حکمرانی کا حق صرف مغل شہنشاہ ہی کو ہے کمپنی کی حیثیت
ایک ایجنٹ یا کارپرداز کی ہے۔ تاریخ میں مغل شہنشاہوں کے
اس اصرار کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ سنہ ۱۸۵۷ء
میں انقلاب برپا ہونے پر ہمارے رہنماؤں کو یہ مشکل پیش نہیں
آئی کہ قیادت عظمیٰ کس کے سپرد کی جائے ان لوگوں نے فوراً
بہادر شاہ کو اپنا قائد تسلیم کرلیا، اور ایک فوری دستور تیار
کر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں سید احمد خان جن کی عمر اس وقت
چالیس سال تھی اور جو ایک عرصہ سے کمپنی کی ملازمت میں
داخل ہو کر کام کر رہے تھے بجنور میں تھے، وہ ایک کامیاب افسر
تھے اور اس وقت بھی ان کا انگریز افسر ان سے بے حد خوش تھا۔
ملازمت کے دوران سید احمد خان کو کمپنی کی حکومت اور
قوت کا اندازہ لگانے کا بہت زیادہ موقع ملا ہوگا، چنانچہ اس
کے اقتدار کا سکہ ان کے دل پر بہت مضبوط طریقہ سے جم چکا
تھا، یہی سبب تھا کہ انہوں نے شروع ہی سے انقلابیوں کی
مخالفت کی، اور اس سلسلہ میں یہاں تک بڑھ گئی کہ بجنور کے
انقلابیوں کے خلاف انگریزی فوج کے ساتھ شریک ہوکر جنگ
کی، بجنور میں انقلابیوں کی سرگرمیوں پر انہوں نے "سرکشی ضلع

بجنور'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی' اس میں انقلابیوں کے سربراہ نواب محمد خان کو وہ نا محمود خان کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خان' مجاہدین اور شہداء جنگ آزادی میں شامل ہونے کی سعادت سے تو محروم رہے' لیکن انقلاب کی کامیابی کے بعد' انہوں نے قوم کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا اور پچیس سال کی متواتر اور پر خلوص کوشش کے ذریعہ' مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کے لئے جس طرح تیار کیا' اس کے باعث تاریخ کے صفحات میں ان کا مقام بلند ترین منزل پر نظر آتا ہے' ان کی شہرت اور کارناموں نے دوامی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

سید احمد خان کی فکر میں اب پختگی پیدا ہونے لگی تھی' انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں نے ان کو ان کی عمر سے زیادہ تجربہ کار بنادیا تھا' ان کی بصیرت میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی تھی' حکومت کی ملازمت کے باوجود وہ قوم کے اہم ترین مسائل پر جو حقیقتاً اس کی حیات اور موت سے تعلق رکھتے تھے' وہ اپنی رائے قائم کرچکے تھے اور شب و روز یہ سوچتے رہتے تھے کہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کہ منزل تک پہنچنے کے لئے طریقہ کار کے کیا خطوط متعین کئے جائیں۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ انہیں کچھ مدت کے لئے سیاست سے کنارہ کش ہوکر اپنی ساری کوشش جدید تعلیم حاصل کرنے پر صرف کرنی چاہئے اور ان بدگمانیوں کو دور کرنے لئے جو ان کے اور حکومت کے درمیان حالیہ جنگ آزادی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں' ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جو انگریز حکام کو مطمئن کرسکیں' وہ جانتے تھے کہ ان کی قوم

شکست خوردہ ہے اور اس کو یہ شکست تسلیم کرلینا چاہئے اگر اس مسئلہ میں تدبر اور حقیقت پسندی سے کام نہ لیا گیا اور مسلمان ضد پر اڑے رہے تو وہ ایک تاریک گڑھے میں گرجائیں گے۔ چنانچہ قوم کو صحیح راستہ دکھلانے اور ان کی رہنمائی کے مشکل کام کو انہوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنا سب کچھ اس کے لئے وقف کردیا' یہاں سید احمد خان کی کوشش اور کارناموں کی تفصیلات بیان نہیں کی جاسکتیں' لیکن ہم یہ ذکر کرسکتے ہیں کہ ان کی پچیس سال کی کوشش اور محنت کا نتیجہ' ان کی وفات سنہ ۱۸۹۸ء سے پہلے ہی ظاہر ہوگیا۔ جدید تعلیم جس سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی اب ان میں مقبول ہوگئی' اور برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں سے اکثر میں مسلمانوں نے اپنے اسکول اور کہیں کہیں کالج بھی قائم کئے۔

علیگڑہ تحریک کا سیاسی پہلو

یہ صحیح ہے کہ تحریک کے ابتدائی دور میں' مسلمان، سید احمد خان کی قیادت میں سیاست سے علیحدہ رہے اور ان کی تمام ترکوشش تعلیم پر مرکوز رہی لیکن کروڑوں افراد پر مشتمل ایک عظیم قوم کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس طریقہ کار کو مستقل طور پر اختیار کرلے خاص طور پر اس لئے کہ اس زمانہ میں برصغیر کے سیاسی نقشے میں رنگوں کی تبدیلیاں تیزی سے ہورہی تھیں' بعض مورخین کا قول ہے اور صحیح ہے کے ہند پاکستانی طلبہ' انگریزی ادب کے اس حصہ کا مطالعہ کرنے کے بعد جس میں لبرل (وسیع الخیال) مصنفوں کی فکر پیش کی گئی ہیں' متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان اثرات کا نتیجہ انیسویں صدی کے

ربع کے آخر میں ظاہر ہونے لگا، سنہ ۱۸۸۵ء میں بعض انگریزوں کی کوشش اور ہمت سے انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی، اور جلد ہی یہ راز کھل گیا کہ یہ تنظیم میں حدود میں مفید نہیں رہ سکتی جو ابتدا میں اس کے انگریز سرپرستوں کے ذہنوں میں ہوں گے۔ بہر حال کانگریس کے قیام پر مسلمانوں کے سامنے، یہ اہم سوال تھا کہ اس سلسلہ میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے، اس موقع پر سید احمد خان نے اپنی قوم کی بہت صحیح رہنمائی کی اور نہایت سختی اور اصرار کے ساتھ ان کو بتلایا کہ اس جماعت میں شریک ہونے سے ان کو نقصان پہنچے گا۔ سید احمد خان اور ان کی قیادت میں مسلمانوں کی یہ پالیسی، ہماری تاریخ کا ایک اہم مسئلہ ہے جس پر مختلف گوشوں سے اور مختلف دلائل کے ساتھ تنقید کی جاتی رہی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے یہ رویہ اختیار کیا تھا، حالانکہ اسی زمانہ میں (یعنی سنہ ۱۸۸۷ء میں) جب انہوں نے کھلم کھلا پہلی مرتبہ اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا، تو کانگریس کو انگریزوں کی پوری سرپرستی اور مدد حاصل تھی۔ یہ صحیح ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جس کی بنیاد ایک سال قبل رکھی گئی تھی اور جس میں تعلیمی مسائل کے علاوہ دوسرے اہم مسائل پر بھی غور ہوتا تھا جب انہوں نے ایک اور ادارے کی تشکیل کی تو اس کے دروازے انگریزوں کے لئے کھلے رکھے گئے تھے، لیکن اس پر زیادہ حیرت نہ ہونی چاہئے، اس لئے کہ حالات کا تقاضہ یہی تھا اور کانگریس نے بھی شروع میں یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سید احمد خان نے بہت جلد اس برصغیر کی سیاسی

زندگی کی اس خصوصیت کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا کہ یہاں ایک نہیں دو قومیں ہیں اور یہ دونوں ہمیشہ سے علیحدہ علیحدہ رہتی ہیں اور رہیں گی، ان میں اتحاد اور دوستی اور اشتراک کار ممکن ہے لیکن یہ دونوں ایک نہیں ہوسکتیں، اور نہ تمام بنیادی مسائل پر ان دونوں کا نقطہ نظر ایک ہوسکتا ہے۔ ان کے اس خیال میں ہندی ایجیٹیشن سے بہت زیادہ پختگی پیدا ہوئی جس کا آغاز سنہ ۱۸۶۷ء سے ہوگیا تھا، اردو جو ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی تھی اور دونوں ہی کی کوشش سے اس نے ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، اس کے مقابلہ میں ہندی جیسی زبان کو لا کھڑا کرنا جو تقریباً مردہ ہوچکی تھی، اس امر کی بین شہادت تھی کہ ہندو قوم اب ان اقدامات کا سلسلہ شروع کرنے والی ہے جن کے ذریعہ ہندو قومیت کا تصور پختہ اور اس کی عملی شکل اجاگر ہوجائے۔ دو قوموں کا علیحدہ وجود تو تاریخ میں ابتداہی سے نظر آتا تھا، لیکن اب نئے حالات نے جو ماحول پیدا کیا تھا اس میں دونوں قوموں کی دوستی اور یک جہتی باہمی رقابت اور کشمکش میں بدل گئی، واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت نے دونوں قوموں کے درمیان جو خوشگوار تعلقات پیدا کئے اور قائم رکھے تھے، اب برطانوی استعمار نے اپنے مفاد میں ان کو بدظنی اور ایک حد تک مخالفت میں تبدیل کردیا، اس لئے کہ دونوں قوموں کا انتراق اس کے لئے مفید تھا۔[12] اس صورت حال کے خطرات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا تھا، لیکن اس کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو مسلمانوں کے مستقبل کے سلسلہ میں یہ تھا کہ

کانگریس نے حقیقت کو چھپانے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش شروع کردی تھی کہ برصغیر میں صرف ایک ہی قوم ہے، ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اختلافات بنیادی نہیں اور سیاسی زندگی میں ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے حالانکہ یہ تصور، حقیقت اور واقفیت کے خلاف تھا، کانگریس کے رہنماؤں کی یہ دلیل کہ مغربی ممالک میں یہی صورت حال ہے، اور مذہبی عقائد کا اختلاف سیاست پر اثر انداز نہیں ہوتا غلط اور بے بنیاد تھی مغرب اور مشرق میں مذہب کا تصور اور زندگی میں اس کی حیثیت یکساں نہیں۔ یہاں قومیت کی بنیادیں وہ نہ تھیں جو مغربی اقوام نے قائم کی تھیں۔ یہاں دونوں قوموں کا تصور قومیت مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا تھا، نہ کہ وطن کی بنیاد پر، سمجھ دار اور با اثر سیاسی رہنماؤں کا یہ فرض تھا کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے کر اس حقیقت کو تسلیم کرتے اور اسی کی روشنی میں، حصول آزادی کی کوشش اور اس کے بعد آزاد حکومت کے قیام کا ڈھانچہ تیار کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، اور سیاسی زندگی کی تعمیر اور اس کے مسائل حل کرنے کے لئے انگلستان ہی کے اداروں اور ان کے بنیادی تصورات کا اتباع کرتے رہے۔ کانگریس کے ان رہنماؤں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو وہ جو دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان اختلاف مذہب کے باوجود، ایک قوم ہوسکتے ہیں اور ان میں حب الوطنی کی بنیاد پر اخوت اور باہمی ہمدردی کے وہ جذبات پیدا ہوسکتے ہیں جو ایک قوم کے افراد میں ہونے چاہئیں، دوسرا طبقہ وہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ برصغیر میں

ایک ہی قوم ہے اور ہونی چاہیئے، اور وہ ہندو قوم ہے جو یہاں بھاری اکثریت میں موجود ہے اور جس نے انگریز کی سرپرستی میں علم، دولت اور اثر کی بنیاد پر خود کو طاقتور بنالیا ہے۔ پہلے طبقہ کی نمائندگی گوکھلے (م۔ ۱۹۱۵ء متوفی) کی شخصیت کرتی ہے اور دوسرے طبقہ کی نمائندگی کا مجسمہ/گنگا دھر تلک (م۔ ۱۹۲۰ء) کو کہا جاسکتا ہے۔ کانگریسی حلقوں میں ان طبقوں کو متوسط الخیال اور متشددین کہا جاتا تھا، اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دونوں طبقے ایک ہی قسم کی قومیت اور جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے یعنی وہ جو انگلستان میں موجود تھی، ایک طبقہ اس لئے کہ وہ اس کو ایمانداری سے بہترین نظم سمجھتا تھا، دوسرا اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک قومی ہندو راج ہمیشہ کے لئے قائم ہوجائے گا، اور پھر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو وہ ہمیشہ کے لئے ملچھ بنا کر رکھ سکیں گے جیسا کہ قدیم زمانہ میں آریہ فاتحین نے برصغیر کے باشندوں کو بنایا تھا، ان کے وجود کو من حیث القوم اس خطہ ارض سے اسی طرح ختم کردیا جائے گا جیسا کہ متعصب اور ظالم عیسائیوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے وجود کو ختم کردیا تھا۔

ان حالات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے دوسرے رہنماؤں نے سیاسی مسائل کا تجزیہ اور علاج اس حقیقت پسندانہ انداز میں نہیں کیا جس طرح سید احمد خان نے کیا۔ ان کو یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ سے دو قومیں رہی ہیں اور رہیں گی، ان کو ایک دوسرے میں مدغم کرکے ایک قوم نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ کوشش عبث ہے، صحیح حل یہ ہی ہے

که دونوں قوموں کا علیحدہ وجود ایک دوسرے کو تسلیم کرلینا چاهئے اور باهمی اتحاد اور اشتراک عمل کے ساتھ دونوں کو زندگی بسر کرنا چاهئے۔ اسی بنیاد پر انهوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رهنے کی هدایت کی اور مستقبل کی تاریخ نے ثابت کردیا که انهوں نے صحیح رهنمائی کی تھی' اس زمانه میں یک قومی اور دو قومی نظریوں کی نظریاتی بحث شروع نهیں هوئی تھی لیکن سید احمد خان نے مسلمانوں کو ہر وقت آگاہ کیا' اور ان میں یه شعور اور احساس پیدا کردیا که اپنے وجود کو من حیث القوم قائم رکھنے اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ان کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا هونا چاهئے۔ دو قومی نظریه کی اس عملی تعلیم هی کا نتیجه تھا که ان کی وفات کے تین سال بعد هی مسلمانوں نے اپنا علیحده سیاسی اداره اور تنظیم قائم کرنے کی کوشش شروع کردی اور بالآخر سنه ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آگئی مختصراً بیسویں صدی کے آغاز میں علیگڈه تحریک، اس کے رهنماؤں اور بعض دوسرے رهنماؤں کی کوششوں کے نتائج، مسلمانوں کی سیاسی' تعلیمی اور کسی حدتک معاشری زندگی میں صاف طور پر نظر آنے لگے تھے' جس طرح' بنگال کی تقسیم، ایک علیحده تنظیم و اداره کو وجود میں لانے کی کوشش' شمله ڈیپوٹیشن (اکتوبر ۱۹۰۶ء)' اور مسلم لیگ کا قیام (دسمبر ۱۹۰۶ء)' اس دور کی سیاسی تاریخ کے اهم ابواب هیں' اسی طرح برصغیر کے تقریباً هر بڑے شهر میں اسلامیه اسکول کا قائم هوجانا اور عمومی طور پر خوش حال اور روشن خیال مسلم خاندانوں کی یه خواهش که ان کے بچے انگریزی تعلیم حاصل

کریں اس پوشیده انقلاب کی کھلی شهادت تھی' جو مسلمانوں کے تحت الشعور میں آرها تھا' غرض که مسلم قوم کا یه احساس اب پخته هوگیا تھا که وه علیحده قوم هے۔ اس کے اپنے مسائل اور مقاصد هیں جن کو پورا کرنے کے لئے اس کو دوسری قوم کی طرح میدان عمل میں آگے بڑھنا هے۔

مرادآباد' کا شمار بھی ان شهروں میں تھا جهاں کے مسلمون پر ایک طرف تو جنگ آزادی کے بعد کی تباهی و بربادی کے اثرات اپنی تاریخ زبان حال سے دهراتے نظر آتے تھے' اور دوسری طرف علیگڈه تحریک کے اثر کی بدولت نوجوانوں کا ایک ایسا طبقه وجود میں آرها تھا' جو مستقبل کی طرف دیکھنے اور آگے بڑھنے کی اهمیت کا احساس رکھتا تھا۔ مرادآباد کے جو خاندان علیگڈه تحریک سے متاثر هوئےتھے اور جن افراد نے اس کےمقاصد کو پورا کرنے کےلئے عملی اقدامات کئے ان میں خود راقم الحروف کے بعض اقربا' و اعزاء کا ذکر کیا جاسکتا هے' مولوی (بعد میں سر) محمد یعقوب (م-۱۹۴۲ء) سے هم لوگوں کی نانهیال کی طرف سے دور کی رشته‌داری تھی۔ باوجود اس کے که مولوی صاحب مرحوم بزرگانه شفقت کا اظهار فرماتے تھے' راقم نے اس کی تحقیق نهیں کی که همارے اور ان کے مشترک اجداد کون تھے اور ان کے اور موجوده نسل کے درمیان کتنی منزلیں تھیں۔ هاں اس قدر یاد هے که خاندانی جائیدادوں میں بعض موضعے ایسے تھے جن کا کچھ حصه ان کے خاندان کے حصه میں آیا تھا اور کچھ همارے خاندان کے بعض افراد کے۔

مولوی محمد یعقوب کا جسم قدرے بھاری تھا' لیکن

من حیث الکل، ان کی شخصیت وجیہہ اور دلکش تھی ۔ وہ نہایت وسیع الاخلاق اور مہمان نواز تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز وکالت (پلیڈری) سے کیا[13]۔ وہ گریجویٹ نہ تھے لیکن بہت جلد اپنی ذہانت اور کوشش کی بدولت سیاست میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا، اگرچہ کہ وکالت کے پیشے میں ان کو کبھی شہرت حاصل نہ ہوسکی شاید اس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ اپنی توجہ اور وقت کا بیشتر حصہ قومی کاموں پر صرف کرتے تھے، مجھے پہلی مرتبہ مولوی صاحب مرحوم سے نیاز حاصل کرنے کا موقع کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں ملا، جب کہ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ خود ان کے مکان واقع محلہ مغلپورہ میں حاضر ہوا تھا، صرف اس قدر یاد ہے کہ وہ ہماری طرف کم ہی متوجہ ہوئے کیونکہ شہر کے بعض اہم لوگ موجود تھے جن سے یقیناً اہم معاملات پر مشورہ وغیرہ ہورہا تھا، علیگڈھ کی ملازمت کے دوران زیادہ ملاقات کے مواقع ملے، مولوی صاحب کو علیگڈھ سے بے حد محبت تھی، وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے اور اس سلسلہ میں وہاں آتے رہتے تھے، اور جناب ابوالحسن صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس قیام فرمایا کرتے تھے۔ سیاست میں مولوی صاحب مسلم لیگ ہی میں شریک ہوکر کام کرتے رہے اور ان کا شمار اس کے نمایاں رہنماؤں میں تھا ۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں جب سر محمد شفیع نے قائد اعظم سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی علحیدہ لیگ قائم کی اور ان کی مرضی کے خلاف اس کا اجلاس لاہور میں طلب کیا، تو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت جو قائداعظم محمد علی جناح کی سرپرستی میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا،

مولوی صاحب ہی نے کی تھی، انتخابات میں بھی وہ کامیاب ہوتے رہے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے نہ صرف ممبر ہی تھے، بلکہ کچھ عرصہ کے لئے ڈپٹی اسپیکر بھی منتخب ہوئے تھے سیاست میں وہ ہمیشہ اعتدال پسندی کی طرف مائل رہے اور حکومت کے ساتھ تعاون کو اس کا ضروری جزو سمجھتے تھے، یہی سبب تھا کہ ۱۹۳۷ء میں جب قائداعظم کی سربراہی میں مسلم لیگ جب اپنے نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہوئی، اور اس نے مسلمانوں کو دو محاذوں پر جنگ کے لئے تیار کیا[14] تو مولوی صاحب نے ایک حد تک کنارہ کشی اختیار کرلی، حالانکہ ان کی تمامتر ہمدردیاں مسلم لیگ ہی کے ساتھ تھیں کیوں کہ اب مسلمانوں کا واحد اور منظم ادارہ یہی تھا، اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، مجھے سال یقین کے ساتھ تو یاد نہیں لیکن شاید ۱۹۳۸ء میں مرادآباد جانے کا اتفاق ہوا اس وقت صوبوں میں کانگریسی حکومتیں برسر اقتدار تھیں اور مسلمانوں پر ان کے مظالم کا سلسلہ زوروں پر تھا، چنانچہ مسلم لیگ کے کارکن جلسوں میں ۱۹۳۵ کے ایکٹ کا تجزیہ کرکے اس کے نقائص اور کانگریسی حکومتوں کی زیادتیاں لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس موضوع پر علیگڈھ کے عام جلسوں میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔[15] چنانچہ مرادآباد پہنچ کر خیال ہوا کہ وہاں بھی ایک جلسہ سے خطاب کیاجائے یہ وہ زمانہ تھا جب بہت سی جگہوں پر مسلم لیگ کی شاخیں بہت زیادہ منظم اور فعال نہیں ہوئی تھیں ۔ مرادآباد میں بھی صورت حال یہی تھی، میں مولوی صاحب کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ جلسہ ہونا چاہئے اور ان ہی کی صدارت میں ہونا

چاہئے۔ مولوی صاحب نے شفقت آمیز لہجہ میں مسکرا کر کہا کہ بھائی، میں تو اب لیگ کا لیڈر نہیں ہوں، میں نے بھی ہنس کر کہا کہ اس سے کیا ہوتا ہے مرادآباد کے مسلمانوں کے لیڈر تو تیس سال سے آپ ہی ہیں، چنانچہ وہ راضی ہوگئے، اور ان ہی کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ جمعہ کی نماز کے فوراً بعد جامع مسجد میں تقریر کی جائے ایسا ہی ہوا، مولوی صاحب نے صدارت فرمائی اور بہت عمدہ الفاظ میں میرا تعارف اور لیگ کی خدمات اور کارناموں کا ذکر کیا، میں نے اپنے موضوع پر تقریر کی ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ مجمع پر اثر ہوا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ مرادآباد کے مسلمانوں کی ناخواندہ اکثریت پر جمعیتہ العلمائے ہند اور انصاری برادری (جولاہوں) کی وجہ سے لیگ کے مقابلہ میں کانگریس کا اثر زیادہ رہا۔

مرادآباد میں مولوی محمد یعقوب سے یہ آخری اور بہت تفصیلی ملاقات تھی۔ بعد میں وہ ایک معزز عہدہ پر فائز ہو کر حیدرآباد (دکن) چلے گئے اور زندگی کے آخری ایام وہیں گذارے۔ ۲۳ نومبر ۴۲ء میں وفات پائی۔ سیاسی نظریات میں اختلافات کے باوجود مولوی صاحب موصوف کا ہمیشہ دل میں احترام رہا۔ قوم کے ساتھ ان کو جو گہرا لگاؤ اور خلوص تھا اس کی قدر ہر شخص کرتا تھا، جو لوگ ان کے خیالات اور طریقہ کار کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ بھی ہنسی کے طور پر ان کو "قوم" کہتے تھے۔

مولوی محمد یعقوب کے معاصر اور ان ہی کی طرح علیگڈھ کی روح سے مکمل طور پر مستفیض ہونے والی دوسری شخصیت سرسید رضا علی کی تھی، ان کا تعلق قصبہ کندرکی (مرادآباد سے

تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے) میں سادات کے ایک شیعہ خاندان سے تھا، علیگڈھ سے بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد مرادآباد میں وکالت کا سلسلہ شروع کیا، اور اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث نمایاں ترقی کی، جہاں تک میں جانتا ہوں کسی دوسرے مسلمان وکیل نے بحیثیت وکیل مرادآباد میں اتنی شہرت حاصل نہیں کی جتنی سید رضا علی مرحوم نے کی، بعد میں حکومت کے معزز عہدوں پر سرفراز ہوئے، پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے، راقم الحروف کو ان سے ذاتی نیاز حاصل نہیں رہا اس لئے میں ان کے متعلق کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔[16]

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور شخصیت کا ذکر کیا جانا چاہئے۔ ماسٹر ابرار حسن صاحب جو ہمارے خاندان کے ایک فرد تھے، تعلیم کے لئے علیگڈھ کبھی نہیں گئے، وہ صرف مڈل پاس تھے جو اس زمانہ کے مسلمانوں میں تعلیمی نقطہ نظر سے ایک اچھی خاصی حیثیت سمجھی جاتی تھی، بہت کم لوگ میٹریکولیشن یا انٹرنس کے درجہ تک پہنچتے تھے اور گریجویٹ ہوجانا ایک عجیب و غریب کمال سمجھا جاتا تھا، مدرسے کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد ابرار حسن صاحب علیگڈھ تحریک سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مرادآباد میں اسلامیہ اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول بنا اور صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سرجان ہیوٹ کے نام پر اس کا نام ہیوٹ مسلم اسکول رکھا گیا، اب یہ ادارہ کالج کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ ابرار حسن صاحب ایک کم گو اور سادہ مزاج مگر ذہین شخص تھے۔ ان کو اپنے اسکول سے جس کے وہ سکریٹری تھے بےحد شغف تھا اور میرا خیال

ہے کہ وہ اسی کی بہبود اور ترقی کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔ ہمارے خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سرخ ٹوپی جس کو اس وقت عرف عام میں ترکی ٹوپی کہا جاتا تھا پہننا شروع کی، اچکن اور پاجامہ بھی نئے انداز کا پہنتے تھے۔ اسکول چلانے اور اس کو ترقی دینے میں شہر کے بعض سربرآوردہ اشخاص نے ابرار حسن صاحب کی اعانت کی، اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ حلقوں میں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، بعد میں چپقلش کا وہ دور بھی آیا جو اداروں کی تاریخ میں اکثر آتا ہے، انتظامیہ کے ممبروں میں اختلافات پیدا ہوگئے اور ابرار حسن صاحب کو کچھ عرصہ کے لئے ادارہ سے ترک تعلق کرنا پڑا، اسی وقت انہوں نے ایک اور اسکول قائم کیا، لیکن یہ نہ چل سکا۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ناکامیابی کے اسباب کیا تھے۔ بعد میں منتظمین نے محسوس کیا کہ اسکول کے مفاد میں ابرار حسن صاحب کا واپس آنا ضروری ہے۔ وہ پھر اسکول کے سکریٹری بنادئے گئے۔ ان کی آخری آرام گاہ کالج کی اسی عمارت میں ہے جس کی تعمیر کے لئے انہوں نے بےحد کوشش کی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمان زمینداروں کی تباہی

یہاں ان تمام شخصیتوں کا ذکر ممکن نہیں جو علیگڈھ تحریک سے متاثر ہوئیں یا جنہوں نے براہ راست یا بلا واسطہ خود کو اس سے منسلک کیا، ان میں سے بعض نے شہرت بھی حاصل کی، مثلاً قاضی عبدالغفار صاحب جو اپنی تصانیف کی وجہ سے

اردو ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن اکثر وہ لوگ تھے جو مشہور تو نہ ہوئے مگر تعلیم و معاشرت کے لحاظ سے علیگڈھ سے متاثر تھے، مرادآباد میں قاضیوں کا ایک خاندان تھا۔ یہ ان چند خاندانوں میں تھا جو جنگ آزادی کے بعد انگریزی حکومت کی انتقامی کارروائیوں کی دست برد سے بچ گئے تھے اور جن کی جائدادیں اور زمینداریاں ابھی تک ہندؤں کے قبضہ میں نہیں آئی تھیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں یہ ذکر بھی کردیا جائے کہ حکومت کی طرف سے ضبط کئے جانے کے علاوہ وہ بڑی تعداد میں مسلمان رؤساء اور زمینداروں کی جائدادیں خود ان کی پس ماندگی، غفلت، جہالت اور عیاشانہ زندگیوں کی وجہ سے بھی ان کے ہاتھوں سے نکلتی جارہی تھیں اور ہندو، ان پر قابض ہوتے جارہے تھے۔ یہ زمیندار اور رؤساء بعض وقت اپنی ضروریات اور اکثر عیاشیوں کے لئے ہندو بنیوں سے قرض لیتے تھے، ان کا اندراج، بنیوں کے بہی کھاتوں میں ہوتا تھا جو ہندی زبان کی ایک ایسی شکل میں لکھے جاتے تھے جس سے مسلمان قطعی طور پر ناواقف تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ بنئے یا ان کے منشی جو منیم (منعم؟) جی کہلاتے تھے، قرضہ کی رقم بڑھاکر لکھ دیتے ہوں، لیکن اس قدر تو یقینی امر ہے کہ شرع سود کی زیادتی اور سود در سود کے پر پیچ طریقہ حساب سے جلد ہی سود کی رقم اصل سے بڑھ جاتی تھی۔ ادھر جاھل اور عیاش رئیس برابر قرضہ لیتا چلا جاتا تھا، اور سمجھتا تھا کہ وہ گویا اپنے بنک سے روپیہ نکلوا رہا ہے۔ وہ قطعی طور پر اس سے بے خبر ہوتا تھا کہ ہر ماہ اس کے قرضہ کے حساب سے زیادہ اس کی اور کے سامنے، بنئے کی طرف سے

ایک نہایت بڑی رقم کا مطالبہ پیش کردیا جاتا تھا' چونکہ
حکومت بھی کھاتوں کے اندراجات کو بغیر مزید شہادتوں وغیرہ
کے صحیح مان لیتی تھی اس لئے اس غافل اور بے خبر رئیس کی
گلوخلاصی کی صرف ایک ھی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی
نہ کسی طریقہ سے بنئے کی پوری رقم جو اصل قرضہ کی رقم سے
کئی گنا زیادہ ہوچکی ہوتی تھی ادا کردی جائے- اس کی ایک ھی
شکل تھی کہ جائداد کو فروخت کرکے بنئے کی رقم ادا کردی
جائے اور اس طرح سے کچھ حصہ بچالیا جائے' لیکن یہ کام ایک
سمجھ دار اور معاملات سے باخبر انسان کرسکتا تھا، مقروض رئیس
تو جہالت اور عیاشی کا مکمل طور پر شکار ہوچکا ہوتا تھا' اس کے
ہوش و حواس کا توازن جاتا رہتا تھا' اس میں اپنی جائداد کے
کچھ حصہ کو محفوظ کرلینے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی
نہ خواھش باقی ہوتی تھی' اور نہ اھلیت' اس لئے کہ عیاشی' شراب
و کباب اور نغمہ و سرور کی محفلوں میں متواتر اور ھمہ وقت
مشغولیت اس کو زندگی کے جملہ معاملات سے غافل اور بے
خبر کردیتے تھے' ادھر بنیا عدالتی کارروائی کی تکمیل کے بعد
عدالت سے متعلق اھلکاروں کو رشوت کے ذریعہ خرید کر جائداد
کے نیلام کا ایسا انتظام کرلیتا کہ وہ یا تو خود اس کے قبضہ میں
آجاتی یا کسی دوسرے شخص کے جو اس کی رقم ادا کردیتا'
چنانچہ جب یہ سارا کھیل مکمل ہوجانے کے بعد اس آنکھوں سے
غفلت کا پردہ ھٹتا تو وہ خود کو بے نوائی اور بے سروسامانی کے
لباس میں ملبوس پاتا' اور اب اس کی باقی ماندہ زندگی اس زمین
پر ھی نہیں بلکہ خود اپنے اوپر بار نظر آتی- یہ عمل مرادآباد ھی

تک محدود نہ تھا بلکہ وسیع علاقوں میں اور خاص طور پر ان
خطوں میں جہاں جنگ آزادی کا زیادہ زور تھا' سیکڑوں خاندان
ایسے اور ان سے ملتے جلتے حادثوں کا شکار ہوئے-

اس سلسلہ میں ایک خاندان کا ذکر اس لئے کیا جاسکتا ھے
کہ اس کی تباھی کے اسباب قدرے مختلف تھے- ضلع مرادآباد
کے ایک قصبہ بچرایوں میں رؤساء کا خاندان تھا' یہ تین بھائیوں
پر مشتمل تھا اور کہا جاتا ھے کہ سب پڑھے لکھے اور انتہائی
نیک تھے' سادہ زندگی بسر کرتے تھے- ان کی سادہ لوحی کی یہ
کیفیت تھی کہ ایک وسیع جائیداد کے مالک ہونے کے باوجود جو
سینکڑوں گاؤں پر مشتمل تھی' وہ قرضہ میں مبتلا ہوگئے- اس کا
سبب یہ تھا کہ ان کو اپنے ہندو کارندے' نند کشور پر جو
مرادآباد کا رہنےوالا تھا' اس قدر اعتبار تھا کہ انہوں نے اپنے
جملہ معاملات اس کے سپرد کردئے تھے' ان کی غفلت اور بے
خبری اور اس اعتماد سے جو وہ اس پر رکھتے تھے نندکشور نے
قرضہ رقوم اتنی بڑھوادی کہ رفتہ رفتہ ان کی جائداد نیلام ہونا
شروع ہوگئی' اور اس کے منصوبہ کی خوبی یہ تھی کہ اس کا
بیشتر حصہ وہ خود ھی خرید رھا تھا' گویا کہ جوں جوں رئیس
صاحبان مفلسی اور تنگدستی کے غار کی طرف پھسلتے چلے جا رھے
تھے' نندکشور دولت مندی اور حصول جائداد کی طرف آگے
بڑھ رھا تھا، آخرکار ایک دن وہ آگیا کہ یہ رئیس اپنے قدیم
کارندے کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے لگے- ایک مقدمہ
میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ اگر یہ مولوی صاحبان'
اپنے کارندے کے خلاف کچھ بیانات دے دیتے تو کچھ حصہ

جائداد کا ان کو واپس ہوجاتا لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے باوجود لوگوں کے مشورے کے ایسا نہ کیا۔[16]

بیسویں صدی کے آغاز پر مسلمانان مرادآباد کی اقتصادی و معاشرتی زندگی

بہرحال زمینداروں اور روساء کے خاندانوں کی تباہی کے اسباب کچھ بھی ہوں، اس کا اثر قوم کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بہت گہرا ہوا' زمینداری' مدت سے مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کا ایک مضبوط ستون تھا' اس کی شکستگی اور کمزوری سے اقتصادی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ بہت سے لوگ جو براہ راست یا بالواسطہ ان روساء سے منسلک تھے اب مفلس اور بے روزگار ہوگئے' اور چونکہ عوام میں تعلیم بہت کم تھی' لازمی طور پر ان لوگوں نے دستکاروں اور معمولی مزدوروں کی طرح کام کر کے زندگی بسر کرنے لگے' اقتصادی زندگی میں اس انقلاب کا جائزہ اس زمانہ میں لینے کی کوشش نہیں کی گئی اور اب اتنی مدت گذرگئی ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ بچپن میں شہر کے مختلف حصوں اور لوگوں سے متعلق جو تاثرات اور باتیں یاد رہ گئی ہیں ان کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

مرادآباد کا شہر دریا رام گنگا کے داہنی یعنی مغربی جانب واقع ہے اور آبادی کا سلسلہ دریا کے قریب ہی سے شروع ہوگیا ہے۔ رستم خان کے قلعہ کی اس دیوار کے' جو دریا سے ملحق تھی کچھ آثار باقی ہیں۔ یہیں اس میدان میں جس پر کبھی قلعہ کی عمارتیں ہونگی گورنمنٹ اسکول اور اس سے منسلک کھیل کے

میدان ہیں۔ اب یہ کالج ہوگیا ہے۔ اس کے قریب ہی قلعہ والی مسجد ہے۔ اس کے علاوہ چند اور مسجدیں بھی موجود اور آباد ہیں جن کو قدیم عمارات میں شمار کیا جاسکتا ہے' گورنمنٹ کالج سے تھوڑے ہی فاصلہ پر جامع مسجد کی شاندار عمارت ہے۔ یہ بالکل دریا کے کنارے پر ہے اور اپنی جائے وقوع' بلندی اور وسعت کے لحاظ سے اس شہر کی سب سے بہتر اور نمایاں عمارت ہے۔ یہ نہایت آباد مسجد ہے اور وقتاً فوقتاً اس میں توسیع کی جاتی رہی ہے۔ بچپن میں ہم لوگ اکثر جامع مسجد میں جاکر نماز ادا کرتے یہاں سے دریا کی سیر کا لطف بھی اٹھاتے تھے' خاص طور پر ان دنوں میں جب دریا میں طغیانی آتی اور اس کا منظر بہت دلکش ہوجاتا۔ خطرے کے باوجود طغیانی کے دوران بہت سے لوگ ریل کے پل پر چلے جاتے۔ ایک دو مرتبہ یہ جرأت برادر محترم سید احسان الحق صاحب مرحوم کی معیت میں ہم چھوٹے بھائیوں نے بھی کی۔

صوفی محمد حسین صاحب رح

ریلوے پل کے بالکل قریب اور ریل کی پٹری کے مشرقی جانب' حافظ دلی حسین شاہ صاحب رح کا مزار ہے' یہ بھی دریا سے ملحق ہے اور شہر کے لوگ اس کو دھری گھاٹ والی زیارت کہتے ہیں۔ حافظ صاحب چشتی صابری سلسلہ کے ایک بزگ تھے' وہ خود تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن ان کے ایک خلیفہ صوفی محمد حسین صاحب (ف   ) نے ان کے سلسلہ کو بہت بڑھایا اور وہ اپنے زمانہ کے مشہور درویشوں میں شمار ہوتے تھے۔

مرادآباد اور اس کے ملحقہ علاقوں ہی میں نہیں بلکہ دور دراز
کے شہروں اور قصبوں میں، خاص طور پر شمالی ہند پاکستان میں،
ان کے بہ کثرت مرید اور خلفاء تھے، صوفی صاحب سے منسلک
حضرات تو ان کی تعداد لاکھوں میں بتلاتے ہیں۔ یہ تو مبالغہ
معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ تعداد بہت زیادہ
تھی، صوفی صاحب کا زمانہ تصوف بلکہ بالعموم دینی زندگی کے
انتہائی انحطاط کا زمانہ تھا، یہی نہیں کہ صوفیاء اور ان کی تعلیمات
اور اچھے اعمال کا صرف ظاہری ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا اور ان کی
روح مردہ ہوچکی تھی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر قابل افسوس یہ
امر تھا کہ صوفیاء کی سی شکلیں بنا کر اور ان جیسے کپڑے پہن کر
بہت سے جاہل اور مردہ ضمیر رکھنے والے لوگوں نے اس کو پیشہ
بنالیا تھا۔ خانقاہیں اور خانقاہی زندگی اور اسلامی معاشرے کی وہ
خصوصیات جن کو ان بزرگوں کے ذریعہ استقامت حاصل ہوتی تھی،
اب قریباً مفقود ہوچکی تھیں۔ جاہل اور طماع بہ کثرت درویشوں
کی شکل میں نظر آتے تھے، مگر ان کی کثیر تعداد نے درویشی کو
دوکانداری بنالیا تھا، یہ جاہل ہوتے اور جاہلوں کی سی باتیں کرتے
بےعمل تھے اور بےعمل اور غیر ذمہ دارانہ انداز کی زندگی بسر کرتے۔
ہمارے شہر میں بھی صوفیاء کے طبقہ کو ان بدنام کرنے والوں
کی کافی نمایندگی تھی، ان میں سے کئی شخص ہمارے مکان پر،
دادا صاحب کے عرس کے سلسلہ میں یا والد صاحب قبلہ سے ملاقات
کے لئے آتے اور چائے وغیرہ سے ان کی مہمان نوازی کے فرائض ہم
بھائیوں کو ھی انجام دینے پڑتے۔ برادر محترم تو اپنے شعور اور تصوف
سے متعلق معلومات کی بنیاد پر ان کی جہالت اور بےعقلی کی باتوں

کی حقیقت سمجھتے تھے، مگر میں صرف سنتا تھا اور بعد میں
بھائی صاحب مرحوم ان کے متعلق کچھ بتلاتے تھے، ہمارے ایک
عزیز مولوی عبدالوھاج صاحب جن کو ہم لوگ عینک والے ماموں
کہتے تھے، نہایت بلند پایہ عالم تھے۔ انہوں نے تصوف کا گہرا
مطالعہ کیا تھا۔ اور شام کو عصر و مغرب کے درمیان مثنوی مولانا
روم کا درس دیتے، اس میں بھائی صاحب مرحوم پابندی سے شریک
ہوتے اور یوں بھی وہ ماموں صاحب کی خدمت میں بہت زیادہ رہتے
اور ان سے استفادہ حاصل کرتے، اکثر مواقع پر ماموں صاحب ان
جاہل درویشوں سے بھی گفتگو اور بحث کرنے لگتے جو کبھی کبھی
ہمارے مکان پر آتے تھے ان میں سے ایک صاحب جن کا نام
ضیغم حسین تھا، خود کو نہایت قابل اور ذھین سمجھتے اور
وحدت الوجود جیسے ادق مسائل پر تقریر فرمانے کی کوشش کرتے،
ایک دوسرے صاحب جن کا نام حافظ منا، تھا، قصابی کا پیشہ
چھوڑ کر درویش بن گئے تھے۔ یہ بھی وحدت الوجود پر گفتگو کرنے
کی کوشش کرتے اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب قسم کی لغوباتیں
کہتے۔ یہ لوگ اپنی باتوں میں جن لغویات اور کفریات کے
مرتکب ہوتے ان کو دھرانا مناسب نہیں، اللہ تعالی ان کو معاف
کرے اور ہم سب کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بہرحال، درویشوں میں بعض وہ شخصیتں بھی تھیں جو علم
و عمل کے زیور سے مزین ہونے کے علاوہ قدیم بزرگوں کی روایات
کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی تھیں، اور اس میں شک نہیں
کہ ان کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں بہت سے مسلمانوں کے
کردار اور دینی زندگیاں بہتر ہوگئی تھیں۔ ان ھی میں سے ایک

اور شہر کی نمایاں شخصیتوں میں صوفی محمد حسین صاحب تھے۔ میں نے جس وقت صوفی صاحب کو دیکھا' ان کی عمر پچپن چھپن سال ہوگی کیونکہ چند سال بعد ہی ترسٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا' اس وقت میں بہت چھوٹا تھا' اور متعدد مرتبہ ان کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود' ان کی شخصیت اور کردار کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا' والد صاحب قبلہ سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے' اور وہ اکثر ان کے پاس جایا کرتے تھے' صوفی صاحب بھی ہمارے مکان ہر گاہ بہ گاہ تشریف لاتے اور دادا صاحب کے عرس میں پابندی سے شرکت فرماتے' وہ وجیہہ شخصیت رکھتے تھے اور میں سمجھتا ہوں ہر شخص ان کی وجاہت سے متاثر ہوتا ہوگا۔ والد صاحب قبلہ ہمیشہ' ان کی ذہانت' وسعت علم اور بلند کرداری کی تعریف کیا کرتے تھے، ہم دونوں بھائی (یعنی میں اور عزیزی عرفان) ان کے مکان پر کئی مرتبہ گئے اور وہاں کچھ درویشوں اور صوفی صاحب کے منسلکین کو نماز اور وظیفہ میں مشغول یا قوالی سنتے ہوئے دیکھا' لیکن اس وقت اتنی سمجھ نہ تھی کہ وہاں کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا۔ شہر میں جہاں لوگوں کی بڑی تعداد صوفی صاحب سے عقیدت رکھتی تھی اور ان کی تعلیم اور تربیت سے فیضیاب ہوتی' وہاں ایک طبقہ وہ بھی تھا جو ان کے خلاف تھا اور ان پر اعتراض کرتا رہتا' صوفیاء اور علماء کا اختلاف ہر جگہ اور ہر زمانہ میں رہا ہے، وہ یہاں بھی تھا اور اس کے ذکر کی چنداں اتنی ضرورت نہیں۔ لیکن خود صوفی منتش حلقوں میں ایک اور بزرگ صوفی جان صاحب تھے' میں نے ان کو دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ ان کے حلقہ ارادت میں بھی

کافی لوگ داخل تھے' ان دونوں معاصر گروہوں میں یعنی صوفی محمد حسین صاحب اور صوفی جان صاحب کے متوسلین میں ہمیشہ چشمک رہتی' اور اس سلسلہ میں وہ ایک دوسرے پر اعتراض اور تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔

صوفی محمد حسین صاحب، کچھ زمینداری رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں لوگ ان پر اکثر الزام لگاتے کہ ان کو روپیہ سے محبت ہے اور وہ سود لیتے ہیں۔ لیکن یہ سب بیہودہ اور غلط الزامات تھے، والد صاحب نے ان کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کی زندگی کی تفصیلات سے بخوبی واقف تھے' وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب باتیں بے بنیاد اور غلط ہیں' اور وہ لوگ یہ اعتراضات کرتے ہیں جو صوفی صاحب کی مقبولیت اور احترام کی وجہ سے ان سے حسد رکھتے ہیں' ورنہ ان کی زندگی اور کردار نہایت صاف اور عمدہ ہے' اور اس زمانہ میں بہت کم درویش ان جیسا مرتبہ رکھتے تھے ان کے کثیر التعداد خلفاء میں کئی بزرگوں نے خود شہرت حاصل کی۔ دو دلچسپ واقعات یاد ہیں۔ ایک تو صوفی صاحب کو ہمارے مکان پر سماع میں بہت زیادہ دقت ہوئی۔ میں بہت چھوٹا بچہ تھا اور عام طور پر بچے اس حالت و کیفیت کو دیکھ کر ہنستے ہیں' لیکن میں صوفی صاحب کو کیفیت میں دیکھ کر خود بھی رونے لگا اور دیر تک روتا رہا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے ہی ہمیں توشہ میں شریک ہونے کی والد صاحب قبلہ سے اجازت دلوائی اور ہم اس پر بہت خوش ہوئے پھر ہمیشہ توشہ میں شریک ہوتے رہے۔[1]

مرزا صاحب

ایک اور بزرگ جن کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مرزا صاحب تھے۔ ان کی عمر، ہمارے بچپن میں کافی زیادہ تھی کیونکہ ان کے سب بال سفید تھے۔ مرزا صاحب کا رنگ نہایت گورا تھا اور اپنے سفید کپڑوں میں وہ مقدس اور وجیہہ بزرگ معلوم ہوتے تھے۔ سردی کے موسم میں گہرے بادامی رنگ کے کپڑے کی اچکن پہنتے تھے، مرزا صاحب کا پورا نام یاد نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے ان کا نام لیا ہی نہیں جاتا تھا، سب لوگ ان کو صرف مرزا صاحب کہتے تھے، میرا خیال ہے کہ شاید مرزا محمد جان نام ہوگا' ان کے بیٹے کا نام بسم اللہ جان بیگ تھا مرزا صاحب نسلاً مغل تھے اور مرادآباد میں مغلپورہ محلہ میں رہتے تھے'' وہ ابوالعلائی سلسلہ کے بزرگ تھے، اور تصوف کی وسیع معلومات رکھتے گفتگو بہت آہستہ کرتے تھے' لیکن ان کے علم اور اتقا کی وجہ سے ہمارے ماموں مولوی عبدالوہاج صاحب اور تو اور ماموں حکیم احمد علی صاحب حکیم خادم علی صاحب ان سے بہت عقیدت رکھتے یہ سب بزرگ تصوف پر ان کی تقریروں سے مستفیض ہوتے' شاید یہ لوگ ان ہی سے بیعت بھی تھے' مرزا صاحب ہر دوسرے تیسرے روز مکان پر بعد نماز عصر تشریف لاتے اور مغرب کی نماز کے بعد کچھ دیر تک قیام فرماتے۔ سماع کی محفل میں شریک نہیں ہوتے تھے، لیکن اس وقت محفل سے کچھ دور بیٹھے رہتے تھے' چائے بغیر دودھ کے پسند کرتے تھے اور والد صاحب کے ارشاد پر ہم ان کو سادہ چائے ہی پیش کیا کرتے تھے۔

مختصراً' مرزا صاحب نہایت متشرع' باوقار' متعین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔

مغلوں کی رواداری پر تنقیدی نظر

روہیلکھنڈ اور اودھ کے علاقے، یوں تو مغلیہ عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن کے گہوارے تھے' لیکن یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہمیشہ بہت کم رہا اس کا بڑا سبب تو یہی تھا کہ مسلم حکمران' مذہبی رواداری کے اصول پر نہایت سختی سے عمل کرتے تھے اور تبلیغ دین کی انہوں نے سرکاری یا غیر سرکاری طور پر کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی اس پالیسی کو مستحسن بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ تبلیغی امور میں ان کی دلچسپی کو دوسرے مذاہب کی آزادی میں دخل اندازی پر آسانی سے محمول کیا جاسکتا تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ان کی اس معاملہ میں لاپرواہی آخرکار نقصان رساں ثابت ہوئی۔ ان کی حکومت کو مسلمانوں ہی سے استحکام حاصل ہوسکتا تھا' اور اس بناء پر' مسلم قوم کی قوت اور تعداد کے لحاظ سے اس کی ترقی' خود اس کے اقتدار کی بقا کے لئے ضروری تھی' اور اگر وہ دوربینی سے کام لیتے تو ان کے لیئے لازمی تھا کہ اس طرف توجہ کرتے' یہ طریقہ کار قابل اعتراض بھی نہ ہوتا کیوں کہ آج بھی حکمران سیاسی پارٹیاں اپنی جماعتوں کو مستحکم کرنے کی امکانی کوشش کرتی ہیں جو جماعتیں ایسا نہیں کرتیں' ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے ساتھ بھی ہوا' قائداعظم کی وفات کے بعد لیگی رہنماؤں نے جماعتی

تنظیم کی طرف بے توجہی برتی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پارٹی جس نے
برطانیہ اور ہندوؤں کی عظیم قوتوں کے مقابلہ اور مخالفت کے باوجود،
پاکستان حاصل کیا تھا، یہاں آکر اتنی کمزور ہوگئی کہ خود
غرض سیاست دانوں نے اس کو اپنا کھلونا بنالیا، اسی طرح
اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مغلوں کا اقتدار بھی انحطاط کی
منزلیں طے کرتا رہا اور بالآخر اس کا جو حشر ہوا، وہ ہم سب
جانتے ہیں۔ یہاں مغلیہ تاریخ کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کرنا
ضروری ہے کہ اکثر مورخوں نے اکبر کی اس پالیسی کو سراہا ہے
کہ اس نے راجپوتوں کو اعتماد میں لے کر مغلیہ سلطنت کی طاقت
میں بہت اضافہ کیا اور ان حضرات نے مغلوں کی عظیم فتوحات کا
بڑا سبب اسی پالیسی کو قرار دیا ہے یہ نظریہ بہت زیادہ صحیح
نہیں، اگرچہ کہ بعض راجپوت سرداروں کی شاندار خدمات اور
کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ
اٹھارویں صدی میں عالمگیر کی وفات کے چند سال بعد جب مرہٹوں
کی ٹڈی دل افواج نے ہندو پد پادشاہی کا مقصد سامنے رکھ کر
یلغاریں شروع کیں تو مغلیہ سلطنت اس سیلاب کو نہ روک سکی۔
اس میں شک نہیں کہ شاہ ابدالی کی سرکردگی میں مسلمانوں کی
متحد افواج نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دی
سنہ ۱۷۶۱ء میں اور مغلیہ سلطنت کو فوری خاتمہ سے بچالیا،
لیکن چونکہ مسلمان من حیث القوم عدم اتحاد اور عدم یکانگت کے
شکار ہوچکے تھے اس لئے ان میں اب وہ قوت باقی نہ تھی جو
سلطنت کے استحکام کے لئے ضروری تھی، بعض دور اندیش اور
دوربین مصلحت نے جن میں شاہ ولی اللہ خاص طور پر قابل ذکر

ہیں یہ کوشش کی کہ مسلم قوم کی شیرازہ بندی کو نفاق کی
قوتوں سے بچالیں، لیکن ان کی یہ کوشش ایک محدود زمانہ اور
حد تک کامیاب ہوسکی۔ مغلوں کو اپنی پالیسی کے اس کمزور
پہلو کا آخر میں خمیازہ بھگتنا ہی پڑا اور انیسویں صدی کے وسط
میں اکبر و عالمگیر کے جانشینوں کو وہ دن دیکھنا پڑا جس کا ان
کے عہد میں گمان اور وہم بھی نہیں ہوسکتا تھا، مغلیہ سلطنت
کے دور انحطاط میں کئی علاقائی حکومتیں وجود میں آئیں، ان
میں روہیلہ سرداروں نے اپنا اقتدار اس علاقہ پر قائم کیا جو اودھ
اور دہلی کے درمیان ہے۔ مستند مورخین نے لکھا ہے کہ اس دور
طوائف الملوکی میں سب سے بہتر حکمرانی روہیلہ سرداروں کی ہی
تھی، کامیاب حکمرانی کی عملی خصوصیات کے علاوہ ان سرداروں
کی علم دوستی اور حمایت دین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہی
سبب تھا کہ روہیلکھنڈ کے سارے علاقے میں اسلامی شعار اور
دینی رجحانات کے آثار بہ کثرت ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا
میں، روہیلوں کی حکومت کو ختم ہوئے سوا سو سال سے زیادہ گذر
چکے تھے، مگر مغربی تہذیب کے روز افزوں اثر کے باوجود اس
سارے علاقے پر اسلامی تہذیب و معاشرت کے نمایاں اثرات نظر
آتے تھے۔

چند قدیم مساجد

ان اثرات کی ایک نمایاں شہادت، مسلمانوں کے محلوں میں
مساجد کی کثرت تھی یہ مسجدیں تھوڑی تھوڑی دور پر تھیں
اور بعض صورتوں میں دو صورتوں میں صرف دوسو ڈھائی سو قدم

کے فاصلے پر واقع ہوتی تھیں۔ خود ہمارے مکان کے قریب و جوار میں بھی صورت تھی، ہمارے بزرگوں کی بنوائی ہوئی مسجد، املی والی کہلاتی تھی کیونکہ اس میں بہت بڑا املی کا درخت تھا، دوسری جانب، استاد عظیم[1] کی چھوٹی سی مسجد تھی، اس سے ملا ہوا ان کا رہائشی مکان تھا، کچھ فاصلہ پر ایک اور مسجد تھی، جو منہاروں کی مسجد کہلاتی تھی۔ غرض کہ مسلمانوں کی آبادی میں جس طرف جائیے یہی صورت تھی۔ ان میں سے اکثر مسجدوں میں چھوٹے چھوٹے مکتب تھے، جہاں محلہ کے بچے قرآن حفظ کرتے یا ناظرہ پڑھتے تھے، کہیں کہیں اردو کی کتابیں بھی پڑھائی جاتیں۔ بڑی مسجدوں میں باقاعدہ عربی اور دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔

جامع مسجد، شہر کی سب سے زیادہ وسیع اور نمایاں مسجد تھی، یہ دریائے رام گنگا کے کنارے پر قلعہ کی دیواروں سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی کرسی بہت بلند ہے اور دریا کی جانب بیس فٹ سے کم نہ ہوگی۔ اس کے وسیع صحن میں ایک قبر ہے، جو ہمارے جد امجد سید شاہ ابراہیم مرادآبادی کے ایک صاحبزادے کی بتلائی جاتی ہے، اس کے قرب و جوار کا علاقہ محلہ جامع مسجد ہی کہلاتا ہے۔[1]

جامع مسجد کے علاوہ چند اور مسجدیں بھی ہیں جن کے طرز تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کافی پرانی ہیں ان میں جو مجھے یاد ہیں اور جن کو دیکھنے اور ان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، ان میں ایک محلہ گلی شہیدان میں اور دوسری محلہ نواب پورہ

میں واقع ہیں۔ محلہ فیض بازار میں لب سڑک ایک قدیم مسجد ہے، نئی مسجدیں جن میں زیادہ تر ایسی ہیں جو انیسویں صدی میں تعمیر ہوئی ہوں گی، مسلمانوں کے محلوں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

اسلامی معاشرے میں مساجد کی اہمیت

مسجد کو مسلمانوں کی دینی زندگی کے علاوہ معاشری اور معاشرتی زندگی میں بھی ہمیشہ بہت خاص اہمیت حاصل رہی ہے، پنج وقتہ نماز با جماعت ادا کرنے کے سلسلہ میں محلہ اور علاقہ کے لوگوں کا آپس میں ملنا ضروری ہوجاتا ہے، اس سے ان میں یگانگت، اتحاد اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور فروغ پاتے ہیں۔ اور اس طرح اجتماعی زندگی کو استحکام بخشتے ہیں۔ اسلام میں نماز با جماعت ادا کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی نے ایک خصوصی رنگ اختیار کیا ہے جو دوسری اقوام سے مختلف ہے، میرے بچپن میں یعنی بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں، مسجدیں بہت زیادہ آباد تھیں اور کافی تعداد میں لوگ نماز پڑھنے آتے تھے، جمعہ کے علاوہ سب سے زیادہ تعداد نمازیوں کی مغرب کے وقت ہوتی تھی، یہ خصوصیت کسی ایک مسجد کی نہ تھی بلکہ ہر مسجد اور ہر جگہ یہی صورت تھی اور ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ مغرب کی نماز کا وقت بہت کم دیر رہتا ہے اور لوگوں کو فکر ہوتی ہے کہ فوراً نماز سے فراغت حاصل کرلیں۔

نماز جمعہ

جمعہ کی نماز کی اس لئے خاص اہمیت تھی کہ اس میں
تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور ہفتہ میں ایک بار ہوتی تھی۔
سب سے زیادہ جمعیت' جامع مسجد میں ہوتی بلکہ اکثر ناخواندہ
عوام تو اس کو جمعہ مسجد ہی کہتے تھے اور ان کے خیال میں
اس نام کا تعلق نماز جمعہ ہی سے تھا' جامع مسجد میں نماز جمعہ
کی امامت جو شخص کرتا ہے اس کو شہر کا امام اور خطیب کہا
جاتا ہے۔ یہ منصب ہر شہر میں کسی خاص خاندان کے سربراہ کو
ملتا ہے اور اکثر نسلاً بعض نسلاً اسی خاندان میں مدت سے چلا
آتا ہے۔ مرادآباد میں شہر کی امامت، مولوی عالم علی صاحب
کے خاندان مین ہے' مولوی صاحب کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ میں
گرفتار کرلیا گیا تھا' حالانکہ انہوں نے انقلاب میں کوئی حصہ
نہیں لیا تھا' سید احمد خان مرحوم نے کوشش کر کے ان کو چھڑا
لیا تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں مولوی دائم علی صاحب
امامت فرماتے تھے میں نے ان کو کئی مرتبہ دیکھا تھا' امامت
کرتے وقت بھی اور ویسے بھی کیونکہ ہمارے خاندان کے بزرگوں
سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کا رنگ نہایت صاف تھا اور اس پر
سفید ڈاڑھی بہت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ سفید عمامہ باندھتے
تھے اور امامت کے وقت سبز رنگ کا چغہ پہن لیتے تھے بعد میں
ان کے بھتیجے مولوی قائم علی صاحب اس منصب پر فائز ہیں ان
کی آواز نہایت بلند تھی اور عمدہ قرات سے کلام پاک پڑھتے تھے'
وضع قطع اور لباس میں شریعت کی مکمل پابندی کرتے تھے' ایک
موقع پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ مین شعبہ دینیات کی صدارت کے

خواہاں تھے اور اسی سلسلہ میں جب علیگڈھ آئے تو میرے ساتھ
قیام کیا تھا، لیکن ان کا تقرر اس عہدہ پر نہیں ہوسکا۔ ایک
خاص بات یہ تھی کہ شکار سے بہت شوق تھا' اور اپنے کارنامیں
خوب بیان کیا کرتے تھے۔

جامع مسجد کے علاوہ نماز جمعہ اور بہت سی مسجدوں میں
بھی ہوتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نماز پڑھنے والے لوگوں کی
تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ نمازیں دوپہر کے ایک بجے سے ساڑھے تین
بجے تک مختلف اوقات میں ہوتی لیکن مجھے یاد ہے کہ کافی لوگ
بھاگتے ہوئے ہماری یعنی املی والی مسجد میں آتے تھے کیونکہ
یہاں نماز دیر سے ہوتی تھی اور دوسری مسجد میں نہ ملنے کی
صورت میں بھی یہاں مل جاتی تھی۔ نمازیوں کی تعداد اس قدر
زیادہ ہوجاتی تھی کہ اکثر ہم بچوں کو پیچھے دھوپ ہی میں
نماز ادا کرنی ہوتی تھی۔!

۲.

نماز عید

مسلمان، ہر سال دو عیدیں مناتے ہیں ایک پہلی شوال کو
اس جذبہ شکر باری تعالیٰ کے اظہار کی غرض سے کہ رمضان کا
مبارک مہینہ بخیرو خوبی ختم ہوگیا اور روزے پورے ہوگئے
دوسری عید ۱۰ ذی الحجہ کو حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور
ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل کے عظیم قربانی کے لئے تیار
ہوجانے کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے۔ پہلی کو عیدالفطر اور
عرف عام میں چھوٹی یا میٹھی عید کہتے ہیں۔ اور دوسری کو
عیدلاضحیٰ اور عام طور پر بڑی عید کہتے ہین۔ یہاں تفصیل کے

اس تفصیل کی کیا ضرورت ہے!

ساتھ تو بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنے مسلکین کو خوشی منانے کے جو موقعے فراہم کئے ہیں ان کا تعلق بھی عبادت الٰہی اور ایمان کی پختگی سے ہے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ انتہائی خوشی منانے کے سلسلہ میں بھی مسلمان کو نازیبا حرکات نہیں کرنا چاہیئے، چنانچہ عیدین کے موقع پر دو رکعت واجب نماز ادا کرنی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ بڑے مجمع کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر شہر اور قصبہ میں آبادی سے کچھ فاصلہ پر عیدگاہ ہوتی ہے، یہ مستقل عمارت تو نہیں ہوتی، مگر پختہ دیوار کی شکل میں ہوتی ہے جس میں محرابیں اور منبر ہوتا ہے۔ مرادآباد کی عیدگاہ، سنبھل جانے والی سڑک پر، دائیں جانب واقع ہے، اور اس لحاظ سے شاندار کہی جاسکتی ہے کہ اس کا چبوترہ نہایت وسیع اور بلند ہے، جس زمانہ کا میں ذکر کررہا ہوں، اس وقت اس کے چاروں طرف آم کے باغات اور کچھ کھیت تھے، چبوترے سے ملحق ایک وسیع اور کھلا ہوا میدان تھا، جس کو لڑکوں نے کھیل کا میدان (یعنی پلے گراونڈ) بنا لیا تھا چونکہ یہ ہمارے مکان سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، اس لئے ہم بھی اکثر کرکٹ اور ہاکی اسی میدان میں کھیلتے تھے۔ باغات کا سلسلہ عیدگاہ سے آگے دور تک چلا گیا تھا اور اسی سڑک کے بائیں جانب ہمارے خاندان کا وہ باغ تھا جس کو کربلا والا باغ کہا جاتا تھا، اس لئے کہ ہر سال تعزیے اسی کے قریب ایک تالاب میں ڈال دیئے جاتے تھے، عید کے روز ایک خصوصاً میلہ لگ جاتا ہے جس میں بچے بہت دلچسپی لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ عید کی نماز میں بچوں کی کافی تعداد شریک ہوتی ہے۔ بچپن

میں عیدگاہ میں نماز ادا کرنے اور اس کے بعد میلے کی سیر کرنے میں خاص لطف آتا تھا، اب اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔

دینی مدارس اور طریقہ تعلیم

مسلم معاشرے میں، مسجد کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی تھی کہ اس میں آسانی کے ساتھ مدرسہ قائم کردیا جاتا تھا، مرادآباد کی سب مسجدوں میں تو یہ صورت نہ تھی، لیکن کافی جگہوں پر چھوٹے مکتب ان ہی میں تھے، بعض بڑی مسجدوں میں مدرسہ قائم کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، کہیں کہیں اس کے لئے عمارت بھی علیحدہ ہوتی تھی جس میں عظیم اجتماعات کے مواقع پر نماز بھی پڑھی جاتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مدرسہ تعمیر کرنے کے ساتھ مسجد بھی بنوائی جاتی تھی۔ غرضیکہ، نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں مختصراً نظم و طریقہ تعلیم کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جائے تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ موضوع نہایت اہم ہے، قرون وسطیٰ میں کم و بیش ایک ہزار سال تک ملت اسلامیہ، سارے عالم کی رہنمائی کرتی رہی، اور جس زمانہ میں مغربی دنیا پر جہالت اور تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے، اس وقت عالم اسلام کے ہر گوشہ میں علم کی شمعیں روشن تھیں۔ مسلمانوں کی ہی یہ علمی کاوشیں تھیں جنہوں نے اس تاریک دور میں صرف سائنسی تحقیقات کو ہی زندہ نہیں رکھا بلکہ وہ حالات اور ماحول پیدا کیا، جس میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے جنم لیا، اور بالآخر اس کے نتیجہ میں، مغرب کی جدید تہذیب کے درخت نے نشو و نما پائی۔ اسلام نے تحصیل علم ہر

بہت زور دیا ہے' چنانچہ اسلامی دنیا میں تدریس و تعلیم کے انتظامات بہت وسیع پیمانے پر کئے وہاں کی درسگاہوں میں اس زمانہ کے لحاظ سے ہی اعلیٰ معیار کی تعلیم دی جاتی تھی' اور یورپی ممالک کے طالب علم' اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے طویل سفر کرتے اور پھر اپنے وطن پہنچ کر علم کی اشاعت کرتے۔ بغداد سے سمرقند تک متعدد یونیورسٹیاں اور بڑی تعداد میں کتب خانے موجود تھے' اسی طرح اندلس میں بڑے شہروں میں اسی معیار کی درسگاہیں تھیں۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدرسے قائم تھے' اسلامی نظام تعلیم کی ایک بڑی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تعلیم حکومت کی ذمہ داری نہ تھی یہ قوم اور ملت کے افراد کا فرض تھا کہ درسگاہیں قائم کریں اور ان کو چلانے کا انتظام کریں۔ بعض حکمرانوں نے اور وزراء اور امراء نے بھی درسگاہوں کی سرپرستی کی' لیکن وہ بھی انفرادی حیثیت سے۔ دوسری خصوصیت اسلامی تعلیمی نظام کی یہ تھی کہ ساری تعلیم' ابتدائی درجہ سے آخری منزل تک بالکل مفت دی جاتی تھی' فیس کا کوئی سوال ہی نہ تھا بلکہ باہر سے آنے والے طلبہ کی رہائش اور دیگر ضروریات زندگی کا بھی انتظام کیا جاتا تھا' اساتذہ بھی اکثر و بیشتر بغیر کسی معاوضہ کے درس دیتے تھے' اور اپنے اخراجات کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش مہیا کرتے تھے۔ نصاب مختلف مدرسوں میں مقامی حالات کے پیش نظر کچھ مختلف ہوتا تھا' اگرچہ مضامین تقریباً مشترک ہوتے تھے۔ برصغیر میں آخر زمانہ میں اکثر زمانہ میں مدارس میں جو نصاب رائج تھا' وہ درس نظامی کہلاتا تھا'

کیونکہ وہ فرنگی محل کے ایک مشہور عالم ملا نظام الدین نے بنایا تھا' اس میں کہیں کہیں ترمیم بھی کرلی جاتی تھی' مثلاً شاہ ولی اللہ نے اپنے مدرسہ میں کچھ ترمیم کے ساتھ اس کو جاری کیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نصاب میں جو مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں زیادہ تر دینی علوم مثلاً قرآن' تفسیر' حدیث' فقہ وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷) کے بعد مسلم معاشرے میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا' چنانچہ تعلیمی اور تدریسی زندگی کی خصوصیات بڑی حد تک بدل گئیں' مسلمانوں کے معاشی حالات اب ایسے نہ تھے کہ مدرسے بغیر معاوضہ کے اپنے فرائض انجام دے سکتے۔ تعلیم کے معیار اور نتائج پر بھی اثر پڑا' خوشحال خاندانوں کے اکثر لڑکے مغربی طرز کی تعلیم حاصل کرتے تھے' اور ان دینی مدارس میں زیادہ تر نچلے طبقوں کے بچے جانے لگے۔

جنگ آزادی کے خاتمہ پر تباہی و بربادی کا جو سیلاب برصغیر کے شمالی علاقوں میں' بالخصوص دہلی سے اودھ تک کے علاقے میں آیا۔ اس میں بہت سی قدیم درسگاہیں ختم ہوگئیں' بہرحال چند سال بعد ہی دیوبند میں ایک عظیم مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی' اور بعض علماء کی کوشش سے بہت جلد اس نے نمایاں ترقی کی۔ ایک مدت کے بعد بریلی میں ایک اور مدرسہ قائم ہوا اور وہ بھی جلد ہی ترقی کرگیا یہ دونوں مدرسے اس لئے بھی قابل ذکر ہیں کہ ان کے اساتذہ اور طلبہ کے عقائد میں بعض فروعی مسائل پر سخت اختلافات ہیں جس کا اثر دور دور تک نظر آتا ہے۔ مرادآباد میں بھی دو مدرسے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے

ایک کا تعلق دیوبند اور دوسرے کا بریلی سے ہے۔ اول الذکر بادشاہی مسجد میں جو وسط بازار میں واقع ہے اور دوسرا محلہ نواب پورہ میں، اس کے بانی مولوی نعیم الدین مرحوم تھے، جن کے خاندان سے ہمارے خاندان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ مولانا نہایت قابل اور ذہین عالم تھے، اور اپنے خیالات میں بے حد پختہ، دینی مسائل پر فاضلانہ تقریر کرتے تھے، ایک موقع پر سیرت کے جلسوں میں شرکت کے لئے علیگڈھ مدعو کیا گیا۔ میرے مکان پر قیام فرمایا۔ ہماری کوشش کے باوجود کرسی اور میز پر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ زمین پر فرش بچھوا کر کھاتے تھے۔ اپنے مدرسہ میں دستاربندی کے موقع پر عظیم الشان جلسے کرتے تھے۔ جن میں ملک کے بہت سے مشہور علماء شرکت کرتے اور شہر کے مختلف علاقوں میں وعظ دیتے تھے، ان جلسوں میں اکثر ہم بھی تقریریں سننے جاتے۔ خاص طور پر، برادر محترم سید احسان الحق صاحب مرحوم اور راقم الحروف۔ ان کے علاوہ اور مدرسے بھی تھے، لیکن شہر میں ان ہی دو مدرسوں کی شہرت زیادہ تھی۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل میں صوفیہ کا حصہ

اسلامی معاشرے کی ابتدائی چند نسلوں کے بعد ہی سے صوفیہ کا اثر قائم ہوا اور تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا، اگرچہ اسلامی تعلیمات کی روح کا تقاضا یہ تھا کہ اہل دین اور دنیاداروں میں کوئی فرق نہ ہو بلکہ ہر مسلمان میں روحانیت کے ساتھ دینوی امور میں حصہ لینے اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا احساس اور صلاحیت ہونا چاہیئے۔ لیکن ہوا یہ کہ دوسری

اقوام کی طرح مسلمانوں کی اکثریت ہی دنیوی امور میں اس طرح ملوث ہوگئی کہ ان لوگوں کی روحانیت کمزور ہوتی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے دین دار طبقے بھی، قولاً و عملاً ایمان کی پختگی، خدا ترسی اور شریعت پر عمل کرنے میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ آگے بڑھے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی شاید غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی، اور توسیع حکمرانی اور ان کے نتیجہ میں زندگی کی پیچیدگیوں میں اضافہ کا لازمی اثر یہی ہونا چاہیئے تھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں دینوی امور میں ملوث ہوجائیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اسلام نے جس معاشرہ کا تصور پیش کیا ہے اس میں زندگی کے دینی اور دنیوی شعبوں کو علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ مکمل انسانی زندگی کے لئے دونوں کا ساتھ ہونا اور دونوں میں ایک توازن کی موجودگی ضروری ہے، سب سے نمایاں خصوصیت اس معاشرہ کی یہ ہے کہ اس کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقتدار پر ہونی چاہیئے تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتی ہوئی اسلامی دنیا میں جو معاشرہ یا معاشرے (مختلف علاقوں میں) وجود میں آئے، وہ اگر اسلامی تصور کے معیار پر مثالی نہ تھے تو اس سے بہت زیادہ دور بھی نہ تھے۔ لیکن زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، یہ فرق زیادہ ہوتا گیا۔

بہر حال، تشکیل معاشرہ کے عمل اور اس میں مختلف قوتوں کی کشمکش سے جو حالات پیدا ہوئے ان میں کچھ لوگوں نے جن

کی تعداد بہت کم تھی، زندگی کا وہ طریقہ اختیار کیا جس میں ان کی کوشش اور وقت زیادہ تر روحانی درجات کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا، اور دنیوی معاملات سے ان کا تعلق اسی تک رہتا جو معمولات زندگی کے لئے ناگزیر تھا، اسی کو زہد کہتے تھے[1] اور وہ لوگ جو اپنی زندگی اس طریقہ پر بسر کرکے زہاد کہلانے لگے' یہ ظاہر ہے کہ زہد کی اعلیٰ ترین اور مکمل ترین مثال ہمیں' آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ میں ملتی ہے' متاہل زندگی' جہاد میں شرکت اور وسیع علاقے کے نظم و نسق کی سربراہی کے باوجود آپ نے کبھی خودکو دنیوی امور میں ملوث نہیں ہونے دیا' ہمیشہ زہد اور فقہ کی زندگی بسر کی' دنیا اور حصول دنیا کی مذمت فرمائی۔ یہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کیا' آپ کی زندگی کا یہی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے اور جس طبقہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس نے اسی کا اتباع کیا' ان کا سلسلہ اصحاب صفہ سے شروع ہوا اور متواتر جاری رہا۔ مگر ابتدائی دور میں صحابہ اور تابعین کے القاب اس قدر محبوب اور عزیز تھے کہ کسی دوسرے لقب کی ضرورت نہ سمجھی گئی' زاہد کی اصطلاح نے بعد میں رواج پایا اور دوسری صدی ہجری میں یہ لوگ صوفیہ کہلانے لگے۔ تصوف پر بعض مصنف نےتعصب یا اس کی صحیح حقیقت نہ سمجھنے کی بناء پر جو اعتراضات کئے ہیں' ان پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی' لیکن یہ ضروری ہے کہ صوفیہ نے اسلامی معاشرے کی تشکیل اور ترقی میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے (اس کا اعتراف کیا جائے) سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور ہونی چاہئے کہ صوفی تارک الدنیا ہوتا ہے۔ وہ تارک الدنیا اسی حیثیت سے ہوتا ہے

کہ اس کے نزدیک خدا اور رسول کی محبت' عبادت و ریاضت اور حسن اخلاق یا مختصراً بلند روحانی مقامات حاصل کرنے کے مقابلہ میں دنیوی شان و شوکت اور مال و دولت وغیرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی' چنانچہ توبہ و استغفار' توکل و قناعت صبر و رضا اور عجز و انکسار وغیرہ جیسے اوصاف کس میں پیدا ہوتے ہیں ان کے حصول کے لئے وہ زہد و فقہ کی زندگی بسر کرتا ہے اور جزئیات میں بھی رسول اکرم صلعم کے اتباع کی کوشش کرتا ہے۔

معاشری و تاریخی نقطہ نظر سے صوفیہ کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی دینی و روحانی تربیت اپنی ذمہ لی' اور سلاسل کے ذریعہ ایک عظیم تنظیم قائم کرکے' معاشرے کو صحیح خطوط پر چلانے اور قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی ہر آبادی میں قدیم زمانہ کے صوفیہ کے مزارات مرجع خلائق ہوتے ہیں' اور یادگار کے طور پر وہاں عرائس کی محفلیں اور فاتحہ منعقد ہوتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کسی اور طبقہ کے رہنماؤں کی یاد اس پیمانہ پر اور اس جوش اور پابندی سے نہیں منائی جاتی جیسے ان بزرگوں کی' ان جلسوں کی ایک خوصیت یہ بھی ہے کہ مجمع میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی بہ کثرت شریک ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ روحانی اور دینی تربیت اور تبلیغی کاموں کے سلسلہ میں ان حضرات کی خدمات اتنی واضح اور نتیجہ خیز رہی ہیں کہ لوگ خود بہ خود ان کو یاد رکھتے ہیں۔[1]

مرادآباد کے مزارات

شیخ علاءالدین و پیر غائب سلطان قطب الدین

سب سے قدیم مزار اس شہر میں شیخ علاء الدین رح کا ہے افسوس یہ ہے کہ آپ کے حالات قدیم تذکروں میں نہیں ملتے۔ صاحب انوارالعارفین[1] نے بھی کچھ تفصیلات بیان نہیں کیں اور صرف یہ کہا ہے کہ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ آپ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی رح کے خلفاء میں تھے' بہرحال اس قدر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں شہر کی بنیاد پڑنے سے پہلے تشریف لائے ہوں گے کیونکہ مزار قدیم شہر کی حدود سے باہر واقع ہے' اس پر عمارت نہیں' صرف چند فٹ اونچی چہار دیواری ہے' جس کے متعلق ہمارے خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت شاہ ابراہیم صاحب رح نے خود بنائی تھی۔

سلطان پیر غائب رح کا مزار وسط شہر میں ہے' یہ محلہ آپ کی ہی نسبت سے محلہ پیر غائب کہلاتا ہے آپ کے حالات بھی کسی مستند کتاب میں نہیں ملے' روایتاً یہ مشہور ہے اور انوارالعارفین میں بھی اس کا ذکر ہے کہ ان کا نام سلطان قطب الدین تھا' اور وہ اور ان کے ساتھی اسی مقام پر جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے اور یہیں دفن کردیئے گئے' یہ واقعہ بھی بہت قدیم ہوگا' اس کی شہادت اس سے بھی ملتی ہے کہ مزار کے احاطہ میں جتنی قبریں ہیں وہ معمولی قبروں سے بہت کافی بڑی ہیں' وسط شعبان میں عرس کے موقع پر مختصر سا میلہ بھی لگ جاتا ہے۔ ہمارے مکان سے یہ جگہ دو فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر ہے اس لئے یہاں میلے میں

بچپن میں بڑے شوق کے ساتھ ہم سب جایا کرتے تھے۔ مزار پر عمارت نہیں' صرف چہار دیواری ہے جو خاصی وسیع ہے۔

شاہ ابراہیم مرادآبادی

قدامت کے لحاظ سے شاہ ابراہیم رح کا مزار بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کے حالات آیندہ صفحات میں بیان کئے جائیں گے' لیکن یہاں یہ ذکر کیا جاسکتا ہے کہ مزار کی عمارت جو عالمگیر کے ابتدائی دور میں تعمیر ہوئی ہوگی نہایت خوبصورت ہے اور اس کا گنبد اور طرز تعمیر بتلاتا ہے کہ مغلیہ فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ مزار کی عمارت کے چاروں طرف سات آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ ہے اندر چھ قبریں ہیں' پانچ ایک قطار میں ہیں' جن میں درمیان کی قبر حضرت شاہ ابراہیم رح کی ہے اوو ہر دو طرف دو دو قبریں آپ کے صاحبزادوں کی ہیں' ان کے نیچے جنوب مشرق میں کونے کی طرف آپ کی زوجہ محترمہ کی قبر ہے' جس پر ایک تختی بنی ہے اس شکل کی جو پہلے زمانہ میں بچوں کو لکھنے کی مشق کے لئے دی جاتی تھی۔ عمارت کے ہر چہار طرف کشادہ جگہہ ہے جس میں متعدد قبریں ہیں۔ مزار کے شمال مشرق کی جانب ہمارے اجداد اور اقرباء کی قبریں ہیں۔ ایک مختصر دو فٹ بلند احاطہ میں پر دادا صاحب شاہ سید عبدالحق رح اور بابا صاحب سید شمس الحق اور والد صاحب قبلہ سید مجیب الحق دفن ہیں۔[1]

شاہ ابراہیم صاحب رح کے مزار کی دیکھ بھال اور سالانہ عرس کا اہتمام ان کی اولاد میں' ہمارے اجداد کے علاوہ دوسری شاخ کے بزرگ خاندان کے ذمہ تھا اس کے لئے کچھ جائیداد بھی وقف

تھی۔ ہمارے بچپن کے زمانہ میں اس خاندان کے سربراہ اور مزار کے مہتمم کا نام احمد علی شاہ تھا' وہ علم اور عمل دونوں سے بے بہرہ تھے' لیکن آخر زمانہ میں وہ رامپور کے ایک بزرگ سے بیعت ہوگئے' جن کا نام مدن شاہ تھا' والد صاحب قبلہ رح سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ سال میں دو تین مرتبہ مرادآباد آتے اور ہمارے یہاں قیام فرماتے تھے' قادریہ سلسلہ میں بیعت تھے اور ان کے مریدوں کی تعداد مرادآباد میں بھی کافی تھی' نہایت خوش مزاج تھے اور بچوں سے بہت محبت کرتے تھے گفتگو میں عادتاً (غصہ میں نہیں) گالیاں بکتے رہتے' جو روپیہ آتا وہ خرچ کردیتے تھے' ان سے بیعت کرنے کے بعد احمد علی شاہ نے عرس بھی بڑے پیمانے پر شروع کردیا اور مہمانداری پر بھی بہت خرچ کرنے لگے' جس کے نتیجہ میں جائیداد کا بڑا حصہ فروخت ہوگیا' چنانچہ ان کے بیٹے محمود علی کو عسرت کی زندگی بسر کرنا پڑی' اس کے علاوہ وہ کچھ ایسے علماء کے زیر اثر آ گئے جو صوفیہ اور ان کے عقائد وغیرہ کے خلاف رہتے ہیں چنانچہ انہوں نے صرف عرس وغیرہ ہی کا سلسلہ ختم نہیں کردیا بلکہ مزار کی دیکھ بھال اور ضروری مرمت کی طرف سے بھی بے توجہی برتنے لگے' لیکن اسی زمانہ میں کانپور یا اسی طرف کسی اور مقام سے ایک درویش آئے اور مزار کے برآمدہ کے ایک کونے میں گوشہ گیر ہوئے۔ لوگ ان کی خدمت میں بطور نذرانہ کچھ پیش کرتے' وہ یہ رقم مزار کی مرمت وغیرہ پر ہی صرف کردیتے تھے' کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا' مختصراً یہ کہ ہمارا خاندان وہاں سے منتقل ہوکر محلہ متصل سرائے

پختہ آ گیا اور دوسرے خاندان ختم ہوگئے یا گمنامی میں چلے گئے۔ لیکن یہ محلہ اب بھی پیرزادہ محلہ کہلاتا ہے۔

شاہ غلام حسین صاحب رح شاہ بلاقی صاحب رح شاہ مکمل صاحب رح اور بعض دیگر بزرگوں کے مزارات

یوں تو مرادآباد میں مختلف بزرگوں کے مزارات ہیں لیکن ان مزارات کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے تین مزار مزید قابل ذکر ہیں۔ شاہ غلام حسین چشتی صابری سلسلہ میں ملا خوند فقیر رح کے خلیفہ ہیں' ان کا مزار رامپور میں ہے اور اس سے ملحقہ مسجد حلقہ والی مسجد کہلاتی ہے۔ شاہ غلام حسین صاحب کا مزار مرادآباد کے اس محلہ میں ہے جو آج بھی محلہ بقیہ کہلاتا ہے۔ مزار کی مختصر عمارت کے ایک جانب سماع خانہ اور دوسری طرف مسجد ہے۔ شاہ بلاقی صاحب کا مزار ایک چہار دیواری میں ہے۔ سالانہ عرس کے موقع پر خاصا بڑا میلہ لگ جاتا ہے' شاہ مکمل صاحب کا مزار عیدگاہ کے قریب واقع ہے' یہاں بھی عمارت نہیں صرف چہار دیواری ہے۔

باب دوم

سید شاہ محیب الحق صاحب رح

والد ماجد حضرت سید شاہ محیب الحق صاحب رح، غالباً ۱۸۷۰ میں پیدا ہوئے۔[1] بچپن دادی صاحبہ کے سایہ عاطیفت میں گذرا، ابھی چھوٹے ہی تھے، غالباً سات آٹھ سال کی عمر ہوگی کہ محلہ پیرزادگان کے موروثی مکان میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر خاک ہوگیا۔ یوں تو درویشوں کے مکان میں سامان زیادہ نہیں ہوتا، لیکن والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر میں قلمی کتابیں کئی صندوقوں میں بھری ہوئی تھیں۔ یہ بیش بہا ذخیرہ بھی راکھ کا ڈھیر ہوگیا، اور اس کا ان کو ہمیشہ صدمہ رہا۔ مکان جل جانے پر دادی صاحبہ نے ان کو اپنے داماد یعنی ہمارے پھوپھا صاحب، مولوی اسد علی کے پاس بھیجا، وہ فوراً آئے اور دادی صاحبہ کو اور والد صاحب کو اپنے مکان پر لے آئے۔ اس وقت سے وہ اور دادی صاحبہ اور پھر ہم لوگ سب یہیں رہے، کیونکہ یہی ہماری نانہیال ہوگئی۔

نانہیال

جس خاندان میں راقم الحروف کی دونوں پھوپیوں کی شادی ہوئی تھی اسی مین والد صاحب کی بھی شادی ہوئی اس طرح یہ خاندان ہماری نانہیال ہوگیا۔ یہ شہر میں علماء اور اطبا کا ایک سربرآوردہ خاندان تھا، اور شہر کے جنوبی حصہ میں پختہ سرائے کے قریب سکونت پذیر تھا۔ اس محلہ کا نام ھی متصل سرائے

پختہ تھا، اور چوں کہ اس سرائے کے شمالی اور جنوبی دروازوں سے گذر کر سڑک سنبھل کو جاتی تھی اس لئے اس کو سنبھل دروازہ بھی کہتے تھے۔[1] سرائے کے دروازے سے یہ مکان تقریباً ایک یا سوا فرلانگ پر ہوگا۔

خاندان کے جد اعلیٰ مولوی عصمت اللہ غالباً قاضی کے عہدے پر فائز ہوں گے۔ میرا قیاس ھے کہ انیسویں صدی کے شروع میں برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ عہدہ ختم ہوگیا ہوگا کیونکہ یہ ذکر کیا جایا کرتا تھا کہ حکومت کی طرف سے قضاۃ کا وظیفہ ملتا تھا، یہ بھی ممکن ھے کہ یہ وظیفہ جنگ آزادی کے بعد ختم کردیا گیا ہو، اس لئے کہ مولوی عصمت اللہ کے صاحبزادے مولوی وزیر علی انقلاب سے قبل مولوی منو کی حمایت میں شریک تھے اور خاندان میں یہ روایت بھی مشہور تھی کہ ایک روز کے لئے ان کو گرفتار کرکے قید میں رکھا گیا تھا۔

بہرحال، مولوی عصمت اللہ، شہر میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ صاحب جائیداد بھی تھے اور اس لحاظ سے بھی سربرآوردہ لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی دو بیویاں تھیں اور دونوں سے اولاد تھی۔ ایک بیوی کے بیٹے مولوی وزیر علی تھے، دونوں بیویوں کی اولادوں میں تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں تھے، لیکن ان کے مکانات ایک دوسرے سے ملحق تھے[2] مولوی وزیر علی کے پانچ لڑکے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے بڑے صاحبزادے حکیم امیر علی، طبابت کرتے تھے، اور اس حیثیت سے شہر کی نمایاں اور مقتدر ہستیوں میں ان کا شمار تھا۔

عالم ہونے کے علاوہ، وہ نہایت متقی اور پرہیز گار شخص تھے۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے کجنپورہ جا کر اپنے والد سے درخواست کی کہ مجھے بیعت کرلیجئے تو پہلے انہوں نے یہی فرمایا کہ حکیم امیر علی سے بیعت کیوں نہیں کرلیتے وہ نہایت عمدہ بزرگ ہیں انہوں نے اپنی موروثی جائیداد کو بھی سنبھالا اور ترقی دی اور طبابت کا سلسلہ شروع کرکے، شہر میں عزت و احترام کا مقام حاصل کیا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ دور حاضر سے قبل طبابت کو خدمت خلق کے جذبہ کے ساتھ اختیار کیا جاتا، اور اس کو صرف روزی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اطبا، دوائیاں فروخت نہیں کرتے تھے اور نہ مطب میں آنے والے مریضوں سے معائنہ کی فیس وغیرہ لیتے تھے، خوش حال لوگ جو نذرانہ پیش کرتے وہ قبول کرلیتے تھے۔ ساتھ ہی یہ کوشش کرتے کہ نسخے میں قیمتی اجزاء بغیر ضرورت کے شامل نہ کئے جائیں۔ حکیم امیر علی صاحب اور ان کے صاحبزادوں کا بھی یہی طریقہ تھا اس طرح غریب شخص بھی ان کے علاج سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔[1]

پاٹک والا مکان

حکیم امیر علی صاحب اور ان کے چار بھائی ایک ہی مکان میں رہتے تھے جو پھاٹک والا گھر یا مختصراً ”پھاٹک،، ہی کہلاتا تھا۔ یہ وسیع مکان دو حصوں میں تقسیم تھا، مردانہ و زنانہ حصے علیحدہ تھے۔ مردانہ حصہ کا دروازہ بڑا تھا اور اسی لئے اس کو پھاٹک کہتے تھے۔ اس کے سامنے چوکور صحن

تھا، جس کے شرقی غربی و جانب دو صحنچیاں تھیں جن میں تین تین دروازے تھے، اور جنوب و شمال کی طرف دو دالان تھے۔ ایک کونے میں زنانہ مکان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ زنانہ حصہ میں در حقیقت پانچ مختلف مکان تھے، جن کا صحن مشترک تھا۔ یہ مکانات دو منزلہ تھے، اور اگرچہ وہ بڑے نہ تھے لیکن اس زمانہ میں متوسط طبقہ کی طرز رہائش اور مختصر ضروریات کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے، جب ان کی اولادوں کی ضروریات بڑھیں تو ان میں سے بعض نے علیحدہ مکانات بنوائے اور وہاں سکونت اختیار کرلی۔

مولوی اسد علی اور ان کے چند شاگرد

حکیم امیر علی کے چار بھائیوں کے نام علی الترتیب یہ تھے: مولوی مشہور علی، محمد حسین، مولوی اسد علی اور محمد اسماعیل۔ ان میں سے دو یعنی مولوی منیرعلی اور مولوی اسد علی، راقم الحروف کے بڑے اور چھوٹے پھوپا تھے، محمد حسین، ہمارے نانا تھے، علم وفضل کے لحاظ سے ہمارے دونوں پھوپا ہی نمایاں حیثیت رکھتے تھے، اگرچہ عام طور پر لوگ سب کو مولوی کہتے تھے بلکہ خاندان ہی مولویوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ بڑے پھوپا یعنی مولوی منیر علی، ضلع مرادآباد کی ایک تحصیل ٹھاکردوارہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے، مولوی اسد علی مکان پر ہی رہتے اور وہیں خاندان کے اور بعض دوسرے لڑکوں کو پڑھاتے، ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں شخصیت مولوی عبدالوہاج صاحب کی تھی، جس کا ذکر اوپر پہلے بھی کیا گیا ہے، وہ علوم شرقیہ ہی میں فارغ التحصیل نہیں تھے بلکہ انگریزی تعلیم بھی میٹرک تک حاصل کی اور اس کا امتحان پاس کیا، وہ حکیم امیر علی صاحب

کی بہن کے لڑکے یعنی ان کے بھانجے تھے' اور خاندان میں پہلے
شخص تھے جنھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اب خاندانی جائداد
اتنی نہ تھی کہ اس پر ہی اکتفا کیا جاتا' اس لئے بعض افراد
نے ملازمت یا دوسری قسم کے روزگار کا سلسلہ شروع کردیا تھا'
مولوی عبدالوہاج نے بھی مشن اسکول میں ملازمت کرلی اور عمر
کا باقی حصہ یعنی تقریباً پچاس سال اسی ادارہ سے منسلک رہے'
وہ والد بزگوار اور ہم بھائیوں سے خاص طور پر برادر محترم سید
احسان الحق صاحب مرحوم سے بہت محبت کرتے۔ مولوی
عبدالوہاج' کلیتہً اسلامی اور مشرقی اقتدار کے حامی اور ان پر
عمل پیرا تھے' اسکول میں بھی عمامہ اور چوغہ پہن کر جاتے تھے'
جب اچکن اور ٹوپی پہنتے تو وہی قدیم طرز کی' مزاج میں غصہ
قدرے زیادہ تھا اور شاگردوں پر جن میں راقم بھی شامل تھا اکثر
خفا ہوتے بلکہ کبھی کبھی ان کو مارتے بھی تھے' جسم دبلا پتلا
تھا' چشمہ ہر وقت لگاتے تھے' بغیر لکڑی کے باہر نہیں نکلتے تھے
لباس سادہ مگر نہایت قرینہ کا اور صاف ہوتا تھا' اپنے زمانہ میں
وہ خاندان کی نمایاں اور محترم شخصیت تھے' ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا
کہ خاندان میں انگریزی جدید تعلیم کو رواج دیا' چنانچہ اسی سلسلہ
میں والد صاحب قبلہ نے بھی اسی مشن اسکول میں تعلیم حاصل
کی۔ مولوی عبدالوہاج کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالباری عالم تھے
لیکن وہ نہایت مغرور اور بد طبیعت انسان تھے اور ہر شخص ان کو
حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مولوی اسد علی کے دو اور شاگرد قابل ذکر ہیں' منشی
توصیف حسین اور مولوی شریعت اسلام۔ اول الذکر ضلع بجنور میں

قصبہ سیوہارہ کے رہنے والے تھے۔ تعلیم کی غرض سے مرادآباد
آئے تھے اور اپنے استاد ہی کے ساتھ رہتے تھے' میں نے ان کو
سیوہارہ میں اس وقت دیکھا جب وہ کافی ضعیف ہوچکے تھے
مکان پر ہی رہتے تھے۔ کبوتروں سے بہت شوق تھا اور کافی تعداد
میں پلے ہوئے تھے' چلتے وقت انھوں نے بھائی صاحب مرحوم کو
نہایت خوبصورت سفید رنگ کے کبوتر دیئے اس طرح ہمارے گھر
میں ہی وہ پالے گئے تھے' مولوی شریعت اللہ کا وطن سنبھل تھا'
وہ بھی مولوی اسد علی کے پاس پھاٹک والے مکان کے بیرونی حصہ
میں رہتے تھے' بعد میں ان کی شادی بھی مولوی اسد علی نے
اپنی بھتیجی یعنی مولوی منیر علی کی صاحبزادی سے کردی اس
کے بعد وہ مستقلاً یہیں رہے ان کے بڑے صاحبزادہ خان بہادر مولوی
ظفر حسن صاحب نے اعلیٰ تعلیم' بلند مرتبہ اور وسیع شہرت
حاصل کی۔[1]

والد صاحب قبلہ کا سفر کنج پورہ اور دادا صاحب کی خدمت میں حاضری

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے جب مکان نذر آتش ہوگیا تو
دادی صاحبہ اپنے دو سالہ بیٹے کو لے کر مولوی اسد علی کے
پاس ہی آگئیں' چنانچہ والد صاحب کی ابتدائی پرورش اور تعلیم
ان ہی کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔[2] والد صاحب نے پہلے عربی
فارسی پڑھی اور پھر مدرسہ میں داخل ہوکر انگریزی تعلیم حاصل
کی۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی ان کو حالات کی بنا
پر ملازمت کرنی پڑی جو کہ مولوی عبدالوہاج مشن اسکول میں

تھے اس لئے ان کو بھی وھیں جگہ مل گئی' اسی زمانہ میں والد صاحب نے کنجپورہ جانے کا قصد کیا تاکہ اپنے والد صاحب کی خدمت میں حاضری دیں' اس وقت ان کی عمر' تقریباً اٹھارہ انیس سال ھوگی۔ والد صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ جب میں اس باغ میں پہنچا جہاں دادا صاحب معتکف تھے' تو وہ وظیفہ پڑھ رھے تھے' میں ایک طرف کو بیٹھ گیا' وظیفہ سے فارغ ھوکر میری طرف مخاطب ھوئے اور یہ خیال کرکے کہ اور لڑکوں کی طرح میں بھی تعویذ وغیرہ لینے یا دعا کرانے کی غرض سے آیا ھوں مجھ سے کہنے لگے' کہو میاں صاحبزادے کیسے ھو؟ میں نے جواب دیا کہ میں تو آپ کا بیٹا ھوں' مرادآباد سے آپ کی خدمت میں حاضر ھوا ھوں' اس پر فوراً گلے لگا لیا اور پاس بٹھلا کر گھر کے متعلق دریافت کرتے رھے۔[1] چند ماہ والد صاحب قبلہ ان کی خدمت میں رھے اور روحانی تربیت حاصل کی' دادا صاحب نے ان کو بیعت کیا اور رخصت کرنے سے پہلے' خلافت بھی عطا کردی چلتے وقت یہ بھی ہدایت کی کہ شادی جلد ھی کرلینا اور کسی چیز میں ھمارا انتظار نہ کرنا ھم نہ آسکیں گے۔

محترمہ والدہ صاحبہ مسماۃ سکینہ بیگم

کنجپورہ سے واپسی پر جلدھی والد صاحب قبلہ کی شادی مولوی اسد علی کی بھتیجی یعنی محمد حسین صاحب کی صاحبزادی مسماۃ سکینہ بیگم سے ھوگئی' ھم نو بہن بھائی ھوئے جن میں سے چار بھائی اور ایک بہن جو سب کے سب برادر محترم سید احسان الحق سے چھوٹے اور مجھ سے اڑے تھے بہ زمانہ طفلی

بڑے

وفات پاگئے' چار بھائی زندہ رھے' ان کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ شادی کے وقت ان کی عمر بہت کم تھی' قیاساً کہا جاسکتا ھے کہ ان کی ولادت ١٨٧٠ میں ھوئی ھوگی اور شادی ١٨٩٠ میں ان کو خواندہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ صرف قرآن شریف یا چند دعائیں بغیر معنی کے پڑھ سکتی تھیں اس زمانہ میں مسلمانوں کی لڑکیوں کو مدرسوں یا اسکولوں میں بھیج کر تعلیم دلانے کا رواج نہ تھا' اس کے دو خاص سبب تھے' پہلا تو مغربی تعلیم کی طرف سے بے التفاتی' بلکہ اس کو قدرے حقارت کی نظر سے دیکھنا' جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسکولوں میں جانے والے لڑکیوں کی تعداد بہت کم ھوتی تھی' اور لڑکیوں کا تو سوال ھی پیدا نہ ھوتا تھا' دوسرا سبب پردے کی سخت پابندی تھی' مسلمانوں میں عام طور پر اور شرفاء کے خاندانوں میں خاص طریقہ سے عورتیں پردے میں رھتی تھیں اور چھوٹی ھی عمر سے بچیوں کے باھر نکلنے کی سخت ممانعت ھوتی تھی' یہ سلسلہ انسویں صدی کے آخیر تک بلکہ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بھی جاری تھا۔ برقعہ اوڑھ کر بھی صرف نچلے طبقوں کی عورتیں باھر آتی تھیں' شرفاء کے خاندانوں کی عورتیں سواری میں بھی کہیں جاتیں تو اس سواری کو چاروں طرف سے پردے سے ڈھک دیا جاتا تھا' یہاں پر اس حد تک پردے کی پابندی لگائے جانے کے جواز یا غیر جواز اور اس کے فوائد و نقصانات پر بحث کرنا مقصود نہیں' نہ اب اس بحث کا کوئی فائدہ ھے لیکن اس دور کی معاشرت کی یہ ایسی اھم خصوصیت تھی' جس کا اثر ھماری تہذیب و تمدن پر بہت نمایاں تھا' اور جہاں تک

تعلیم کا تعلق تھا' لڑکیوں کی حد تک اس کا دائرہ نہایت محدود
تھا۔ ان کی تعلیم کا گھروں کے اندر ہی خاص طور پر اہتمام
کیا جاتا تھا اور استانیوں وغیرہ کے ذریعہ ان کو مختصر سی تعلیم
دے دی جاتی تھی' لیکن لڑکیوں اور لڑکوں' دونوں کے لئے
قرآن شریف کا پڑھ لینا (بغیر معنی سمجھے ہوئے) ضروری تھا'
چونکہ اردو رسم الخط عربی سے بہت زیادہ مختلف نہیں' اس لئے
بچے قرآن شریف پڑھنے کے بعد اردو آسانی سے پڑھنے لگتے تھے۔

چونکہ والد صاحب مع اپنی والدہ کے پھوپا صاحب کے مکان
پر مقیم تھے' اس لئے شادی کے بعد والدہ بھی وہیں آئیں۔ غالباً
مولوی اسد علی کا انتقال ہوگیا[8] تھا لیکن والد صاحب نے مرادآباد
کے مشن اسکول میں بحیثیت معلم' ملازمت کرلی تھی' اور اب
سارے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال ان ہی کے ذمہ تھی مولوی
اسد علی کے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ ان کے نام یہ
تھے' یوسف علی' افضل علی اور اشفاق علی' صاحبزادی کا نام
فریدہ بیگم تھا'[9] والد صاحب نے کوشش کی کہ پھوپا صاحب کے
لڑکے تعلیم حاصل کرکے خاندانی بنے لیکن دو بڑے بھائی
جاہل ہی رہے' اور حیرت کی بات ہے کہ ایسے جید عالم کے
دو لڑکے علم سے قطعاً محروم رہے' سب سے چھوٹے بھائی مولوی
اشفاق علی جن کی عمر ان کے والد کے انتقال کے وقت بہت کم
تھی کلیتاً والد صاب قبلہ کی زیر تربیت انگریزی تعلیم حاصل کی
اور میٹرک تک پڑھا' جو اس زمانہ میں مسلمانوں میں خاصی
اچھی تعلیم سمجھی جاتی تھی اشفاق علی صاحب کو گورنمنٹ
اسکول ہی میں جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی' ملازمت

مل گئی کافی عرصہ تک وہ یہاں تعلیم دیتے رہے' اساتذہ اور طلبہ
دونوں میں وہ بہت ہر دل عزیز اور مقبول تھے' اسکول کے
اینگلو انڈین ہیڈ ماسٹر گارڈن کے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے'
دونوں کو شکار اور ہاکی کا شوق تھا اور ایک دوسرے کے ساتھی
تھے۔ بعد میں مولوی اشفاق علی صاحب قلعہ دہلی کے عجائب خانہ
میں کیوریٹر مقرر ہوکر دہلی چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار
کرلی۔

والد صاحب قبلہ' ایک مدت تک (کم و بیش پندرہ سولہ
سال) پھوپی صاحبہ کے ساتھ ہی رہے' بعد میں ہم سب لوگ
نانی صاحبہ کے مکان میں چلے آئے جو عرصہ سے نانا صاحب کے
انتقال کے بعد وہاں تنہا تھیں۔ یہ واقعہ میری پیدائش کے بعد
کا ہے' لیکن میں اتنا کم عمر تھا کہ مجھے پھوپی صاحبہ کے مکان
میں رہائش یا اس سلسلہ میں کوئی واقعہ یاد نہیں۔ مکان کے
مردانہ حصہ میں صحن کے شرقی جانب' لب سڑک جو صحنچی
تھی' وہ والد صاحب قبلہ کی نشستگاہ تھی اس کے دو دروازے صحن
میں اور ایک جنوبی جانب کے دالان میں کھلتا تھا' سڑک کی
طرف تین بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں' اس کو ہم سہ دری کہتے
تھے اور ہم لوگوں کا پڑھنا' لکھنا' اور اٹھنا بیٹھنا' سب اسی میں
ہوتا' بلکہ زیادہ وقت یہیں گذرتا۔

ملازمت سے برطرفی

میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا کہ والد صاحب قبلہ
کو اسکول کی ملازمت سے علیحدہ کردیا گیا' اسکول کی ملازمت

کے کوئی قواعد و ضوابط نہ تھے۔ ھیڈ ماسٹر کو وسیع اختیارات تھے
اور اس کے اوپر ایک امریکن پادری مطلق العنانی کی حیثیت
رکھتا تھا۔ اس وقت جب کہ والد صاحب کو نوٹس دیا گیا' اس
امریکی پادری کا نام جو برسراقتدار تھا کیملن تھا' یہ شخص زیادہ
عمر رسیدہ نہ تھا' لیکن بیمار تھا' شاید دق کا اثر اس پر تھا
کیونکہ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی' اور تھوڑے ھی عرصے بعد
وہ امریکہ واپس چلا گیا۔ میں نے اس کو قریب سے دیکھا تھا
کیونکہ وہ ھماری جماعت کو جغرافیہ پڑھاتا تھا اور اس مضمون
سے اس کو بےحد دلچسپی تھی' والد صاحب قبلہ کی برطرفی کا
سبب تو یہ بتلایا گیا تھا کہ ان کے پاس ٹریننگ کا سرٹیفکٹ
نہیں' لیکن یہ اس لئے سچ نہ تھا کہ اسکول میں زیادہ تعداد
اساتذہ کی ایسی تھی جو ٹریننگ کا کوئی سرٹیفکٹ وغیرہ نہیں
رکھتے تھے' بلکہ عیسائی اساتذہ میں تو ایسے بھی تھے جن کے
پاس کوئی سرٹیفیکٹ وغیرہ نہ تھا۔ اصل سبب یہ تھا کہ اسی
زمانہ میں ایک مسلمان شخص نے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا
بے روزگاری سے تنگ آکر عیسائی مذھب قبول کرلیا تھا' زیادہ
عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ سب مسلمانوں نے اس کو سمجھایا
اور اس کے روزگار کا بھی کچھ انتظام کیا چنانچہ وہ دوبارہ مسلمان
ھوگیا۔ اسکول کے منتظمین کا خیال تھا کہ جن لوگوں کی کوشش
سے وہ دوبارہ مسلمان ھوا تھا ان میں والد صاحب قبلہ بھی شامل
تھے۔ اس مسئلہ پر میں نے خود والد صاحب قبلہ سے کبھی کوئی
بات نہیں سنی لیکن بڑے بھائی صاحب محترم منتظمین اسکول کی
ناراضگی کا سبب یہ ھی بتلاتے تھے' اور یہ اس لئے صحیح ھوگا کہ

اس وقت سن شعور کو پہنچ چکے تھے' میں بہت چھوٹا تھا' مجھے
صرف اسقدر یاد ھے کہ ایک روز میری نقشہ کی کاپی دیکھتے وقت
اسکول کے امریکی پرنسپل مسٹر کیمنل نے جب میرے نام پر
غور کیا تو مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تم مولوی مجیب الحق
کے لڑکے ھو' میرے ھاں کہنے پروہ ایک لمحہ کے لئے سوچ میں
پڑ گیا' لیکن پھر اپنا کام کرنے لگا' وہ جلد ھی امریکہ واپس چلا گیا'
اس کا جانشین ھوکر مسٹر سمپسن ایک طویل القامت امریکی
پادری آیا' اس کی ڈاڑھی کافی دراز تھی اور اپنے عظیم چشمے اور
بڑی بڑی آنکھوں اور ڈاڑھی کی وجہ سے ایک بارعب بلکہ قدرے
خوف ناک سا انسان معلوم ھوتا تھا۔ اسکول اور بعض اساتذہ
وغیرہ کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

ریاض الدین عرف بابو

والد صاحب قبلہ پر ابتداء ھی سے تصوف کا گہرا اثر تھا'
چنانچہ عبادت و ریاضت کے علاوہ قدرت نے ان کو صبر و قناعت'
توکل اور رضا و تسلیم کی خصوصیات سے متصف کیا تھا۔ دنیوی
مشکلات سے ان کا استقلال اور شگفتہ مزاجی قطعاً متاثر نہ ھوتی
تھی چنانچہ ملازمت سے برطرفی کا کوئی خاص اثر ھم لوگوں نے
محسوس نہ کیا۔ یہ تو ظاھر ھے کہ ان کا ذریعہ معاش ملازمت ھی
تھی موروثی جائداد جو دو چھوٹے گاؤں پر مشتمل تھی' دادا صاحب
کی عدم موجودگی اور دادی صاحبہ کی شاہ خرچی کے نتیجہ میں
قرض کی ادائیگی کے باعث نیلام ھوچکی تھی ملازمت کے دوران
والد صاحب قبلہ نے کچھ دوکانیں' ایک مکان اور بالا خانہ خریدا

تھا' لیکن اس زمانہ میں اس کا کرایہ زیادہ نہ تھا۔ ان حالات کے
باوجود وہ نہایت مطمئن نظر آتے تھے' اس واقعہ کو زیادہ دن نہ
گذرے تھے کہ والد صاحب قبلہ کے ایک دوست اپنے ہمراہ ایک
صاحب کو لائے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا ایک بھتیجا' اسلامیہ
اسکول میں پڑھتا ہے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہے میں اس کی تعلیم
اور رہائش کے انتظام سے مطمئن نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اس
کو آپ اپنی سرپرستی میں لے لیں اور اپنے ہی مکان پر رکھ لیں'
چنانچہ یہ صاحبزادے جن کا نام ریاض الدین اور عرف بابو تھا
ہمارے مکان میں منتقل ہوگئے' ان کے تایا ملا بشیر الدین جو
ان کو لائے تھے بھوجپور[10] کے بڑے زمیندار تھے' ان کے تین بھائی
اور تھے' ایک ان سے بڑے اور دو ان سے چھوٹے۔ سب سے چھوٹے
بھائی شیخ حمید الدین میاں بابو کے والد تھے' تینوں چھوٹے
بھائیوں کی اولاد میں' جن کی جائیداد اور زمینداری کا کاروبار
مشترک تھا، صرف دو لڑکے تھے یعنی وہ اور ان کا چھوٹا بھائی'
چنانچہ تینوں بھائیوں کو، میاں بابو سے بہت محبت تھی' اور ان کی
بڑی خواہش تھی کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔ لیکن بد قسمتی سے
نہ وہ ذہین تھے اور نہ ہی ان کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ
تھا۔ چنانچہ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی کوشش کے باوجود وہ ہر
جماعت میں ایک دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد ہی پاس ہوتے اور
میٹرک کا امتحان پاس نہ کرسکے۔ ۱۹۲۲ میں ملاجی
(ملا بشیر الدین) کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوگئی' ایک
دختر بھی پیدا ہوگئی' لیکن ابھی جوان العمر ہی تھے کہ ایک
حادثہ میں ریل گاڑی سے گر کر ہلاک ہوگئے۔

ملاجی کو والد صاحب قبلہ سے بےحد عقیدت اور انسیت
ہوگئی' ان کی وجہ سے ہم سب بھائیوں سے بھی ان کو بےحد
تعلق خاطر تھا' وہ ہر ہفتہ' میں دو اور کبھی کبھی اپنے مقدمات
اور دیگر کاموں کے لئے شہر آتے اور ہمارے ہی مکان پر قیام
فرماتے۔ ان کی مہمان نوازی اور ہر قسم کا آرام پہنچانے میں کوئی
کسر اٹھا کر نہ رکھی جاتی' وہ ہم لوگوں کو اکثر اپنے گاؤں
لے جاتے، اس طرح گاؤں میں رہنے والوں کی زندگی اور اس کی نمایاں
خصوصیات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ مجھے وہاں چند دن
گذارنے کا بہت شوق تھا اور وہاں کی بہت سی باتیں نہایت
دلچسپ معلوم ہوئیں۔ کالج میں داخل ہوجانے کے بعد بھی جب
تعطیلات میں میرٹھ سے مرادآباد آتا تو بھوجپور ضرور جاتا تھا۔
یہی نہیں بلکہ میاں بابو کے ساتھ بعض دوسرے گاؤں میں بھی
جانے کا اتفاق ہوا مثلاً سہپور' جہاں ان کی نانیہال تھی۔ وہاں
کے رئیس ایک چودھری صاحب تھے' جن کی شخصیت کافی دلچسپ
تھی' انھوں نے انگریزی بالکل نہیں پڑھی تھی' لیکن ان کی ایک
(یعنی دوسری) بیوی ایک اینگلوانڈین خاتون تھی' میں نے ان کو
خود تو نہیں دیکھا' مگر ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کا ذکر
وہاں عام تھا۔ چودھری صاحب کو شیر کے شکار کا بےحد شوق تھا
اور کافی تعداد میں وہ شیر شکار کرچکے تھے' اسی سلسلہ میں صوبے
کے انگریز حکام سے ان کے تعلقات اچھے رہتے تھے' چنانچہ ان کو
خان بہادری کا جو اس زمانہ میں بہت اونچا خطاب سمجھا جاتا تھا ملا
ہوا تھا۔ چودھری صاحب کے چار لڑکے تھے' جن کے اسلامی ناموں
کے علاوہ، ان کی والدہ کے رکھے ہوئے انگریزی نام بھی تھے' ان میں

سے ایک صاحبزادے کا نام شیرل تھا، وہ میاں باہو کے ہم عمر
تھے اور دوست بھی تھے، ان کے ساتھ ایک دو مرتبہ میں بھی
شکار پرگیا، اور پہلی دفعہ اس کا کچھ اندازہ ہوا۔ چودھری صاحب
بہت بڑے رئیس تو نہ تھے، مگر ان کی کوٹھی اور رہنے سہنے کا
طریقہ بہت ٹھاٹھ کا تھا۔ چودھری صاحب سے بالکل مختلف اور ان
سے ایک بڑے رئیس کا ذکر بھی دلچسپ ہوگا۔ شیخ محمد شفیع،
رئیس سکرامپور تھے، یہ بہت بڑے زمیندار تھے، لیکن لباس اور
حلیہ سے ایک کم حیثیت اور معمولی شخص معلوم ہوتے تھے،
باہو کے خاندان سے ان کی قرابت تھی، ان کے ساتھ سکرامپور جانے
کا موقع ملا۔ شیخ صاحب کا مکان وسیع اور پختہ تھا اور شان
ریاست کے سامان موجود تھے لیکن پہلی مرتبہ ہاتھی کی سواری
کا تجربہ ہوا، ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے تو اس قدر بارش ہوئی
کہ تمام کھیتوں میں پانی کھڑا ہوگیا شیخ صاحب نے اپنا ہاتھی
بھیج دیا اور اسی پر ہم ان کے گھر تک گئے، یہ لوگ ہاتھی کی
سواری کے اتنے عادی تھے کہ انہوں نے اس کا ہودہ بھیجنا بھی
ضروری نہ سمجھا اور ہم صرف ایک گدے پر بیٹھے جو رسیوں سے
اس کی کمر پر کسا ہوا تھا، میں ابتدا میں ڈرتا رہا کہ شاید گرجاؤں گا،
لیکن بہرحال رسیاں پکڑ کر مضبوط بیٹھے رہے، شیخ محمد شفیع کے
صاحبزادے شیخ زین العابدین کی شادی، باہو کی ہمشیرہ سے ہوئی
تھی۔ اس کی وفات کے بعد باہو کے والد شیخ حمید الدین نے ان کی لڑکی
سلطانہ بیگم کی شادی ان کی مرضی کے خلاف زین العابدین سے ہی
کردی اس سے ان کو ناقابل برداشت صدمہ ہوا کیونکہ ان کے
صرف یہی ایک لڑکی تھی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد

ایک حادثہ میں باہو کا انتقال ہوگیا، ان کو اکثر دورہ پڑھتا تھا
جس سے وہ بیہوش ہوکر گرجاتے تھے، ایک روز ریل میں مرادآباد
آرہے تھے، ابھی گاڑی پلیٹ فارم پر نہ پہنچی کہ وہ دروازہ کھول کر
کھڑے ہوگئے بد قسمتی سے اسی وقت دورہ پڑا اور وہ گرکر
ہلاک ہوگئے، اس میں شک نہیں کہ مزاج میں ضد اور غصہ تھا،
لیکن بہت سی خوبیوں کے انسان تھے اور دوستوں کی خاطر ہر
قربانی اور ایثار کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، والد صاحب قبلہ
کو ان سے ایسی محبت تھی جیسی کہ اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور
ان کی وفات کا ان کو بےحد صدمہ ہوا۔

خانہ نشینی کی زندگی

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد، زندگی کا بقیہ حصہ یعنی کہ
کم و بیش پچیس سال کی مدت والد صاحب قبلہ نے حالت خانہ نشینی
ہی میں گذارے، اس زمانہ میں زیادہ عبادت ریاضت میں گزارتے،
لیکن کچھ سلسلہ گھر پر ہی درس و تدریس کا بھی جاری رہا
اپنے اور قریبی عزیزوں کے علاوہ بعض عقیدت مند شاگرد بھی اپنے
بچوں کو بھیج دیتے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ سلسلہ درس و تدریس
کم ہوتا گیا اور بالاخر ختم ہوگیا۔

اپنے والد اور پیر مرشد یعنی سید شاہ ظہورالحق صاحب رح سے
اجازت کے باوجود، والد صاحب لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے،
جو لوگ اس غرض سے آتے ان کو کسی دوسرے بزرگ کے پاس
بھیج دیتے، ان میں سے اکثر راقم الحروف کے تایازاد بھائی سید
سلطان الحق سے بیعت کرلیتے، چنانچہ ان کے مریدوں کا سلسلہ

خاصہ وسیع تھا' آخر عمر میں والد صاحب قبلہ نے ہم چاروں بھائیوں کو، خاندان کے چند اور افراد اور بہت اصرار کے بعد آٹھ دس لوگوں کو حلقہ ارادت میں لے لیا تھا۔ ان میں ایک صاحب قابل ذکر ہیں۔ حکیم مسیح الدین کی عمر بیعت کے وقت تقریباً پچھتر سال تھی' وہ تقریباً روزانہ بعد نماز عشاء والد صاحب کی خدمت میں تشریف لاتے تھے تندروستی اچھی تھی اور باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے' حقہ بے حد پیتے تھے' چنانچہ باوجود یکہ ہمارے خاندان میں کوئی حقہ نہیں پیتا تھا' حکیم صاحب کے لئے کچھ الٹا سیدھا انتظام کیا جاتا تھا' ایک شب اسی طرح حقہ پی رہے تھے کہ والد صاحب قلبہ نے جو دوسری چار پائی پر لیٹے ہوئے تسبیبی پڑھ رہے تھے فرمایا، حکیم صاحب ! آپ حقہ چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا۔ حکیم صاحب نے حقہ کی نے دوسری طرف کو پھیر کر کہا، بہت اچھا قبلہ، آج ساٹھ سال بعد اس کو چھوڑ دیا' اور پھر کبھی حقہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وفات

والد صاحب قبلہ کی تندرستی اچھی تھی اور وہ بہت کم علیل ہوتے تھے' لیکن آخر عمر میں گھٹنوں میں درد کی شکایت ہوگئی' اگرچہ علاج سے کم ہوجایا کرتی تھی لیکن یہ تکلیف آخر تک رہی' ۱۹۳۷ء میں علیگڈھ میں راقم الحروف نے اپنا مکان بنالیا' اس کے بعد ان سے درخواست کی کہ وہ بھی علیگڈھ آجائیں اور وہیں قیام فرمائیں اس وقت بڑے بھائی صاحب اور ان کی زوجہ محترمہ کے علاوہ خاندان کے سب افراد مع والدہ صاحبہ محترمہ' علیگڈھ

ہی میں تھے' چنانچہ بالاخر وہ بھی تیار ہوگئے وہ عمر کے آخری دوسال وہیں تشریف فرما رہے' ذیقعدہ کے شروع میں فالج کا دورہ پڑا جس سے زبان بھی متاثر تھی' چار پانچ زور کی علالت کے بعد ۷ تاریخ (دسمبر ۱۹۳۰) کو بعد مغرب انتقال فرمایا۔ وصیت کے مطابق ہم لوگ لاش کو دوسرے روز مرادآباد لائے اور شاہ ابراہیم صاحب رح کی درگاہ میں پر دادا صاحب شاہ عبدالحق صاحب رح کے پہلو میں سپرد خاک کیا۔

اوصاف اور حصائل

عبادات اور دنیوی معاملات دونوں میں والد صاحب قبلہ، شرعی احکام کی پابندی کرتے اور شعائر اسلامی کو قائم رکھتے' مثلاً ایسا متعدد مرتبہ ہوا کہ بعض اقرباء و احباب اپنی جائیداد یا مملوکہ اشیاء کو رہن رکھ کر قرض لینا چاہتے تھے' وہ اس کو منع کردیتے تھے اور ہمیں بتلایا کہ یہ سود کی ایک شکل ہے۔ اس لئے میں جائز نہیں سمجھتا اگرچہ خود ان کی اپنی مالی حالت بہت زیادہ بہتر نہ تھی' لیکن پھر بھی اگر کسی عزیز یا جاننے والے کی مدد ممکن ہوتی تو کردیتے' ان کے ایک دوست کہ جس کا نام محمد احمد تھا اور وہ ہمارے مکان کے سامنے ہی رہتے تھے' ایک موقع پر اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ان کو روپیہ کی ضرورت پڑی تو وہ کہنے لگے' مولوی صاحب جو کچھ رقم آپ کے پاس ہو اس وقت مجھے دیدیجئے' بے حد ضرورت ہے' والد صاحب کے پاس پانچ سو روپیہ تھے' فوراً وہ ان کو دے دئے بغیر کسی تحریر کے۔ اس سے پہلے کہ وہ روپیہ واپس کرتے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے

بھائی غلام احمد نے جو کاروبار میں ان کے جانشین ہوئے روپیہ کی واپسی میں ٹال مٹول کا سلسلہ شروع کردیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نیت خراب ہوگئی ہے' لیکن اتفاق سے ایک موقع پر والد صاحب کے ایک دوست ہندو شاگرد جو ڈسٹرکٹ جج تھے گھر پر آئے' وہاں غلام احمد بھی آگئے' جج گوبند سروپ نے (جن کو والد صاحب ان کے گھریلو نام چندا سے پکا تے تھے) غلام احمد سے کہا کہ آپ مولوی صاحب کے پانچ سو روپیہ کیوں ادا نہیں کرتے انھوں نے جواب دیا ہاں میں ضرور ادا کروں گا ۔ یہ قرضہ میرے ذمہ ہے اور واجب الادا ہیں ۔ بعد میں یہ قضیہ عدالت تک گیا اور مقدمہ کے دوران' گوبند سروپ نے گواہی دی' چنانچہ وہ رقم عدالت نے واپس کرادی۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل وعیال کی ضروریات زندگی اور ہم لوگوں کی تعلیم وغیرہ کے لئے وسائل مہیا کرنے کی کوشش میں مصروف رہنے کے باوجود ان کی طبعیت میں استغنیٰ بے حد درجہ تھا' ان کے طرز زندگی کا جائیزہ لیتے ہوئے اب یہ خیال ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ کی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہ تھی ۔ چونکہ اس کا حاصل کرنا زندگی کے لئے ضروری تھا اس لئے انھوں نے ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا تھا اور پرائویٹ ٹیوشن بھی کرتے تھے' مگر ایسے ذرایع پر کبھی غور بھی نہیں کیا جس سے ذاتی وقار کو ٹھیس لگنے کا خطرہ ہوسکتا تھا یا جو عبادت و ریاضت اور دیگر معملات میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرتے ۔

ہمارے رہائشی مکان سے تھوڑے ہی فاصلہ پر چند دوکانیں' ایک مکان اور ایک بالاخانہ تھا' یہ سب کرایہ پر اٹھے رہتے تھے

لیکن ان کا کرایہ پابندی سے وصول نہیں ہوتا تھا بلکہ اکثر معاف ہی کردیا جاتا تھا' تحریری کرایہ ناموں یا رسیدوں وغیرہ کا شاید والد صاحب مرحوم کو خیال بھی نہ آتا تھا' ہاں' مدت تک میری طالب علمی کے زمانہ میں بالاخانہ پر ہیوٹ مسلم اسکول کے ایک استاد مسٹر عبدالحامد خان رہے' وہ پابندی سے کرایہ ادا کرتے تھے۔[11]

شگفتہ مزاجی' والد صاحب قبلہ کی ایک نمایاں خصوصیت تھی لوگوں سے گفتگو کرتے وقت' متانت اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے ان کا سرخ سفید چہرہ' اکثر قدرے متبسم رہتا جس سے ان کی گفتگو میں دلکشی کا اضافہ ہوجاتا ۔ سب سے زیادہ غصہ ان کو شاگردوں پر جن میں ہم سب بھائی بھی شامل تھے اس وقت آتا جب پڑھنے کے معاملے میں وہ کسی غلطی یا قصور کے مرتکب ہوتے۔ اس وقت وہ سزا دینے میں اس زمانہ کے رواج کے مطابق بیت بھی استعمال کرتے۔ اسکولوں کے کمروں میں اس زمانہ میں ہر استاد کی الماری میں کئی کئی بیت رکھے رہتے تھے۔ لیکن ان شاگردوں کے ساتھ جو اپنا کام صحیح طریقہ پر کرتے وہ انتہائی شفقت سے پیش آتے۔

بہرحال اسکول میں لڑکے یہی سمجھتے تھے کہ مولوی صاحب کا مزاج بہت سخت ہے' بعد میں رفیق القلبی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ' شاگردوں کے ساتھ رویہ میں بہت فرق آگیا تھا اور غصہ بھی نہیں آتا تھا ۔

باب سوم

میرٹھ شہر

میرٹھ، شمالی برصغیر (موجودہ اتر پردیش، بھارت) کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ بعض دیگر مقامات کی طرح اس کی ابتدائی تاریخ بھی پردہ خفا ہی میں ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا روایتی ماخذ کی بنیاد پر یہ کہا گیا ہے کہ مہابھارت کے زمانہ میں یہ علاقہ آریائی تہذیب کے دائرے میں شامل تھا۔ یہ امر قابل افسوس ہے، کہ آریاؤں نے متعدد علوم میں ترقی کی لیکن تاریخ کی طرف ان کا ذہن راغب نہ ہوا چنانچہ زمانہ مابعد کے محققین نے ہمعصر یا تحریری سے مواد کی عدم موجودگی میں جو مواد قدیم عہد کی تاریخ اور تمدن سے متعلق جمع کیا ہے وہ ناکافی ہی نہیں بلکہ مختلف وجوہات کی بنا، پر اس کا بہت بڑا حصہ نا قابل اعتبار ہے اور مستند بھی نہیں ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ میرٹھ ایک قدیم شہر ہے، تاریخ میں اس کا ذکر موریا حکمران اشوک کے کتبے کے سلسلہ میں ملتا ہے جس کو سلطان فیروز شاہ تغلق نے دھلی لےجا کر اپنی شکار گاہ کے قریب نصب کرایا تھا، اور جو تا حال وھاں موجود ہے۔

اسلامی عہد میں سب سے پہلے سپہ سالار محمود کی فتح کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں کے سردار ان کے نام سے ایسے خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے بغیر مقابلہ کئے ہوئے ان کی اطاعت قبول کرلی۔[1] فرشتہ کے بیان کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۱۰۱۷ء میں حملہ کیا، راجہ ھردت نے ایک کثیر رقم پیش کر کے سلطان

سے صلح کرلی، بارھویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے سنہ ۱۱۹۱ء میں میرٹھ کے مضبوط قلعہ کو فتح کر کے اپنا کوتوال مقرر کیا، اور ایک مسجد بھی بنائی، بعد میں یہ علاقہ غیاث الدین بلبن کو جاگیر میں مل گیا، امیر تیمور نے سنہ ۱۳۹۹ء میں حملہ کر کے اس مقام کو فتح کیا، یہ ظاھر ہے کے دھلی کے قریب ہونے کی وجہ سے میرٹھ کو صوبائی دارالحکومت یا درجہ اول کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی اور مسلمانوں کے دور حکمرانی میں اس کو نمایاں مقام حاصل نہیں ہوا، برطانوی اقتدار کے دوران اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی، کیونکہ شمالی برصغیر کی عظیم ترین چھاونیوں میں سے ایک یہاں قائم کی گئی، یہ سب جانتے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی حربی تاریخ کی ابتدا، ۱۰ مئی کو یہیں سے ہوئی[2] مختصراً اس صدی کے ربع اول میں میرٹھ، یوپی کی ایک ڈویژن کا مرکز اور ایک اہم شہر تھا۔

یہ شہر تھا جہاں مجھے اپائی وطن مرادآباد سے پہلی مرتبہ باھر رہنے کا پہلا اتفاق ہوا جہاں کالج کی تعلیم اور اس سلسلہ میں چھہ سال تک قیام سے کچھ حالات کا ذکر کرنے سے پہلے ھائی اسکول کی تعلیم اور آخری امتحان کے سلسلہ میں چند امور قبل ذکر ہیں۔

اسکول میں سلسلہ تعلیم کا اختتام

یورپی اور بعض امریکی عیسائی مشینری اداروں نے مغربی طرز کی تعلیم کے مدارس، اٹھارویں صدی ھی میں قائم کرنا شروع کردئے تھے، انسویں صدی میں یہ سلسلہ بہت وسیع ہوگیا چنانچہ

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں برصغیر میں شاید ہی کوئی شہر
ایسا ہو جہاں مشن اسکول موجود نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ
اس تعلیم کا اولین مقصد عیسایت کی تبلیغ ہی تھا اور اسی بناء پر
ان لوگوں نے مغربی تہذیب، و تعلیم اور عیسایت کو اس طرح
ایک دوسرے سے ملحق کردیا تھا کہ وہ لازم و ملزوم معلوم
ہونے لگے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد پژ مردگی اور بے چارگی کا
جو ماحول پیدا ہوگیا تھا اس سے بھی پادریوں نے خوب فائدہ
اٹھایا اور لاتعداد ہندوستانی خاندانوں کو عیسائی بنالیا۔ ان کے
مشن اسکول اور کالج، تعلیم کی اشاعت میں ایک نمایاں کردار
ادا کرتے تھے۔ بشپ پارکر میموریل ہائی اسکول جو بعد میں
پارکر ہائی اسکول ہوگیا، شہر کے وسط میں ایک گرجا کی عمارت
میں واقع تھا، میری بلکہ ہمارے خاندان کے کئی افراد کی تعلیم
اسی اسکول میں مکمل ہوئی۔ جب میں نویں جماعت میں پہنچا،
تو اس تکلیف دہ "راز" کا انکشاف ہوا کہ میری عمر دو سال کم
ہے اور میں سنہ ۱۹۱۷ء کی بجائے سنہ ۱۹۱۹ء میں امتحان دے
سکوں گا۔ چنانچہ عمر بڑھوانے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کامیابی
بعد از دقت ہوئی یعنی سنہ ۱۹۱۷ء کے امتحان کا زمانہ نکل چکا[30] تھا۔
اب میں سنہ ۱۹۱۸ء کے امتحان میں شریک ہوا مگر عمر تین سال
زیادہ ہوگئی، اور اسطرح "اٹھارہ" سال کی عمر میں امتحان دیا،
حالانکہ صحیح عمر پندرہ ہی سال تھی۔ اس زمانہ میں امتحانات
کا معیار بہت بلند تھا، اکثر اسکولوں کے نتائج بہت خراب ہوتے
تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کم از کم ایک سال ہمارے اسکول کا
ایک طالب علم بھی کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ ان حالات میں سکنڈ

ڈویژن میں کامیاب ہونا اچھی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ میں نے
بھی ڈویژن حاصل کیا چنانچہ اسی وقت سے خاندان میں مجھے وقار
حاصل ہوگیا، اور سب کی رائے تھی مجھے کسی کالج میں داخل
ہونا چاہئے۔

میرٹھ کالج

اس دور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہایت
محدود تھے، باوجود یکہ یو پی کا صوبہ بڑے صوبوں میں شمار کیا
جاتا تھا، یہاں چند ہی کالج تھے، جن کو ہاتھ کی انگلیوں پر گنا
جاسکتا تھا، اس حالت زار کا احساس اس وقت ہوا جب سنہ ۱۹۱۸ء
کے وسط میں میٹرک (یعنی ایس ایل سی) کا نتیجہ شایع ہونے پر،
میرے کالج میں داخل ہونے کا مسئلہ سامنے آیا کیونکہ مرادآباد
میں کالج نہ تھا اور اعلیٰ تعلم کے لئے باہر جانا ضروری تھا،[31]
مرادآباد سے دو کالج قریب تھے، ایک بریلی میں دوسرا میرٹھ اور
ان ہی پر نظر پڑتی تھی لیکن والد صاحب رح کے سامنے باہر
بھیج کر تعلیم دلوانے کے اخراجات کا مسئلہ خاصا تکلیف دہ تھا،
حضرت کی ملازمت اسکول سے سبکدوشی کے بعد تنگدستی ہی کی
کیفیت تھی، اگرچہ پریشانی میں اس لئے بہت کمی ہوگئی تھی
گے والد صاحب قبلہ کے ایک دوست نے چند سال پیشتر بھوجپور
(مرادآباد شہر سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں) کے زمیندار
کے صاحبزادے مسمی ریاض الدین عرف بابو، کو بطور پے انگ گیسٹ
(paying guest) ہمارے گھر رکھوا دیا تھا، یہ میری ہم عمر تھے
چنانچہ وہ ہم سب میں گھل مل کر رہنے لگے، شاید ہماری

مشکلات کے پیش نظر میاں باہو کے تایا ملا بشیرالدین نے جو
مقدمات کے سلسلہ اکثر مرادآباد آتے تھے اور ہمارے ہی مکان پر
قیام کرتے تھے یہ انتظام کیا کہ عزیزم باہو کے اخراجات نقد ادا
کرنے کے بجائے اجناس خاصی مقدار میں بھجوا دیتے تھے، شاید
اس میں ان کو بھی سہولت تھی اور ہمارے لئے تو یہ ایک نعمت
غیر مترقبہ تھی، قبلہ عالم کا توکل تو بزرگان سلف جیسا تھا۔ مجھے
یاد نہیں کہ میں نے انتہائی پریشانی کے دنوں میں بھی کبھی
ان کے چہرہ مبارک پر فکر کے اثار دیکھے ہوں، لیکن حیرت یہ ہے
کہ ان کی تربیت کے زیر اثر ہم بھائیوں میں بھی، بالخصوص برادر
محترم سید احسان الحق مرحوم میں قناعت کی صفت لاشعوری طور
پر پیدا ہوچکی تھی بہر حال میری روزانہ بڑھتی ہوئی خواہش یہی
تھی کے میں کالج میں داخل ہوکر اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اور
ظاھری اسباب کے پیش نظر اس کی تکمیل ناممکن العمل معلوم
ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں میں مختلف کالجوں کو خطوط بھیج کر
وہاں کے پراسپکٹس منگواتا اور مطالعہ کرتا رہتا تھا، میرٹھ کالج
کے ایک گریجویٹ سے بھی ملاقات کی اور بورڈنگ ھاؤس کے
حالات وغیرہ کے متعلق ان سے مفید معلومات ملیں۔

اتفاق سے ان ہی دنوں میں والد صاحب قبلہ رح کے ایک
دوست، سیف اللہ خان تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر انہوں
نے قیام کیا، وہ مرادآباد کے ایک صوفی بزرگ صوفی حسین شاہ
صاحب رح کے ان مریدوں میں سے ایک تھے جن کو انہوں نے
انتہائی آوارگی اور رہزنی کی زندگی سے ہٹا کر اپنے حلقہ ارادت میں
داخل کرلیا تھا، ان لوگوں کے اخلاق و کردار قطعی طور پر بدل

چکے تھے، اب وہ مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، اور صوم
و صلواۃ کے پابند تھے، سیف اللہ خان جن کی عمر اس وقت ساٹھ سال
کے قریب ہوگی ناخواندہ تھے،[2] مگر دنیوی امور میں وسیع تجربہ
رکھتے تھے۔ اور خاندان چشتیہ کے بزرگوں کے مزارات پر حاضری
کی وجہ سے ان کے ملاقاتیوں اور شناساؤں کا دائرہ نہایت وسیع
تھا، انہوں نے کہا کہ میرٹھ کے مشہور رئیس بھیا شیخ بشیر الدین،
تعلیمی معاملات میں دلچسپی رکھتے ھیں اور کالج کی انتظامیہ میں
بھی شامل ھیں۔ وہ ان کو خط لکھیں گے اور پھر میرے داخلے
وغیرہ میں کوئی الجھن نہ ہوگی، چنانچہ ان کے ایک دوست
منشی رضی الدین نے ان کی طرف سے ایک خط لکھا۔ منشی صاحب
کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔ چنانچھ یہ خوشنما خط لے کر والد صاحب
قبلہ رح اور والدہ مرحومہ کی برکتوں اور دعاوں کے ساتھ میں
مرادآباد سے میرٹھ کے لئے روانہ ہوگیا۔ مجھے یاد ھے کہ والدہ
مرحومہ کی آنکھوں میں میری روانگی کے وقت آنسو تھے، جن کی
وجہ اس وقت میری سمجھ میں نہین آتی تھی کیونکہ میں انتہائی
خوش تھا، سیف اللہ خاں صاحب نے ایک تعارفی خط اپنے ایک
دوست مسمیٰ امیر بخش کو بھی دیا، ان کی عطر کی دوکان کمبوہ
دروازہ سے ملحق بازار میں تھی۔ چنانچہ میں اسٹیشن سے تانگہ
کر کے سیدھا ان ھی کی دوکان پر پہنچا، اگرچہ میں نے اس سے
پہلے کبھی تنہا سفر نہیں کیا تھا لیکن کالج میں داخلہ کی خوشی
کے جذبے نے پردیس میں مشکلات کے خیال پر غلبہ پالیا تھا اور
مجھے کسی قسم کی پریشانی یا دقت کا وھم و گمان بھی نہ ھوتا
تھا، امیر بخش صاحب نہایت شریف النفس اور مخلص مسلمان تھے،

ان کی دوکان بہت مختصر تھی لیکن وہ قناعت کی دولت سے مالامال
تھے' انھوں نے سیف اللہ خان کا خط پڑھ کر بڑے تپاک سے مجھے
خوش آمدید کہا اور دوکان پر ہی بٹھلا لیا' اور فرمایا کہ شام
ہو گئی ہے' شب کو میں ان ہی کے مکان پر قیام کروں، دوسرے
روز وہ مجھ کو بھیاجی کی خدمت میں لے جائیں گے ان کے مکان میں
مردانہ نشست کے لئے کوئی کمرہ وغیرہ نہ تھا، لیکن بیرونی اور
اندرونی دروازے کے درمیان ایک نہایت چھوٹا سا کمرہ تھا'
دروازہ کے سامنے ایک مسجد تھی' دونوں کے درمیان کچھ افتادہ
زمین تھی' یہی ان کی غیر مسقف نشستگاہ تھی۔

بھیا خاندان کی تفصیل

بھیا خاندان کے سب سے بڑے بزرگ شیخ الٰہی بخش تھے ان کے
چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم کے بیٹے بھیا شیخ وحیدالدین اور
بھیا شیخ بشیرالدین تھے چھوٹے بھائی جس طرح بڑے بھائی کی
عزت کرتے تھے' اس کی مثال میری نظر سے نہیں گذری اور نہ
کوئی شخص جس نے آنکھ سے ان کو نہ دیکھا ہو اس کا اندازہ
لگاسکتا ہے۔ میرٹھ اور دہلی کے درمیانی علاقہ میں کثیرالتعداد
میں اس خاندان کے دیہات تھے۔ اس دور کے رئیس زادوں کی
طرح شیخ بشیرالدین اور ان کے بڑے بھائی شیخ وحیدالدین کی
تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ اول الذکر' عربی اور فارسی میں نہایت
قابل تھے اور انگریزی کی بھی استعداد رکھتے تھے نہایت
ذکی الفہم اور بےحد ذہین تھے' چشم آشوبی کی وجہ سے مطالعہ
ترک کردیا تھا لیکن حافظہ بہت اچھا تھا اور خاص طور پر

علمی اور دینی مسائل پر نہایت دلکش انداز میں گفتگو کرتے
تھے قرانی آیات۔ احادیث اور اشعار پڑھتے تھے' انداز گفتگو کے
ساتھ خیالات پاکیزہ اور سلجھے ہوئے ہوتے تھے۔ چونکہ تعلیم و
تربیت قدیم طرز پر ہوئی تھی' ان کا پورا کردار اور لباس قدیم
اسلامی تہذیب کا مظہر تھا' آداب نشست و برخاست' پاس حفظ
مراتب اور چھوٹے اور بڑوں کے ساتھ برتاؤ میں مکمل طور پر یہی
رنگ نمایاں تھا' بڑے بھی اگر سامنے سے گذر جاتے تو فوراً کھڑے
ہوکر سلام کرتے اور اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک وہ نظر
کے سامنے رہتے۔ اس خاندان کے سب افراد کا لباس تقریباً یکساں
ہوتا تھا' سفید انگرکھا اور اس پر نیم آستین کی صدری' جس کے
کناروں پر بیل ڈکی ہوتی تھی۔ شیخ بشیرالدین مرحوم موسم سرما
میں گاہ بہ گاہ شیروانی بھی استعمال کرتے تھے۔ اکثر زمین پر
فرش پر بیٹھتے تھے اگرچہ بعض کمروں میں کرسیاں اور میزیں
بھی تھیں۔

دوسرے روز بعد نماز عصر ان کے ہمراہ میں بھیاجی کی
خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اور ان کے بڑے بھائی بھیا شیخ
وحیدالدین میرٹھ کے رؤساء اعظم میں سے تھے۔ اپنی وسعت اخلاق
شرافت، وضعداری اور منکسرالمزاجی کی وجہ سے دونوں بھائیوں
کو صرف میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ ہر اس جگہ اور اس حلقہ میں
جہاں ان کا کسی نوعیت سے تعلق تھا' ان کو عزت و احترام کی
نظر سے دیکھا جاتا تھا' ان کی رہائش گاہ جو متعدد مکانات کا
ایک مجموعہ تھی اور جس کو وہاں کے لوگ بھیاجی کی کوٹھی
کہتے تھے' جو لال کرتی یعنی میرٹھ چھاؤنی کے انفنٹری بازار میں

واقع تھی سادہ اور قدیم وضع کی عمارت تھی، جس کو دیکھنے
سے معلوم ہوتا تھا کے وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت اسطرح اضافے ہوتے
رہے ہیں کہ اس کو کسی مخصوص طرز کی عمارت نہیں کہا
جاسکتا تھا، اس کے غربی اور جنوبی دروازوں کے درمیان ایک
عام گذرگاہ کے طرز کا راستہ تھا، جس پر تقریباً ہر وقت آمد و رفت
کا سلسلہ جاری رہتا تھا، عمارت قدیم طرز کی ہی تھی جس کی
سب سے زیادہ بلند اور طویل دیوار شاہ راہ عام کے کنارے پر تھی،
اس سے کچھ فاصلے پر مہمان خانہ تھا، یہ بھی ایک وسیع اور
انیسویں طرز کا بنگلہ تھا اور اس سڑک پر واقع تھا جو شہر اور
چھاؤنی کے درمیان حد فاصل تھی اور باونڈری روڈ کہلاتی تھی،
بنگلہ کے احاطے میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی، اس کے
مقابل اس سڑک کے دوسرے کنارے پر یعنی شہر کی جانب
میرٹھ کالج کی عمارت، بورڈنگ ھاؤس اور اساتذہ کے رہائشی مکانات
اور کھیل کے میدان تھے، چند روز مہمان کی حیثیت سے میں نے اسی
بنگلہ میں قیام کیا۔

سیف اللہ خان کا خط پڑھ کر بھیا بشیر الدین نے جن کی وجاہت
اور ذہانت کا ہر مخاطب پر اثر ہوتا تھا، فرمایا کہ خان صاحب
نے خط کسی دوسرے شخص سے لکھوایا ہوگا کیونکہ وہ خود تو
ناخواندہ ہیں، مین نے کہا یہ درست ہے۔ پھر کہا کے داخلوں کا
سلسلہ کافی دنوں سے جاری ہے اور مسلم ہوسٹل میں اب جگہ
نہیں۔ کسی وظیفہ کی امید نہیں دلائی جاسکتی۔ اس کا بھی
فیصلہ ہوچکا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے
ہوسٹل کی عمارت اسی خاندان کے عطیہ سے تعمیر ہوئی تھی اور

بھیا بشیر الدین کے والد حافظ عبدالکریم مرحوم کے نام پر ھی اس
عمارت کا نام رکھا گیا تھا، اس کے کمروں کا جو کرایہ وصول
ہوتا وہ ضرورت مند مسلم طلبہ کو وظائف کی شکل میں دیا جاتا
تھا، اور ان وظائف کا فیصلہ بھیاجی ھی کرتے تھے، ان کا یہ فرمانا
کہ اب تمام فیصلے کئے جاچکے ھیں حوصلہ شکن تھا، بہر حال میں
خاموش ھی رہا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کے اس پر اپنے
ردعمل کا اظہار کن الفاظ میں کروں، چنانچہ میں خاموش ھی رہا۔
میری مایوسی کا اندازہ ان کو جلد ھی ھوگیا، تھوڑی دیر بعد
انہوں نے خود ھی کہا کہ اچھا، اگر آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کا مصمم ارادہ کرلیاھے تو انشا اللہ کوئی صورت پیدا ھوھی
جائے گی، دوسرے یا تیسرے روز ھی انہوں نے کالج کے فارسی کے
استاد مولانا گرامی کو بلا کر ذکر کیا کہ کالج مین داخلہ اور
رہائش کی کوئی صورت نکالی جائے۔ مولانا گرامی فارسی و عربی
کی قابلیت اور شاعری کے علاوہ اپنے بلند کردار کی بدولت
شہر کے مسلمانوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے
تھے، وہ انتہائی سادہ مزاج اور شریف النفس انسان تھے اور
ہر شخص کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے،
ان کی شفقت اور مہربانی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا، ان سے
دو ایک مرتبہ ملنے پر ھی کچھ ایسا محسوس ھونے لگا کہ میں
ان کے قریبی عزیزوں میں شامل ھوں۔ پردیس میں ایک ایسے
مہربان اور ہمدرد سرپرست کامل جانا بہت بڑی نعمت تھی، کالج
میں، میں دیکھتا تھا کہ مولانا کو ہر وقت مسم طلبہ گھیرے رہتے
تھے، اور وہ ہندونصائیح کے علاوہ ان کی مختلف کاموں میں مدد

کرتے رہتے تھے۔

بہرحال چند روز بعد، مولانا نے مجھے بتلایا کے مسئلہ کا حل نکل آیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ موضع دھولڑہ کے زمیندار کا لڑکا جو اسکول میں پڑھتا ہے تنہا مکان میں دو ملازموں کے ساتھ رہتا ہے اس کو ایک ایسے اتالیق کی ضرورت ہے جو اس کے ساتھ اسی مکان میں رہے، میں نے اس کے والد سے آپ کے لئے طے کرلیا ہے۔ وہاں کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی نہ ہوگی، انھوں نے بتلایا کہ داخلہ کا مسئلہ بھی کالج کے ہیڈ کلرک دھیان چند کی مدد سے طے ہوگیا ہے۔ بعد میں تجربہ سے اندازہ ہوا کہ دھیان چند انگریز پرنسپل مسٹر ولیم کے بہت منہ چڑھے تھے، اور طلبہ پروفیسروں کی طرح ہی ان کی عزت کرتے تھے، چنانچہ دوسرے ہی روز میں نے کالج پہنچ کر داخلہ لے لیا، اور دو روز بعد مولانا کے ہمراہ میں نے اپنے وارڈ کے مکان میں آ گیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ صاحبزادے چھٹی یا ساتویں جماعت کے طالب علم تھے، لیکن عمر میں مجھسے ایک یا دو سال زیادہ ہی ہوں گے، ان میں متعدد کمزوریوں کے ساتھ یہ خوبی ضرور تھی کہ جب تک میں وہاں رہا، وہ میرا احترام تو کیا، لحاظ کرتے رہے، پڑھنے لکھنے سے تو قطعاً لگاؤ نہ تھا اور جلدھی مجھے اندازہ ہوگیا کے یہ جگہ مناسب نہیں۔ دو ایک مرتبہ زمیندار صاحب جن کا نام غالباً عبدالمجید تھا خود بھی آئے، ان کے چہرے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان ہی زمینداروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کاشتکاروں کو مارتے پیٹتے اور گالیاں دیتے رہتے ہیں اور اپنی گفتگو میں بھی گالیوں کے استعمال میں کنجوسی نہیں

کرتے۔ ایک مرتبہ وہ آئے ہوئے تھے کے جب سہ پہر کو میں کالج سے واپس آیا تو دیکھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ زمیندار صاحب بیٹے کو برا بھلا کہہ رہے تھے، لگاتار گالیاں دے رہے تھے اور بالاخر اپنی جوتی لے کر اس کو مارنا شروع کیا۔ میں کچھ نہیں سمجھا کہ کیا ماجرا ہے، بعد میں ان کے ملازم سے جو منشی بھی تھا اور خرچ کا حساب بھی رکھتا تھا اور ساتھ ہی جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، یہ راز معلوم ہوا کے صاحبزادہ نامدار کا کسی طوائف سے تعلق ہوگیا تھا، میں جب اپنے کمرے میں سوجاتا تھا تو وہ اس کے گھر شہر تشریف لے جاتے تھے، منشی صاحب اس کی خبر ان کے والد کو پہنچاتے رہتے۔ پہلے انھوں نے تنبیہ تہدید سے کام لیا، مگر جب متواتر کوششوں کے باوجود ناکام رہے تو جوتا کاری کی مدد سے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی، برحال میں اس واقعہ سے سہم گیا اور دوسرے ہی روز میں نے مولانا گرامی سے کہا کے خدا کے واسطے مجھے اس جیل‌خانہ سے خلاصی دلوائیے ورنہ خطرہ ہے کہ زمیندار صاحب کو مجھ پر ھی غصہ نہ آجائے اور وہ بےقابو ہوجائیں، مولانا نے فوراً اس مشکل کا اندازہ لگالیا اور بھیا بشیرالدین سے مل کر یہ طے کرلیا کہ وہ اس بنگلہ کے اوپر کے حصہ میں جس کا ذکر میں کرچکا ہوں ایک کمرہ مجھے بھی دےدیں، دو کمروں میں دو اور طالب علم بھی رہتے تھے، ایک اسکول میں پڑھتے تھے، ان کا نام محی الدین احمد خان تھا، وہ نواب صاحب جھجھر کے جن کو ۱۸۵۷ کے انقلاب میں شرکت کی وجہ سے پھانسی دی گئی تھی، پوتے تھے، دوسرے محمد اسحاق صاحب تھے جو تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے۔ مولانا نے یہ کہہ کر کہ بازار

میں کھانے کے انتظام میں دقت ہے قریب ہی ایک صاحب کے بچوں
کو پڑھانے کے لئے کہا اور طے کرلیا کہ میں کھانا بھی وہیں
کھالیا کروں۔ یہ دوسرا تجربہ تھا، ان کے دو بچے اور دو بھتیجے
تھے، جن میں سے تین کو پڑھنے سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، سب سے
چھوٹے کا نام سعید الدین تھا اور عرفیت صالحین۔ انھوں نے اعلیٰ
تعلیم حاصل کی اور جرمنی سے ڈاکٹریٹ لینے کے بعد اپنا نام ڈاکٹر
صالح رکھ لیا، ایک جرمن بیوی کے ساتھ سواجر بازار میں رہتے تھے،
بعد میں پہلی بیوی کی طرح اس سے بھی علیحدگی ہوگئی، اگرچہ
لڑکا ان ہی کے پاس رہا۔ انھوں نے مدت تک دو اسکول چلائے۔
ایک پی ای سی ایچ میں Cox اسکول جو اب تک موجود ہے اور
قومیالیا گیا ہے، یہ ہماری قیام گاہ سے قریب ہی ہے۔ دوسرا جرمن
ماڈل اسکول، سولجر بازار میں ہے۔

بھیا شیخ بشیرالدین

اس انتظام سے مجھے سکون حاصل ہوا۔ رہائش گاہ، کالج سے
نزدیک اور مسلم ہوسٹل سے چند گز کے فاصلہ پر تھی، حقیقت یہ
ہے کہ اب میں یہ محسوس کرتا تھا کہ صحیح معنی میں کالج کا
طالب علم ہوں اور پڑھائی کی طرف بھی زیادہ توجہ دینا ممکن
ہوگیا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام سہولتوں سے زیادہ
بھیاجی مرحوم کا شرف صحبت تھا، انھوں نے مشرقی اور دینی طرز
کی تعلیم حاصل کی تھی، عربی فارسی میں بہت مہارت تھی، نہایت
خوشگفتار تھے اور اپنی گفتگو میں اکثر اشعار پڑھتے تھے۔ خوش
اخلاق، وسیع القلب اور علم دوست ہونے کے علاوہ ان روساء میں

تھے جو غربا پروری اور انسانی ہمدردی کے لئے صرف اپنے شہر ہی
میں نہیں بلکہ ہر اس حلقہ میں جس سے ان کا کسی قسم کا تعلق
تھا، مشہور تھے۔ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اور صوم وصلوٰۃ کے
پابند، بزرگان دین سے بے حد عقیدت تھی، علماء اور مشائخ کا بہت
احترام کرتے تھے، ہفتہ میں دو تین مرتبہ میں ان کی خدمت میں
حاضر ہوتا تو روک لیتے اور کافی دیر تک ان کی لطیف اور عمدہ
گفتگو سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا، چند ہی ماہ میں، میں خود
میں ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
گویا اب میں نے ایک نئی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ ایک خاص
بات قابل ذکر کہ بھیاجی ابتدائی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب رح چشتی صابری سے بیعت ہوئے تھے، حاجی صاحب قبلہ
انیسویں صدی میں اس سلسلہ کے ایک عظیم بزرگ تھے۔ ان کی
عظمت و شان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے حلقہ
ارادت میں اس دور کے متعدد علماء شامل تھے۔ جنھوں نے بعد
میں بہت زیادہ شہرت پائی اور ان میں سے بعض نے مدرسہ دیوبند
کی بنیاد رکھ کر اپنے ناموں کو زندہ جاوید کردیا۔ مثال کے طور پر
مولوی رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا
محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی کے نام
پیش کئے جاسکتے ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور جنگ آزادی
میں جن مشائخ نے عملی طور پر حصہ لیا ان میں حاجی صاحب رح
نام نامی بھی سرفہرست ہے۔ آپ نے اپنے مریدین اور معتقدین کو
جہاد کی صرف تلقین ہی نہیں کی بلکہ ایک باقاعدہ دستہ قائم کر کے
برطانوی فوج کے خلاف شاملی کے مقام پر ایک جنگ بھی لڑی[1]

جنگ آزادی میں انقلابیوں کی ناکامی کے بعد حاجی صاحب رح بھی بعض دوسرے مجاهدین کی طرح برصغیر سے هجرت کر کے حجاز تشریف لے گئے' اسی وجه سے اکثر ان کے نام نامی کے ساتھ مہاجر مکی کا لقب بھی نظر آتا ھے۔ چونکه حاجی صاحب آخر عمر تک مکه هی میں قیام فرما رهے اس لئے بھیاجی نے غالباً ان سے غائبانه بیعت کی هوگی۔

بهرحال بعد میں بھیاجی مرحوم' مرادآباد کے ایک بزرگ صوفی جان صاحب مرحوم سے بیعت هوگئے تھے' میں جب میرٹھ گیا تھا اس وقت تک مجھے صوفی جان صاحب کے متعلق کچھ معلوم نه تھا، لیکن صرف اس قدر سنا تھا که صوفی محمد حسین صاحب رح (جن کا ذکر گذشته باب میں کیا گیا ھے) کی طرح وه بھی حافظ علی حسین شاه صاحب کے خلیفه تھے' یه مجھے بعد میں معلوم هوا که ان دونوں بزرگوں کے مریدین میں معاصرانه چشمک تھی۔ جیسا که پہلے ذکر کیا جاچکا ھے صوفی محمد حسین صاحب رح سے قبله والد صاحب رح کے گہرے اور قریبی تعلقات تھے' صوفی صاحب تقریباً هر هفته همارے مکان پر تشریف لایا کرتے تھے' ان کی شخصیت میں عجیب قسم کی جاذبیت تھی اور کوئی شخص ان کی وجاهت اور قابلیت سے متاثر هوئے بغیر نہیں ره سکتا تھا' صوفی صاحب هم بھائیوں سے بے حد محبت کرتے تھے اور اکثر عرسوں کی محفل میں قبله والد صاحب رح کے همراه همیں بھی لے جاتے۔ یه بھی مجھے بعد میں علم هوا که ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیاده تھی' چونکه میں مرادآباد کا رهنے والا تھا' بھیاجی نے مجھ سے قدرتی طور پر یه دریافت کیا میں صوفی جان صاحب

سے کسی طرح متعلق هوں' میں نے ان کو بتلایا که میں نے صرف ان کا نام سنا ھے' اور اس کے ساتھ هی صوفی محمد حسین صاحب رح اور ان سے والد صاحب قبله رح کے تعلقات کا ذکر بھی کیا۔ یقیناً اس ذکر سے وه متاثر نہیں هوئے هوں گے مگر انھوں نے ردعمل کا کوئی اشاره بھی نہیں کیا۔ هاں' صوفی جان صاحب مرحوم کی بزرگی اور بعض کرامات کا اکثر ذکر کرتے تھے۔

موسم گرما کی تعطیل میں' مرادآباد واپس آیا۔ اسی زمانه میں والد صاحب قبله رح کلیر شریف تشریف لے گئے، وهاں اس وقت کے سجاده نشین خان بہادر عبدالرحیم شاه صاحب سے ملاقات هوئی' ان کے پیش رو ظهورالحسن صاحب دادا صاحب قبله یعنی سید ظهورالحق شاه رح کے مرید تھے' اس لحاظ سے وه اور ان کے بعد عبدالرحیم شاه صاحب' والد صاحب قبله رح کی بہت عزت کرتے تھے ان کو جب میرے متعلق معلوم هوا تو انھوں نے فوراً ایک طویل خط بھیاجی کو لکھا' جس میں همارے بزرگوں اور خاندان کا ذکر کر کے کہا که وه میری تعلیم اور آرام وغیره کا خاص خیال رکھیں اور اس کے لئے وه ان کے ممنون هوں گے' بھیاجی پر اس کا یقیناً بہت اثر هوا' اس لئے که جب تعطیل کے بعد واپس آیا تو ان کے ملازم نے مجھے بتلایا که میں اب چھوٹے سرکار (بھیا بشیر الدین کا یهی لقب تھا) کا حکم ھے کے آپ کو کسی قسم کی تکلیف نه هو اور آپ ان کے مستقل مہمان هیں۔ اس کے بعد میں پانچ سال میرٹھ میں اسی بنگله میں مقیم رها۔ اسی بنگله کی annexe میں دیوبند کے ایک فاضل قیام پزیر تھے' وه بھیاجی کے بڑے صاحبزادے کو عربی پڑھاتے تھے اور قاری صاحب کے نام سے

مشہور تھے۔ اسی عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی
اور قاری صاحب اکثر اس میں نماز بھی پڑھاتے تھے۔

سیکنڈ ایر میں آنے اور ایک سال پردیس میں رہنے کے بعد
دنیا کا تھوڑا سا تجربہ بھی ہوگیا تھا۔ بھیاجی کی توجہ اور لطف
وکرم اب بہت زیادہ تھا' مجھے یاد ہے کہ ان کے ایک صاحبزادہ
کی شادی کی تقریب تھی جس میں' میں بھی مدعو کیا گیا لیکن
بغیر کسی سبب کے میں وہاں نہیں گیا' انہیں جب معلوم ہوا کہ
میں موجود نہیں ہوں تو فوراً اپنے ایک ملازم کو گاڑی لے کر بھیجا
کہ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو فوراً
کھڑے ہوگئے اور ان کی وجہ سے محفل میں بہت سے لوگ
کھڑے ہوگئے' میں پریشان ہوگیا اور مجھے پسینہ آ گیا۔ فرمانے لگے:
سید صاحب ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میری شرمندگی
کی انتہا نہ تھی' سولہ سال کی بزرگی میں کبھی اس قسم کا
واقعہ نہیں ہوا تھا۔ باوجود کم عمر ہونے کے ان کی برزگی اور
وسعت اخلاق کا اسی روز سے مجھے اندازہ ہوگیا۔

شب کے کھانے پر ان کا دل چاہتا تھا کہ کم از کم سات
آٹھ لوگ ان کے ساتھ ہوں، چنانچہ تقریباً ہر روز ہم دونوں یعنی
محی الدین احمد خان اور میں ضرور ہوتے تھے' کبھی کبھی مہمانوں
کے علاوہ ان کے اعزا یا صاحبزادوں میں سے بھی کوئی موجود
ہوتا' کھانے کے بعد کم و بیش ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ تک دلکش
انداز میں دلچسپ اور بعض اہم دینی موضوعات پر گفتگو کرتے
اکثر بزرگان دین کے حالات اور تصوف سے متعلق بعض مسائل ان

گفتگوؤں کا موضوع ہوتے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ
ان کی مختصر تقاریر سے مجھے بہت فائدہ پہنچا اور معلومات میں
اضافہ ہوا۔ اس کے بعد متعدد ایسے واقعات ہوئے جن میں ان کے
ان اوصاف کا دوسرے حضرات کے ساتھ برتاؤ میں بھی دیکھنے کا
موقع ملا۔ اس وقت تو نہیں لیکن رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوتا
گیا کہ قدیم تہذیبی اقتدار سے متاثر ماحول میں تربیت یافتہ لوگوں
کا کردار کس قدر بلند ہوتا ہوگا۔

کلیر شریف میں حاضری

جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے بھیاجی کو حضرت شیخ علاءالدین
احمد صابر کلیری رح سے بہت زیادہ عقیدت تھی' ہمارے بزرگوں کو
بھی مخدوم صاحب سے بےحد عقیدت تھی اور والد صاحب قبلہ
ہر سال عرس میں شرکت کے لئے کلیر تشریف جایا کرتے تھے' بھیاجی
کی عقیدت کی یہ کیفیت تھی کہ بمبئی کے قریب کھنڈوہ کے مقام
پر ان کی ایک مل تھی۔ اس کی جملہ آمدنی وہ کلیرشریف میں
عرس کے موقع پر خرچ کردیتے تھے' وہاں ڈیروں اور خیموں کا ایک
کیمپ لگتا تھا' جس میں مہمانوں اور ملازموں کو ملا کر ایک
بڑی تعداد لوگوں کی پانچ چھ روز قیام کرتی تھی' میرا اندازہ ہے
کہ شاید یہ تعداد ایک سو تک پہنچ جاتی ہوگی۔ یہ سلسلہ
صوفی جان صاحب مرحوم کی حیات میں شروع ہوا تھا' لیکن
پھر ان کے بعد بھی جاری رہا۔ بہرحال اس وقت سے تقریباً ہر سال
میں بھی عرس میں حاضر ہوتارہا۔ صوفیاء کرام اور بزرگان دین کے
مقام اخلاق' ان کے کردار کی بلند پائیگی اور دینی و روحانی زندگی

کے حالات کا تذکرہ ہمارے مکان پر بھی ہوتا رہتا تھا، اور اکثر اس وقت کے صوفیہ جن میں بعض بلند پایہ عالم تھے اور عمدہ کردار رکھتے تھے والد صاحب قبلہ کے پاس آتے رہتے تھے، اب بھیا بشیر الدین کی صحبت میں بھی اسی موضع پر اکثر گفتگو ہوتی تھی، چنانچہ اس کے متعلق میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور تصوف و صوفیہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کا شوق بھی بڑھتا رہا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے، میرے علاوہ دو اور طالب علم اسی بنگلہ میں تھے، محی الدین احمد خان فیض عام اسکول میں غالباً اٹھویں کلاس میں تھے اور محمد اسحاق صاحب بی۔اے میں تھے۔ دونوں نہایت خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج تھے۔ آخر الذکر بہت ذہین طالب علم تھے، میٹرک پنجاب سے فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا تھا لیکن کالج میں داخل ہوکر اپنا کافی وقت اساتذہ اور اپنے ہم جماعتوں میں سے بعض کے ساتھ گپ میں گذارتے، اکثر رات کو اس وقت واپس آتے جب ہم سوجاتے تھے۔ مسلم ہوسٹل بنگلہ کے سامنے ہی تھا، یہیں وہ کافی رات گئے تک باتوں میں مصروف رہتے۔ پان کھانے کا بے حد شوق تھا اور اکثر اس کی سرخی ہونٹوں اور باچھوں پر نمایاں طور سے نظر آتی رہتی تھی۔ اسحاق صاحب کے متعلق چند لطیفے دلچسپ ہیں۔ دو ایک کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ میرٹھ میں موسم سرما سخت ہوتا ہے اور بھاری لحاف کے بغیر کام نہیں چلتا، میاں اسحاق (اسی نام سے سب اُن کو مخاطب کرتے تھے،) انھوں نے بھی ایک لحاف سلوایا تھا، جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ طول اور عرض کی لمبائی میں فرق نہ تھا، اس کے) متعلق اگر کوئی دوست ان سے سوال کرتا تو جواب دیتے یہ بہت آرام دہ

ہے، میں نصف بچھالیتا ہوں اور نصف اوڑھ لیتا ہوں، کبھی کبھی کہتے آج حلوہ پکانا ہے، اور فوراً بنگلہ کے چوکیدار کالو خاں کو پیسے دیکر کہتے جاؤ گھی، شکر سوجی اور کوئلے لاؤ اور انگیٹھی میں آگ سلگا کر یہیں لے آؤ، انگیٹھی آتے ہی دیگچی میں پانی ڈال کر اس میں گھی، شکر اور سوجی سب ڈال دیتے، میں کہتا کہ بھائی اسحاق یہ تو آپنے سب کام گڑبڑ کردیا، فوراً کہتے 'چھوڑو' یار جس سوجی میں گھی اور شکر ملاکر پکاؤ گے، وہ یقیناً حلوہ ہی بن کر رہے گی"۔ ایک حد تک یہ ٹھیک ہی تھا، اس لئے کہ تیار ہونے کے بعد اس کا مزہ کچھ حلوہ ہی جیسا ہوتا تھا، بنگلہ میں ایک ٹینس کورٹ بھی تھا لیکن چونکہ اس کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا، وہ کس مپرسی کی حالت میں تھا، بھائی اسحاق کو یکایک ٹینس کھیلنے کا شوق دامنگیر ہوگیا، کالج کے ٹینس کلب سے ایک پرانا جال، استعمال شدہ گیندیں اور ریکٹ خرید کر لے آئے اور دوپہر کے وقت ہم دونوں سے کہنے لگے، چلو ٹینس کھیلیں۔ اسکول کے زمانہ میں ہاکی تو کھیلتا تھا لیکن ٹینس صرف دوسروں کو کھیلتے ہوئے دیکھا ہی تھا، بھائی اسحاق کی یہ دعوت نہایت خوش آئیند تھی، چنانچہ ٹینس کا سلسلہ شروع ہوگیا اور کافی عرصہ تک جاری رہا۔ نہایت دلچسپ بات یہ تھی کے ٹینس کے قواعد و ضوابط میں کسی ایک کی بھی پابندی نہیں کرتے تھے اور نہ ہم سے اس کی امید رکھتے تھے، سروس کا تو یہ حال تھا کہ کورٹ کے عین وسط میں سے کی جاتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کے کھیل نہ آیا، صرف بچوں کی طرح گیند کو ادھر سے ادھر پھینک کر خوش ہوتے رہتے تھے۔ ہاں گیمز اور پوائنٹز کی گنتی بہت باقاعدہ انداز میں

کی جاتی تھی۔

بی ایس سی پاس کرنے کے بعد بھائی اسحاق علیگڈھ چلے گئے اور ایم ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ بعد میں یونیورسٹی میں فزکس ڈپارٹمنٹ میں ان کا تقرر ہوگیا' تقسیم کے بعد یہاں آگئے اور لاہور یونیورسٹی (پنجاب یونیورسٹی) میں پروفیسر ہوگئے۔ افسوس ہے عمر نے وفا نہ کی۔ سنہ ۶۱ء یا ۶۲ء میں انتقال ہوگیا' اپنی بعض ,, قلندرانہ ،، خصوصیات کے باوجود بھائی اسحاق کی نمایاں اور انتہائی قابل قدر صفت یہ تھی کے احباب اور طلبہ سے بےحد ہمدردی رکھتے تھے اور ان کی ہر قسم کی مدد اور خدمت کے لئے تیار رہتے۔ مجھے یقین ہے کے جس کسی کا بھی کسی حیثیت سے ان کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے وہ ان کو بھول نہیں سکتا۔ مجھے میرٹھ ھی میں نہیں بلکہ علیگڈھ میں بھی ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا کیوں کہ ہم دونوں اتفاق سے برابر کے کمروں میں رہتے تھے۔

محی الدین احمد خان' اگرچہ اسکول کے طالب علم تھے' لیکن کلاس کی نسبت سے ان کی عمر کچھ زیادہ تھی' چنانچہ خیالات اور دلچسپیوں کے لحاظ سے نیز ان کی گفتگو سے یہ ھی معلوم ہوتا تھا کے وہ کالج میں' فارسی و اردو ادب اور شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے' انگریزی اور فارسی (نستعلیق) خط دونوں بہت اچھے تھے مجھ سے بےحد لگاؤ تھا' تقریباً ہر وقت اور ہر جگہ ہم ساتھ ھی رہتے تھے' کالج میں پہنچکر فارسی ادب سے ان کی دلچسپی اور زیادہ ہو گئی' چنانچہ اسی مضمون میں ایم اے پاس کر کے کالج

میں فارسی ھی کے پروفیسر ہو گئے تھے' لیکن میرٹھ چھوڑنے کے بعد ان سے کبھی ملاقات کا موقع ھی نہیں ملا۔ ہم دونوں ھی خط لکھنے کا زیادہ شوق نہیں رکھتے تھے' چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ قائم ھی نہیں ہوا۔ میں تھرڈایر میں تھا' تو ظہیرالدین احمد خان (جسٹس ایم بی احمد کے بڑے بھائی) بھائی ہمارے ساتھ رہائش پزیر ہوگئے' وہ بھیاجی کے خاندان کے چند بچوں کے پرائیویٹ ٹیوٹر بھی تھے اور کالج کے طالب علم بھی۔ فرشتہ خصلت انسان تھے' نہایت خوش اخلاق' گفتگو اور برتاؤ میں شائستگی ان کی نمایاں خصوصیت تھی' جو لوگ ان سے عمر میں چھوٹے ہوتے ان سے بھی آپ اور جناب سے گفتگو کرتے' چونکہ ڈاڑھی رکھتے تھے اس لئے سب لوگ ان کو مولانا کہتے تھے' ظہیر بھائی کی سادہ مزاجی اور حسن اخلاق کا اندازہ ایک دلچسپ واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا ظہیر نے ایک ۱۲-۱۳ سال کے لڑکے کو ملازم رکھ لیا تھا چونکہ ناشتہ فجر کی نماز کے فوراً بعد کرتے تھے' اس بچہ کا نام تو یاد نہیں رہا لیکن اس کی بعض دلچسپ حرکتیں ضرور یاد ھیں' قابل ذکر یہ بات ہے کہ وہ اتنی صبح تو سوکر نہیں اٹھ سکتا تھا کہ چائے وقت پر تیار کردے۔ ہم لوگوں نے مولانا سے کہا کہ اس سے کام نہیں چلے گا' اس کو بدلنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں ملازمین کی دستیابی آجکل کی طرح کوئی مسئلہ نہ تھا' لیکن ظہیر بھائی ذہنی طور پر اس کو علیحدہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے ساتھ ھی ہماری ,, سفارشات ،، کو بھی نظر انداز کرنا نہیں چاہتے چنانچہ انہوں نے اپنے پروگرام میں یہ تبدیلی کی کے نماز سے آتے ھی نہایت خاموشی سے انگیٹھی سلگا کر چائے تیار کرلیتے' کافی دیر

کے بعد وہ صاحبزادے آتے تو ان کو ناشتہ تیار ملتا' ہم لوگ کالج چلے جاتے اور وہ برتن صاف کرنے کے بعد تقریباً دوسرے روز تک خالی رہتے' زیادہ تر اپنا وقت نیچے بازار میں گذارتے تھے' کچھ عرصہ بعد خود ھی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔

حکیم محمد میاں صاحب'

اسی سال انفلوئنزا کی عالمگیر وبا پھیلی اس زمانہ میں اس کا تسلی بخش علاج نہیں تھا' اس لئے کافی اموات ھوتی تھیں۔ کالج کے ھوسٹلوں میں بھی کافی طلبہ اس کا شکار ھوئے اور میں بھی نہ بچ سکا' لیکن اس موقع پر حکیم محمد میاں صاحب کے علاج سے بہت فائیدہ ھوا اور کالج کے طالب علموں کا بھی انہوں نے علاج کیا، دو تین روز میری طبیعت بہت خراب رھی لنکن خدا کا شکر ھے کے بالاخر حکیم صاحب ھی کے علاج سے آرام ھوگیا' انں کے بعد جب کبھی طبیعت خراب ھوتی' میں ان کے ھی پاس جا کر دوا لیتا تھا۔ ان کی شفقت و مہربانی کا تقاضا ھے کہ یہاں مختصراً ان کی خصوصیات اور اوصاف کا کچھ ذکر کیا جائے' کلیم صاحب' مولانا عبدالسمیع بیدل کے صاحبزادے تھے' جو بھیابشیرالدین اور ان کے برادر محترم خان بہادر شیخ وحیدالدین کے عربی و فارسی کے استاد تھے' مولانا کا تو انتقال ھوچکا تھا' لیکن ان کے بعد حکیم صاحب نے میرٹھ ھی میں مطب قائم کرلیا تھا چنانچہ شہر سے کم و بیش ڈیڑھ دو میل دور رھنے کے باوجود کثرت سے لوگ ان کے پاس آتے تھے' اور ان میں اچھی خاصی تعداد سربرآوردہ حضرات کی ھوتی تھی' حکیم صاحب کے مکان کے احاطہ میں

ایک طرف ان کی گاڑی اور گھوڑے کے لئے اصطبل تھا اور دوسری طرف عطار کی دوکان تھی جو حکیم صاحب ھی کی تھی اور دوا وھیں سے لی جاتی تھی کیونکہ وہ زیادہ تر مرکبات سے علاج کرتے تھے' کافی دوائیں سفوف کی شکل میں ھوتی تھیں' وہ فیس تو کسی سے نہیں لیتے تھے لیکن دواؤں کی قیمت سے اچھی آمدنی ھوتی تھی' ان کی شریک حیات اور ایک صاحبزادہ کا انتقال ھوچکا تھا' اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی تھی اور تنہا رھتے تھے' حکیم صاحب کا رنگ صاف، قد' قدرے طویل اور جسم بھاری تھا' عمر پچاس سال سے زیادہ ھوگی' داڑھی نہیں رکھتے تھے' مونچھوں اور سر کے بالوں میں پابندی سے خضاب لگاتے تھے' بالوں کی سفید جڑ یں نظر نہیں آتی تھیں' تنگ پائجامہ' ململ کا سفید کرتا اور ململ ھی کا قدیم وضع کا انگرکھا پہنتے تھے' سفید لکھنوی انداز کی بیل لگی ھوئی ٹوپی جس کا اس زمانہ میں بہت رواج تھا' اوڑھتے تھے۔ موسم سرما میں بھی یہی لباس زیب تن فرماتے۔ کبھی کبھی شال کندھوں پر ڈال لیتے' دیکھنے سے معلوم ھوتا تھا کہ خالص رئیس یا نواب ھیں لیکن حقیقت میں ایک عمدہ طبیب تھے اور اسلامی علوم میں اچھی دستگاہ تھی۔ حیرت کی بات ھے کہ مشرقی دینی طرز کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے باوجود حکیم صاحب کو ریس (گھڑ دوڑ) اور اسپورٹس وغیرہ سے خاص طور پر کرکٹ کا کھیل دیکھنے کا بےحد شوق تھا' کالج کے اکثر میچوں میں وہ موجود ھوتے' اور ھم لوگوں (یعنی طلبہ) سے جب گفتگو کا موقع ھوتا تو موضوع یہی ھوتا۔ ریس سے اسقدر دلچسپی تھی کہ سال میں میرٹھ کے علاوہ دھلی اور بعض دیگر مقامات کا سفر کرکے اس

میں شرکت کرتے تھے، سنہ ۱۹۱۹ء و سنہ ۳۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، مقامی لیڈروں میں نمایاں امتیاز حاصل تھا، اب ململ کی جگہ کھدر کے کپڑے پہننے لگے تھے، لیکن گاندھی کیپ نہیں اوڑھتے تھے۔

کالج کی تعلیم، چند احباب و ہم جماعت

میرٹھ کالج، اس زمانہ میں اوسط درجہ کے کالجوں میں شمار کیا جاتا تھا، ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، بی اے۔ بی ایس سی اور ایل ایل بی کی تعلیم دی جاتی تھی، کالجوں میں طلبہ کی تعداد ان دنوں میں آجکل کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی تھی پھر بھی شاید اس کالج میں پانچ سو یا اس سے زیادہ طالب علم تھے، دوسرے اداروں کی طرح یہاں بھی ہندو طلبہ کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ تھی، مسلمان غالباً دس بارہ فیصد ہوں گے۔ اساتذہ میں عربی و فارسی کے دو پروفیسروں کے علاوہ صرف ایک پروفیسر سید عبدالجلیل، فزکس کے پروفیسر تھے، وہی مسلم ہوسٹل وارڈن بھی تھے۔ عام طور پر سب مسلمان طلبہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے، لیکن بھیاجی مرحوم کے تعلق کی نسبت سے مجھ پر ابتداء ہی سے بہت مہربان رہے، ان کے بعض اوصاف کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔

متذکرہ بالا اساتذہ کے علاوہ کالج کے لائبریرین بھی مسلمان ہی تھے، اگرچہ اس زمانہ میں لائبریرین کا عہدہ زیادہ مؤثر نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کا شمار کلیریکل اسٹاف ہی میں ہوتا تھا، لیکن طلبہ کے نزدیک ان کی شخصیت اہم تھی، بدقسمتی سے

مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا لیکن حلیہ کسی حد تک ذہن میں ہے، پستہ قد اور دبلے پتلے جسم کے نوجوان تھے، ان کی عمر ہم سے تھوڑی ہی زیادہ ہوگی۔ بہت زیادہ خوش مزاج بھی نہیں تھے اور نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ہر وقت طلبہ کا ایک ہجوم ان کو گھیرے رہتا تھا، اسٹاف بھی ان کے پاس برائے نام ہی تھا، کتابیں تک نکالنے کا کام اکثر خود ہی کرتے تھے، چونکہ اسی علاقے میں رہتے تھے جہاں ہماری رہائش گاہ تھی، اس لئے قدرے مجھ پر کتابوں وغیرہ کے معاملہ میں مہربان رہتے۔ ابتداء میں کتب تعداد میں بہت مختصراً تھیں کچھ ہی عرصہ بعد کالج کے ہال کو جس کی اونچائی، کافی زیادہ تھی درمیان میں چھت ڈا کر دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا اور نیچے ہال اور اس پر کتب خانہ بن گیا تھا، کالج کا دفتری بھی مسلمان تھا، وہ بھی نو عمر مگر خاموش طبع اور خوش مزاج شخص تھا، اور ہر وقت ہی کچھ طلبہ ان کے چھوٹے سے حجرے میں موجود رہتے تھے۔

چند ہم جماعت احباب

جلد ہی ہم چند مسلمان طلبہ کا ایک گروپ خود بخود وجود میں آگیا، فرسٹ ایر میں داخلہ کے بعد کچھ دنوں تک عجیب قسم کی تنہائی اور اجنبیت سی محسوس ہوتی رہی، رفتہ رفتہ خود ہی ایک دوسرے سے تعارف حاصل کراتے رہے، کلاس میں بھی پابندی کے ساتھ ایک ہی بنچ پر بیٹھتے اور کلاس کے باہر بھی ساتھ ساتھ گھومتے رہتے تھے، مضامین مشترک تھے، سب سے پہلے محمد یحییٰ صاحب کا ذکر کیا جاسکتا ہے، وہ میرٹھ کے ایک صوفی

عالم مولوی محمد ذکریا کے صاحبزادے تھے' وہ صوفی محمد حسین صاحب مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے' اس سلسلہ میں کبھی کبھی مرادآباد بھی آتے تھے' والد صاحب قبلہ رح سے بھی ملاقات تھی اور میں نے ان کا نام سنا تھا کہ ہمارے گھر پر بھی آیا کرتے تھے، لیکن اس وقت میری عمر بہت کم تھی اور مجھے ان کی شکل وغیرہ یاد نہیں تھی۔ بہرحال نام سے واقف تھا۔ میرے میرٹھ جانے سے قبل ان کا انتقال ہوچکا تھا' ان کا سالانہ عرس بھی ہوتا تھا' یحییٰ صاحب کی دعوت پر میں بھی شریک ہوا اور شب کو وہیں قیام کیا۔ غالباً انٹرمیڈیٹ کے بعد یحییٰ صاحب نے تعلیم ختم کردی۔ بہرحال مجھ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔

محمد ذاکر صاحب' طبعاً سنجیدہ اور محنتی طالب علم تھے' لباس کے علاوہ' اخلاق اور برتاؤ شائستگی اور باقاعدگی اور بے تکلف ہونے میں انتہائی تکلف کے باعث کبھی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ کالج کے ماحول' طلبہ اور اساتذہ سے وہ نا مطمئن سے رہتے' زیادہ تر ان کی گفتگو ان ہی موضوعات پر ہوتی تھی جن کا تعلق کتابوں' لیکچروں اور ''اسٹڈیز'' سے ہوتا تھا' بہرحال مجھ سے بہت خوش تھے۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت کرلی' تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور اسمبلی سکریٹریٹ میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے وہ ملازمت سے باعزت طریقہ سے رٹائر ہوئے۔

محمد عزیزالدین احمد صاحب جو مسٹر ایم بی احمد کے قریبی عزیز تھے بہت اچھے طالب علم تھے اور امتحانات میں اچھی

پوزیشن لے کر کامیاب ہوتے۔ ایک مرتبہ میرے ہمراہ تعطیل میں مرادآباد بھی گئے اور دادا صاحب رح (سید ظہورالحق شاہ رح) کے عرس میں شرکت کی۔ مجھے یاد ہے کہ تمام غزلوں میں جو قوالوں نے تین روز کی مختلف محافل سماع میں سنائیں ان کو مولانا (روم رح) کی ایک غزل بہت پسند آئی تھی۔

۱۹۲۴ میں بی اے کا امتحان دینے کے لئے الہ آباد جانا پڑا' اس زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے اور ایم اے کے امتحانات کا سنٹر صرف الہ آباد میں تھا' اور تمام مقامات سے طلبہ وہیں پہنچتے تھے' وہاں قیام و طعام کی سہولت کے لئے ہم چار پانچ طلبہ نے جو دوستانہ روابط رکھتے تھے' ساتھ سفر کرنے اور الہ آباد میں ایک ہی جگہ ٹھہرنے کا منصوبہ بنایا' اور طے کیا کہ وہاں مسلم ہوسٹل میں قیام کیا جائے۔ ہمارے استاد محترم مولانا گرامی مرحوم کے چھوٹے بھائی مولانا نامی مرحوم اس ہوسٹل کے وارڈن تھے' اس لئے ٹھہرنے کی اجازت بہ آسانی مل گئی' لیکن وہاں صرف دو روز قیام کیا' ہوسٹل میں پانی کا انتظام ٹھیک نہیں تھا' پوری عمارت میں صرف تین چار نل تھے اور پانی آنے کے اوقات بھی محدود تھے' صورت حال یہ تھی کہ شام کو مغرب سے پہلے ہوسٹل کے بیرے (ملازم) اپنے متعلقہ کمروں سے صراحیاں اور گھڑے لے جا کر ان سے پانی لاتے۔ امتحان کے زمانہ میں مہمان طلبہ کی تعداد کافی زیادہ ہوتی اور یہ پانی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہوتا' موسم گرم تھا اور غسل کی کوئی صورت نہ تھی۔ ہمارے کمرے پر جو بیرا متعین تھا' اس نے صاف کہہ دیا کہ طلبہ اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ غسل کے لئے پانی مہیا کرنا تقریباً

ناممکن ہے' چنانچہ ہم تلاش میں نکلے کہ کوئی پرائیویٹ مکان کرایہ پر لے لیا جائے امتحانات کے دنوں میں یونیورسٹی کے قرب و جوار میں لوگ اپنے مکان یا ان کا حصہ کرایہ پر دیدیتے تھے' جویقیناً کچھ زیادہ ہوتا تھا' ہمارے انداز اور گفتگو سے لوگ جو مکانات کرایہ پر اٹھانے کے منتظر رہتے تھے' سمجھ گئے کہ شاید ہم بھی مکان کی تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات بیروں نے پہلے ہی بتلا دی تھی' چنانچہ ہمیں بھی مکان مل گیا اور مالک مکان نے ایک کھانا پکانے والی عورت کا بھی انتظام۔ کردیا یہ بیوہ عورت اگرچہ معمر تھی' لیکن مستعد اور تندرست تھی' سامان خوردنوش بھی بازار سے لے آتی تھی' اور کھانا بھی اچھا پکاتی تھی' اس انتظام سے ایک مشکل مسئلہ حل ہوگیا اور ہم لوگ بے فکر ہو کر پڑھ سکتے تھے۔ میری امتحان کی تیاری قابل اطمینان نہ تھی۔ کیونکہ آنے سے قبل میں بیمار ہوگیا تھا' اور یہ مسئلہ قابل غور ہوگیا تھا کہ امتحان میں اب بیٹھوں یا ایک سال بعد' آخر میں فیصلہ یہی کیا کہ سال ضایع نہ کیا جائے' اور ہمت کر کے الہ آباد چلا گیا' بہرحال پرچے ایسے کئے کہ کامیاب ہونے کی امید تھی' بے شک اچھا ڈویژن نہ مل سکا۔

بی اے میں کامیاب ہونے کے بعد آیندہ پروگرام طے کرنے کا مسئلہ تھا' میری عین خواہش تھی کہ ایم اے پاس کر کے پروفیسر بنوں' لیکن والد صاحب قبلہ مرحوم' نیز بھیاجی مرحوم کا اصرار تھا کہ ایل ایل بی کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کروں' میں ذہنی طور پر اس پیشے کے لئے خود کو تیار نہیں کرسکتا تھا' لیکن ساتھ ہی ان بزرگوں کی رائے کو نہ نظر انداز کرسکتا تھا' اور نہ ان کے

مقابلہ میں اپنی رائے پر اصرار کرسکتا تھا' چنانچہ میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا' ساتھ ہی میں نے بھیاجی مرحوم سے درخواست کر کے ان کو اس پر راضی کرلیا کہ صبح کے وقت میں فیض عام ہائی اسکول میں اعزازی طور پر پڑھانے کی اجازت دلوادیں۔ اس طرح میری دلی خواہش پوری ہوگئی' صبح کو فیض عام اسکول میں پڑھانے جاتا اور شام کو ایل ایل بی کے لکچروں میں شرکت کرتا' شروع ہی سے خیال تھا کہ پرائیویٹ طور پر' ایم اے تاریخ کا امتحان دوں۔ فیض عام اسکول میں انسپکٹر تعلیمات جب معائنہ کے لئے آئے تو انھوں نے میرے کلاس کا بھی معائنہ کیا' اور اسقدر خوش ہوئے کہ رپورٹ میں بہت تعریف کی۔ اسکول کی انتظامیہ اتنی خوش ہوئی کہ انھوں نے ایک سال کی تنخواہ اسی روپیہ ماہانہ کے حساب سے یکمشت مجھ کو دے دی۔ یہ واقعہ خوشگوار ہی نہیں بلکہ ابتدائی زندگی میں بہت اہم بھی ثابت ہوا' اسی سال چند احباب کے ہمراہ جن میں فیض عام کے ہیڈ ماسٹر جناب ارشاد علی خان صاحب[8] خاص طور پر قابل ذکر ہیں' محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے علیگڈھ جانا ہوا۔ علیگڈھ جانے کی خواہش بلکہ تمنا اس دور میں ہر تعلیمیافتہ مسلمان کے دل میں ہوتی تھی لیکن میرے اس سفر اور کانفرینس کی شرکت کو ارشاد علی خان کی معیت نے بےحد دلکش اور مفید بنا دیا۔ ان کی لاتعداد علیگیوں سے ملاقات تھی۔ ہر قدم پر کوئی نہ کوئی شناسا' ہم سبق یا ہمعصر مل جاتا تھا اور سارا وقت نہایت دلچسپی میں گذرتا تھا' علیگڈھ کے قیام میں' میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ۱۹۲۴ میں وہاں داخلہ لے کر ہسٹری میں ایم اے

کرنا چاہئے ۔ چنانچہ دو سال کی فیض عام کی ملازمت میں جو
روپیہ ملا اس کا بڑا حصہ والد صاحب مرحوم سے درخواست کر کے
محفوظ رکھا کہ اخراجات میں زیادہ دقت نہ ہو' اور میرٹھ کالج میں
دو سال ایل ایل بی کلاس کے لیکچروں میں شرکت کی لیکن امتحان
میں بغیر تیاری کے بیٹھا جس سے بزرگوں پر یہ اثر ہوا کہ میں
وکالت کی تعلیم اور پیشے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا چنانچہ
علیگڈہ میں ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی جانب سے
مخالفت نہیں ہوئی اور جون سنہ ۲۴ میں وہاں جا کر میں نے
داخلہ لے لیا ۔

میرٹھ کالج کی چھ سالہ زندگی کے متعدد واقعات ذکر کرنے
کے قابل ہیں لیکن طوالت کے اندیشے سے ان کو بیان نہیں کیا
جاتا ۔ دو چار واقعات پر اکتفا کرتا ہوں ۔ پروفیسروں میں سب سے
پہلے پرنسپل کالج مسٹر ولیم جیسے (Jesse) کا ذکر ضروری ہے
ان کو اپنی اعلیٰ تعلیم اور اپنی بیگم صاحبہ کے حسن کا شدت
سے احساس تھا اور اس کا ذکر کبھی کبھی کلاس میں بھی
کردیتے تھے' بی اے کے سال دوم کو جو کالج کی سب سے
اونچی جماعت تھی وہ انگریزی پڑھاتے تھے' پڑھانے کے معاملہ
میں تو کچھ یوں ہی سے تھے اور اپنے علم کی گہرائی کا
اندازہ لگانے کا طلبہ کو بہت کم موقع دیتے تھے' بلکہ اگر کبھی
کوئی طالب علم ہمت کر کے کسی لفظ یا عبارت کے معنی یہ
کہہ کر دریافت کرتا کہ "سر کیا اس سے یہ مطلب ہے" تو سخت
لہجے میں جواب دیتے کہ اور کیا ہوسکتا ہے' اس لحاظ سے ان کا

"گھنٹہ" نہایت غیر دلچسپ اور ڈل (Dull) ہوتا تھا ۔ ڈسپلن
کے معاملے میں بہت سخت تھے' چنانچہ سب طلبہ ان کے کلاس
میں خاموشی سے ان کے لکچر یعنی قدرے روانی سے ان کی "قرأت"
سنتے رہتے تھے ۔ ہاں کبھی کبھی کوئی تاریخی حوالہ آجاتا تو
اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ ضرور فرما دیتے کہ وہ ولیم دی کانکر
کی اولاد ہیں' اور یہ بھی اکثر بتلا دیتے تھے کہ کالج کے پرنسپل کا
درجہ میرٹھ کے کمشنر کی برابر ہے' کالج کے کھیلوں وغیرہ میں تقسیم
انعامات کے علاوہ انہیں دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا ۔ پرنسپل
کے علاوہ وائس پرنسپل بھی انگریز ہی ہوتا تھا ۔ اس زمانہ میں
پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹) میں جو انگریز نوجوان والنٹیرز
کی حیثیت سے بھرتی ہوتے تھے' اختتام جنگ پر ان کو ملازمتیں دینے
کا حکومت کے سامنے ایک مسئلہ تھا ۔ ان میں سے کچھ کو سرکاری
یا نیم سرکاری اداروں میں مقرر کردیا گیا تھا' میرے زمانہ میں
وائس پرنسپل میجر پاول پرائس (Powell Price) تندرست و توانا
لیکن پستہ قد اور جوان العمر انسان تھے' شاید شادی بھی نہیں
ہوئی تھی کیونکہ ان کو تنہا ہی دیکھا گیا' عمر تیس پینتیس سال
ہوگی ۔ ہمیں ایف اے میں انگریزی کمپوزیشن فرسٹ ایر میں اور
تاریخ سال دوم میں پڑھاتے تھے کمپوزیشن ٹیوٹوریل کی طرح ہوتا
تھا اور کاپیاں دیکھتے وقت باتیں بھی کرتے تھے ۔ کبھی essay
وغیرہ لکھنے کو دیدیتے اور خود مختصر سی نیند بھی لےلیتے تھے'
یا کم از کم آنکھیں بند کرلیتے' بعد میں ایجوکیشنل انسپکٹر اور
بالآخر صوبہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے' تاریخ میں Lanepoole اور
بعض دوسری کتابوں سے لیکچر کے دوران اقتباسات سنایا کرتے تھے ۔

پروفیسر چاند بہادر

ایف اے کی ہر دو جماعتوں کو اور بی اے کے سال اول کو علی الترتیب انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ پستہ قد لیکن خوش شکل اور خوش اخلاق انسان تھے، طلبہ سے ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے، ان کے لیکچرز دلچسپ اور پر از معلومات ہوتے تھے، کانگریس کی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے، خلافت و ترک موالات کے دنوں میں کھدر پوش ہوگئے تھے۔ ہم چار پانچ مسلمان طالب علم سب سے آگے کی بنچ پر بیٹھتے اور پڑھائی میں دلچسپی لیتے تھے، اس سے بہت خوش تھے اور اکثر ہم لوگوں سے اسی اس پر گفتگو کرتے۔ ان دنوں میں ہندو مسلم اتحاد کا بہت چرچا تھا، وہ بھی ان سے متاثر تھے مجھ سے بہت خوش تھے، کیونکہ میں اکثر کلاس میں سوال دریافت کرتا اور شاید ان کے سوالات کا قابل اطمینان جواب دیتا تھا۔ لیکن جب میں بی اے کے سال اول میں تھا ایک نا خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ عالمگیر اورنگ زیب پر لیکچر کے دوران، انہوں نے اس کے کردار کے سلسلہ میں سخت اور نا زیبا الفاظ استعمال کئے، میں نے کھڑے ہوکر ان کو ٹوکا اور کہا کہ ان کی تنقید کا انداز اور الفاظ نہایت قابل اعتراض ہیں۔ اس پر انہوں نے مجھے ڈانٹ کر بٹھلا دیا اور خاموش ہوجانے کو کہا، اس زمانہ میں طلبہ اپنے استادوں کا آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اور دو بدو گفتگو کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، چنانچہ میں خاموش ہوگیا، اس واقعہ کا ردعمل مجھ پر یہ ہوا کہ میں نے چاند بہادر صاحب سے کلاس کے اندر یا باہر گفتگو کرنا یا کسی قسم کا سوال دریافت کرنا ترک کردیا۔

میرے اس رویے میں یہ تبدیلی اتنی نمایاں تھی کہ وہ سمجھ گئے، لیکن کچھ ذکر نہیں کیا۔ کچھ عرصہ بعد اتفاق سے وہ اور میں ایک ہی گاڑی سے دہلی جارہے تھے کہ آمنا سامنا ہوگیا، میں بچ کر علیحدہ جانے کی کوشش کررہا تھا کہ انہوں نے آواز دے کر بلایا اور میرے غیر معمولی انداز میں خاموش رہنے کا سبب پوچھا، میں نے صاف الفاظ میں صحیح بات کہہ دی وہ ڈبے میں واپس جانے سے پہلے یہ کہہ گئے کہ واپسی پر مزید گفتگو کریں گے، چنانچہ کالج کے برآمدے میں ایک روز نہایت مشفقانہ اور شگفتہ انداز میں فرمایا کہ استاد کی ڈانٹ ماں باپ کی ڈانٹ کی طرح ہوتی ہے، اس پر برا نہیں ماننا چاہئے، تاریخی شخصیات اور مسائل پر ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ علمی معاملات میں اختلاف رائے غیر معمولی امر نہیں، ہاں اگر میرے الفاظ جو مجھے اب یاد نہیں حقیقتاً نامناسب تھے تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں ان سے دکھ پہنچا، میرے دل پر ان کی گفتگو کا گہرا اثر ہوا، اور ان کے خیالات کے باوجود ان کا دل سے احترام کرنے لگا۔

ایک اور ہندو پروفیسر بھی قابل ذکر ہیں، پروفیسر بوس ملک بی اے میں تاریخ پڑھاتے تھے وہ ایک قابل اور ذہین استاد ہونے کے علاوہ اپنی رواداری، اور عمدہ اور روانی کے ساتھ انگریزی بولنے کے باعث طلبہ میں بہت مقبول تھے، لباس مغربی انداز کا بھی پہنتے تھے اور بنگالی طرز کے کرتے اور دھوتی میں بھی کبھی کبھی کالج آتے تھے دو سال تک انہوں نے تاریخ پڑھائی اور اس مدت میں کسی طالب علم سے کسی قسم کی شکایت کے الفاظ ان کے متعلق نہیں سنا، اس زمانہ میں بی اے کے نصاب تاریخ میں ایک پرچہ صرف

اکبر پر ہوتا تھا، اس کے لئے طلبہ سے امید کی جاتی تھی کہ ہم عصر مورخین کی کتابوں کا بھی مطالعہ کریں' یہ تو طلبہ کے لئے تو کیا خود اساتذہ کے لئے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ ان کتابوں کے اصل فارسی متن سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ ان میں سے اکثر فارسی نہیں جانتے تھے، ہمارے پروفیسر ملک فارسی نہیں جانتے تھے' لیکن اکبر پر ونسٹ اسمتھ کی کتاب شایع ہوچکی تھی ملک صاحب کے مطالعہ کی بنیاد یہی کتاب تھی۔ اس کے علاوہ ہنری ایلیٹ کی ہسٹری آف انڈیا جس میں فارسی اقتباسات کے ترجمے تھے' ان سے بھی وہ فائدہ اٹھاتے تھے' ان کے لکچرز دلچسپ اور معلوماتی ہوتے تھے۔ کالج کی لائبریری میں کبھی کبھی ہم لوگوں کی بھی کہیں کہیں سے ان کتابوں کو پڑھنے اور نوٹس لینے کا موقع ملجاتا تھا' لیکن زیادہ انحصار پروفیسر ملک کے لکچروں سے لئے ہوئے نوٹس پر تھا۔ بہرحال یہ وہ زمانہ تھا (۱۹۲۱-۲۲) جب تاریخ سے میری دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کا آغاز تو اسکول ہی کے زمانے میں ہوچکا تھا لیکن اب یہ دلچسپی خاصی گہری ہوگئی اور ساتھ ہی پروفیسر ملک سے تعلقات بھی زیادہ ہوگئے۔ تاریخ سے دلچسپی بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خان بہادر مولوی ظفر حسن مرحوم جو میری بڑی پھوپی کے نواسے تھے اس زمانہ میں بحیثیت ڈپٹی ڈائرکٹر ارکیالوجی' دہلی میں قیام پذیر تھے' ان کو بھی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی اور میں میرٹھ سے دہلی جاتا تھا تو تاریخی مسائل اور کتب پر ان سے نہایت مفید باتیں ہوتی تھیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت عمدہ تھا اور اس

باتیں ہوتی تھیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت عمدہ تھا اور اس

میں بہت سے نادر اور قیمتی مخطوطات کے علاوہ انگریزی کی بھی کافی کتابیں تھیں[9]۔ تاریخ سے دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک مقالہ انگریزی میں لکھا جو پروفیسر ملک کی سفارش پر کالج کے میگزین میں شایع ہوا۔ مجھے بعد میں ان کے بعض شاگردوں سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی کلاس میں وہ مثال کے طور پر میرا ذکر کرتے تھے کہ معین الحق ایک مثالی طالب علم تھا، بہرحال میری ملاقات ان سے بعد میں صرف ایک مرتبہ ہوئی، اس وقت وہ نہایت علیل تھے' میں ان کی عیادت کو گیا' لیکن وہ زیادہ بات بھی نہیں کرسکتے تھے، بالاخر وہی بیماری ان کا مرض الموت ثابت ہوئی۔

ایک استاد کالج پروفیسر سی۔ عا رائے تھے' وہ بنگالی عیسائی تھے اور فارسی بھی جانتے تھے، ہمیں انٹرمیڈیٹ میں انگریزی اور منطق پڑھاتے' خوش اخلاق اور قدرے خوش مزاج انسان تھے' لیکن منطق پر ان کے لکچرز زیادہ دلچسپ نہ ہوتے تھے، چونکہ میں نے داخلہ کچھ تاخیر سے لیا تھا اور ان کے ابتدائی لکچروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکا تھا' اس لئے اس مضمون کے مطالعہ میں دقت محسوس کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دو تین ماہ بعد جب دسہرے کی تعطیل میں مرادآباد آیا تو اپنے ایک ماموں مولوی عبدالوہاج صاحب مرحوم سے ذکر کیا' وہ عربی فارسی کے بڑے عالم تے' اور ان ہی زبانوں میں منطق پڑھی تھی۔ انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتاب منگوا کر کچھ سبق پڑھائے لیکن میں ان سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کرسکا۔ کالج واپس پہنچنے پر' پروفیسر رائے (Roy) کی مدد سے مضمون سمجھنے کی کوشش کی۔ پروفیسر مذکور کا برتاؤ ہمدردانہ

تھا اور ان کی مدد سے منطق میں دلچسپی پیدا ہونے لگی، ایک روز کالج سے میں واپس آرہا تھا کہ وہ بھی اپنی سائکل لے کر نکلے اور مجھ سے باتیں شروع کردیں، ان کو تصوف اور خاص طور پر مولانا رومی رح کے کلام سے گہری دلچسپی تھی، اسی موضع پر باتیں شروع ہوئیں اور میری گفتگو سے ان کو حیرت بھی ہوئی کیونکہ مجھے بھی مولانا کے بعض اشعار یاد تھے، اور ان کے مطلب سے بھی واقف تھا، حقیقت یہ ہے مولوی عبدالوہاج صاحب مرحوم جو تصوف کے بہت دلدادہ تھے، شام کو عصر اور مغرب کے درمیان میرے برادر محترم سید احسان الحق مرحوم کو مثنوی مولانا روم کا درس دیا کرتے تھے وہ بھائی صاحب مرحوم سے بے حد محبت کرتے تھے، بالخصوص اپنے اکملے بیٹے کی وفات کے بعد جو بھائی صاحب مرحوم کے ہم عمر اور ساتھی تھے، اس حادثہ جانکاہ کا صدمہ ماموں صاحب مرحوم کو بہت زیادہ تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ مثنوی کے اس درس میں اکثر میں بھی شرکت کرتا تھا، چنانچہ تصوف کے بعض مسائل اور تصورات اور مولانا کی تعلیمات سے متعلق متعدد امور کا علم مجھے بھی ہو گیا تھا، چنانچہ پروفیسر رائے سے جب گفتگو مولانا کی مثنوی کے سلسلہ میں ہوئی تو وہ کافی دیر تک کالج کے دروازے پر کھڑے ہوئے مجھ سے باتیں کرتے رہے، مجھے اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ منطق کے مطالعہ کی طرف سے جو ایک قسم کا خوف میرے دل میں بیٹھ گیا تھا وہ دور ہوگیا اور اکثر میں اپنی مشکلات پروفیسر رائے کی مدد سے دور کرلیتا تھا، اس کا افسوس رہا کہ وہ اسی سال یعنی ۱۹۱۸-۱۹ کا تعلیمی سال ختم ہونے پر کالج کی ملازمت چھوڑ کر شاید لکھنؤ چلے گئے۔

۱۹۲۱ کا ایک اور واقعہ جب میں بی اے کا سال اول میں تھا، قابل ذکر ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شباب پر تھیں، ہندو مسلم اتحاد کا زور تھا اور جگہہ جگہہ سیاسی جلسوں سے ہندو اور مسلم لیڈر خطاب کر رہے تھے۔ طلبہ سے اپیل کرتے تھے کہ اسکول اور کالجوں کو جو حکومت کی مالی امداد سے چل رہے تھے وہ چھوڑ کر چلے جائیں، چنانچہ میرٹھ میں بھی ایک عظیم جلسہ ہوا تھا جس میں مسٹر گاندھی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر آصف علی وغیرہ کی تقاریر سے اکثر دوسرے کالجوں کی طرح ہمارے کالج کے طلبہ بھی متاثر ہوگئے اور کالج چھوڑنے کے سلسلے میں مشورے شروع ہوگئے تھے۔ کافی تعداد میں طلبہ نے لکچرز کا بائکاٹ شروع کردیا تھا، ان حالات کے پیش نظر انتظامیہ نے کالج کو ایک طویل مدت کے لئے بند کردیا، جب تعلیمی ادارے چھوڑنے کی تحریک کمزور پڑنے لگی اور سیاسی لیڈروں نے بھی یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ طلبہ کی تعلیم میں خلل اندازی سے زیادہ مفید ان کے لئے عوام میں جوش پیدا کرنے اور ہڑتالوں سے تحریک کو زیادہ فائدہ ہوگا، چنانچہ جب کالج دوبارہ کھلا تو کافی تعداد میں طلبہ واپس آگئے۔ ان میں سے بڑی تعداد کھدر پوش تھی، میں نے بھی دو تین جوڑے یعنی کرتے اور پاجامیں کھدر کے سلوائے تھے۔ اس زمانہ کے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ کالج میں میرٹھ کے کمشنر مسٹر فری مینٹل کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا اور بعد مغرب وقت مقرر کیا گیا تھا۔ کمشنر صاحب وقت سے چند منٹ پہلے پہنچ گئے۔ طلبہ میں سے بہت کم آئے تھے، جن میں ایک میں تھا۔ تماشا یہ کہ چپراسی نے ہال کا

دروازہ بھی نہیں کھولا تھا، فری مینٹل صاحب صدر دروازے کے سامنے برآمدے میں ٹہل رہے تھے، شاید ان کو حیرت تھی کہ ان طلبہ میں سے جو وہاں آگئے تھے، کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوا، شاید اس کا سبب یہ تھا کہ تحریک ترک موالات کے دنوں میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ عام ہوگیا تھا، بہرحال میں نے قریب جا کر ان کو سلام کیا، ابھی مخاطب ہوکر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ہال کا دروازہ کھلا۔ پرنسپل اور پروفیسران اور کچھ طلبہ بھی آگئے اور سب ہال میں داخل ہوگئے۔ ان کے لکچر کا صحیح موضوع یا تفصیلات یاد نہیں، بہرحال ترک موالات کی تحریک کے خلاف ہی ہوگا، چونکہ اپنے عہدہ کی رو سے وہ کالج کی انتظامیہ کے صدر بھی تھے، اس لئے طلبہ کو ''پندونصائح'' پر تقریر کرنے کا ان کو حق تھا۔

کچھ عرصہ بعد نوٹس بورڈ پر یہ نوٹس لگایا گیا کہ فلاں تاریخوں میں الہ‌آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں تاریخی موضوعات پر تین تقریریں کریں گے حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ یونیورسٹی کے پروفیسرز اپنی مخصوص تحقیقات پر مختلف کالجوں میں جا کر چند لکچرز دیا کریں۔ خوش قسمتی سے شفاعت احمد خاں کا انتخاب میرٹھ کالج کے لئے کیا گیا، ان کی قابلیت کالجوں تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی، مسلمان طلبہ میں اس خبر نے ایک خاص جوش پیدا کردیا تھا کیونکہ یونیورسٹی میں وہ واحد مسلمان تھے جن کا تقرر پروفیسری پر ہوا تھا، ہمارے لئے یہ خبر یقیناً عجیب اور خوش آیند تھی، ہم یعنی مسلم طلبہ روزانہ یہ مشورہ کرتے تھے کہ

ڈاکٹر صاحب کو ایک ایٹ ہوم دینا چاہئے، لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ انہوں نے میرٹھ پہنچنے پر اپنے قیام کی اطلاع نہ پرنسپل کو دی اور نہ کسی اور کو، ایٹ ہوم اور استقبالیہ کا خیال عملی جامہ نہ پہن سکا، بعد میں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے جو میرے هموطن یعنی مرادآبادی تھے کافی تعلقات ہوگئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس زمانہ میں خود کو ''پروفیسر'' اور دوسرے اساتذہ سے بالاتر سمجھتے تھے۔ بے تکلفی کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھے جس سے عام طور پر ان کی شہرت یہ ہوگئی تھی کہ اپنی ڈگری، تاریخی تحقیق اور بلند عہدے کا احساس اتنا زیادہ ہے کہ ''مغرور'' ہوگئے ہیں بہرحال میرے تعلقات ان سے صوبائی کونسل کے انتخابات کے سلسلہ میں کافی بے تکلفانہ ہوگئے کیونکہ وہ ممبری کے لئے امیدوار تھے اور ان کو الکشن میں کام کرنے کے لئے طلبہ کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر میں اور ایم بی احمد مرحوم کے بڑے بھائی ظہیر احمد مرحوم، مرادآباد کے ایک قصبہ ٹانڈہ میں گئے، یہ یاد ہے کہ تانگے میں واپس آئے گھوڑا تندرست اور تیز تھا، لیکن راستے میں رات ہوگئی تو تانگہ چلانے والے نے کہا کہ یہاں راہ زن ہوتے ہیں جو حملہ کرتے ہیں۔ اس سے ہم خوف زدہ تو ضرور ہوئے لیکن اس کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی کہ تانگے والے سے رفتار تیز کرنے کو کہا اور کسی بھی حادثے کے لئے تیار ہوکر بیٹھ گئے۔ خوش قسمتی سے کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور جلد ہی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

۱۹۲۴ میں موسم گرما کی تعطیل میں میرٹھ کو خیرباد کہہ کر مرادآباد واپس آیا، اور چند روز بعد علیگڈھ جا کر ایم اے

تاریخ اور ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ میرٹھ کا چھ سالہ قیام،
زندگی کا اہم باب تھا، یہی نہیں کہ اب میں گریجویٹ تھا اور
دوسال کا تدریسی تجربہ بھی حاصل کرچکا تھا کبھی کبھی یہ خیال
بھی آتا تھا کہ مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوکر سول سروس میں
داخل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے لیکن غالب خیال تاریخ میں
ایم اے کر کے پروفیسری کا ہی رہتا تھا، اس زمانہ میں مرادآباد میں
ایک صاحب مسمی ابو محمد ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے،
وہ سٹی مجسٹریٹ بھی تھے، فارسی ادب اور خاص طور پر قلمی
مخطوطوں سے ان کو بےحد دلچسپی تھی۔ لوگ اکثر مخطوطے
ان کے پاس لے جاکر فروخت کرتے تھے، یاد نہیں کہ کن صاحب
کے ذریعہ سے میں بھی ان سے جاکر ملا، اور کئی مرتبہ ان کے
پاس گیا، فارسی ادب سے متعلق ان کی گفتگو دلچسپ اور عالمانہ
ہوتی تھی، اگرچہ مخاطبین میں سے اکثر فارسی سے تقریباً نابلد ہی
ہوتے تھے، یعنی روساء، زمیندار، وکلاء اور میونسپلٹی کے ممبر وغیرہ۔
یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ میں نے فارسی، بی اے تک پڑھی
ہے فوراً مشورہ دیا کہ مقابلہ میں بیٹھنے کی تیاری کروں۔ ان کے
تاکیدی مشورے کے نتیجہ میں، میں نے طے کیا کہ کوشش کرلی
جائے، امتحان کے علاوہ اس زمانہ میں اس مقابلہ کے لئے گھوڑے کی
سواری بھی ضروری تھی، چنانچہ اس کے سیکھنے کے لئے اپنے ایک
دوست ریاض الدین مرحوم کے گاؤں بھوجپور گیا، اور ایک چھوٹے
سے ٹٹو پر مشق شروع کردی۔ ایک ہفتہ کے اندر خوب تیزی سے
اس کو بھگا کر لیجاتا تھا، اور یہ محسوس ہوتا ہم دونوں ایک
دوسرے سے خاصے بےتکلف ہوگئے ہیں۔ ایک روز وہاں رامپور کے

ایک معمر اور تجربہ کار شہ سوار نہایت عمدہ اور قوی گھوڑے پر
آئے، انھوں نے فوراً اپنا اونچا اور تندرست گھوڑا پیش کرتے ہوئے
کہا، اس پر سوار ہوجاؤ، ریاض الدین صاحب کے والد نے جو خود
بھی ایک اچھے شہسوار تھے بہت منع کیا کہ یہ اس گھوڑے کو
نہیں سنبھال سکے گا، لیکن بڑے میاں جو ایک ضدی پٹھان تھے،
نہ مانے اور زبردستی سہارا دے کر مجھے گھوڑے پر بٹھلا دیا، ابھی
میں سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مکان کے پھاٹک کے آگے
ایک خاصی چوڑی نالی آئی جس پر گھوڑا چھلانگ لگا کر کودا
اور میں زمین پر گرگیا، سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوئی کہ
میری ایک ٹانگ رکاب میں پھنس گئی اور مجھے گھسیٹتا ہوا گھوڑا
تیزی سے بڑھا۔ لیکن لگام میرے ہاتھ ہی میں رہی اور میرے گرنے
سے کس گئی، چنانچہ چند قدم بھاگ کر وہ خود ہی رک گیا، زمین
پر گھسٹنے سے میری پیٹھ بہت زیادہ زخمی ہوگئی، گاؤں کے جراح
نے شاید ہلدی چونے کا پھایا لگایا اور بعد میں کچھ اپنے تیار کئے
ہوئے مرہم وغیرہ لگاتا رہا۔ کم و بیش دو ہفتہ تک چارپائی پر
الٹا لیٹا رہا۔ ظاہر ہے تکلیف تو بےحد ہوئی لیکن زخم آہستہ
آہستہ ٹھیک ہوگیا اور پکنے کی نوبت نہیں آئی، ریاض الدین کے
والد شیخ حمید الدین نے باوجود اس کے کہ وہ خاں صاحب کا
احترام کرتے تھے انہیں کافی سخت الفاظ میں ڈانٹا۔ بہرحال زندگی
تھی، میں تندرست ہوکر واپس آگیا۔ یہ واقعہ جو بھی سنتا تھا،
حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ میں کس طرح زندہ بچ گیا، اس کے
بعد سب نے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہونے کے تصور پر لعنت
بھیجنا شروع کردی، میں تو پہلے ہی اس کے خلاف تھا، ابو محمد

صاحب نے بھی اصرار کرنا ترک کردیا، یہ بھی ذکر بے محل نہ ہوگا که اس حادثه سے پہلے ہی میں ان کو ایک دلچسپ نسخه دیوان صائب تیریزی کا دے چکا تھا، یہ خاندانی کے موروثی نسخوں کے مختصر مجموعے میں تھا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نہایت باریک قلم سے لکھا ہوا تھا، مجھے صحیح تو یاد نہیں مگر کم و بیش سو اشعار ہر صفحے پر لکھے گئے تھے۔ متن کے علاوہ حاشیوں پر بھی کافی تعداد اشعار کی تھی، اس کا پڑھنا آسان نہ تھا، 'آرٹ' کے نقطه نظر سے وہ خطاطی کا ایک نادر نمونه تھا، میں نے ابو محمد صاحب کو دکھلانے کے لئے پیش کیا تھا، لیکن انھوں نے واپس نہ کیا، اور ہدیه کے طور پر رکھ لیا۔ ماموں صاحب قبله مرحوم جن کی وہ ملکیت میں تھا کہنے بھی لگے که میاں وہ کسی کو دینے کی چیز نہیں تھی۔ یہ لکھتے وقت مولوی عبدالحق مرحوم کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو کتاب کسی کو عاریته" دینے کے متعلق مزاحیه انداز میں کہا کرتے تھے، کہ وہ شخص بےوقوف ہے جو کتاب کسی کو دیدے، اور جو اس کو واپس کردے وہ اس سے زیادہ بےوقوف ہے، اس اصول کے لحاظ سے ہم بےوقوفوں میں اور ابو محمد صاحب ہوشیاروں میں گنے جانے چاہئیں۔ خیر، یہ تو ایک لطیفه ہے جو دوسروں کی زبانی سنا، مگر یہ واقعه ہے که کتابیں دینے میں مولوی صاحب مرحوم زیادہ فراغ دل نہیں تھے، کراچی میں کچھ مدت کے لئے میں نے انجمن ترقی اردو میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا، مولوی صاحب صدر تھے، چند روز کے لئے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ایک جلد منگوالی، بادلِ ناخواسته مولوی صاحب نے اجازت تو دیدی مگر واپسی کے لئے متعدد

تقاضے کرکے اتنا مجبور کردیا که میں نے کام ختم ہونے سے پہلے ہی کتاب واپس کردی، تعجب کے ساتھ، اس لئے که بحیثیت اعزازی عہدے کے ساری لائبریری انجمن کی میری ہی نگرانی میں تھی، لیکن محنت اور مشقت سے جمع کی ہوئی نادر کتابوں کو نظر سے دور نہ ہونے دینا احتیاط کے تقاضے کے طور پر ہے که کتابیں محفوظ رہیں۔

ان ہی دنوں میں جب موسم گرما کی تعطیل تھی، میں نے علیگڈھ جاکر داخله لیا۔

باب چہارم

علیگڑھ

طالب علمی کے دو سال علیگڈھ نے شہرت تو سید احمد خان (م-۱۸۹۸) کی زندگی ہی میں حاصل کرلی تھی، اور برصغیر کے متعدد سربرآوردہ خاندانوں کے نوجوان وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے، قیام کانگریس (۱۸۸۵) کے بعد وہ مسلمانوں کے سب سے عظیم سیاسی رہنما کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کرچکے تھے، انھوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کے وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں بلکه خود اپنی قوت اور استحکام میں اضافه کرکے ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے باعزت زندگی بسر کریں، چند مسلمان اس اصول کے خلاف تھے، ان کا خیال تھا کے مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے که ہندوؤں سے مل کر آزادی کی جنگ لڑیں، ان کو یہ یقین نہیں آتا تھا که حصول آزادی کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کے مفادات کی

نگرانی ہرگز نہیں کریں گے ۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد بہت محدود تھی' اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ من حیثیت المجموع انہوں نے سید احمد خان کا بتلایا ہوا راستہ اختیار کیا اور اس وقت سے برابر ان کی سیاسی کوششوں کا رخ اسی طرف رہا کہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے ان کا تشخص مستقل اور مستحکم مقام حاصل کرے تاریخ میں اس تصور کا دوقومی نظریہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہی نظریہ بالاخر مطالبہ پاکستان کی بنیاد بن گیا' سید احمد خان کی وفات کو پچاس سال نہ گذرنے پائے تھے کے پاکستان کی خود مختار مملکت ایشیاء کے نقشہ پر رونما ہوگئی اور خدا کا شکر ہے کہ اب ایک مکمل اسلامی فلاحی ریاست کی تشکیل و تکمیل کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ تخلیق پاکستان کے بعد' مورخین ہی کو نہیں بلکہ ہر پاکستانی کو اس کا احساس ہوگیا ہے کہ دوقومی نظریہ پیش کر کے سید احمد خان نے قوم کو وہ راستہ دکھلایا جس کی آخری منزل حصول پاکستان تھی۔

تخلیق پاکستان سے ٹھیک پچیس سال قبل یعنی سنہ ۱۹۲۰ میں جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر کیا جاچکا ہے راقم الحرف نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اسی سال کے آخر میں سید احمد خان کا قائم کردہ ایم۔ اے۔ کالج ایک ایکٹ کے ذریعہ ترقی پا کر مسلم یونیورسٹی بن گیا' یونیورسٹی حاصل کرنے کے لئے مسلم لیڈروں کو انتھک اور طویل کوشش کرنا پڑی۔ یہاں اس اہم تحریک کا مفصل ذکر تو نہیں کیا جاسکتا لیکن چند واقعات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے[1]۔ ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی

خواہش جس کو الحاقی اختیارات ہر اس علاقہ پر حاصل ہوں جہاں مسلمان موجود ہوں مسلمانوں کو ابتدا ہی سے تھی' مگر برطانوی استعمار کی پالیسی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ خود مختار یونیورسٹی قائم کرسکیں' بہرحال آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۶) اور ۱۹۰۹ کے کونسل ایکٹ میں مسلمانوں کا حق جداگانہ انتخاب تسلیم کئے جانے کے بعد ان کی جدو جہد اور سیاسی شعور ترقی کی راہ پر گامزن ہوچکے تھے' چنانچہ یونیورسٹی کے مطالبہ کی تحریک میں متعدد مختلف الخیال لیڈروں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ہزہائی نیس آغا خان مرحوم کی قیادت میں ایک وفد نے جس میں مولانا شوکت علی بھی شامل تھے دورہ کیا اور بالاخر تیس لاکھ روپیہ کی رقم جس کی شرط حکومت نے لگائی تھی جمع کرلی۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اس تحریک کی سرپرستی کی اور ایک کثیر رقم بطور عطیہ خود بھی دی۔ تحریک کے لیڈروں میں دوگروپ ہوگئے تھے' راجہ صاحب محمودآباد' صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور ڈاکٹر ضیاء الدین کا خیال تھا کہ حکومت جن پابندیوں اور شرائط کے ساتھ یونیورسٹی دینے کو تیار ہے ان کو قبول کرلیا جائے۔ ان میں یہ شرط شامل تھی کے یونیورسٹی کے الحاقی اختیارات صرف علیگڈھ تک محدود ہوں گے۔ لیکن دوسرا گروپ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس پر اصرار کر رہے تھے کہ الحاقی اختیارات محدود نہیں ہونے چاہیں یہ اختلافات طویل عرصہ تک جاری رہے۔ اسی عرصہ میں ہندوؤں نے حکومت کی شرائط کے ساتھ بنارس ہندو یونیورسٹی کی پیش کش منظور کرلی اس کے بعد مسلمانوں نے بھی مصلحت اسی

میں دیکھی کہ ان ہی شرائط پر یونیورسٹی منظور کرلیں چنانچہ ۱۹۲۰ میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہوگیا اور فوراً ہی ایم۔اے۔او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوگیا۔

علیگڈہ کی مرکزی حیثیت

سید احمد خان کے زمانہ ہی سے علیگڈھ کالج نے شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی' سید صاحب کے انتقال کے بعد ان کے جانشین سکریٹریوں کو مسلم قوم کے نمایاں لیڈروں کی حیثیت حاصل رہی' ان کے بیٹے سید محمود ان کی زندگی ہی میں نامزد کئے جاچکے تھے ان کی نامزدگی کے سلسلہ میں سید احمد خان اور ان کے بعض رفقاء کار بالخصوص سلیم اللہ خان اور نواب وقارالملک کے درمیان بدمزگی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن وہ زیادہ مدت اس عہدہ پر قائم نہ رہ سکے اور یہ سلسلہ ناسازی مزاج ان کو سبکدوش ہونا پڑا۔ ان کے جانشین نواب، محسن الملک کے زمانہ میں کالج نے نمایاں ترقی کی۔ سید احمد خان کے وقت ہی سے مسلمانوں کی صرف تعلیمی ہی نہیں بلکہ سیاسی جدوجہد کا مرکز بھی علیگڈھ ہوگیا تھا' یہاں تفصیلات کا ذکر کرنے کی گنجائش نہیں لیکن چند واقعات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جن سے کسی حد تک یہ اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی کہ اس صدی کے پہلے بیس سال میں مسلمانوں نے من حیثیت القوم اپنا تشخص قائم کرنے میں کتنی ترقی کرلی تھی۔ کالج کی انتظامی اور اصلاحی کوششوں کے علاوہ نواب محسن الملک کے دور کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں نمایاں مقام حاصل کرچکے ہیں' یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اور جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا جانا' لیکن ان سے قبل اردو ہندی قضیہ کا ذکر بھی ضروری ہے[2]۔

اردو ہندی قضیہ

انیسویں صدی کے ربع آخر میں کانگریس کے علاوہ ہندو قومیت کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد کے سلسلہ مون بعض فرقہ وارانہ تحریکیں بھی وجود میں آئی تھیں جن کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے خیالات اور رویہ میں تعصب اور تنگ نظری کے عناصر اہمیت حاصل کرتے جارہے تھے۔ آریہ سماج کی مذہبی تحریک اور دکن میں گنگادھر تلک کی سرکردگی میں نیم سیاسی اور نیم مذہبی تحریکیں اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں کو ملچھ (ناپاک) اجنبی اور غاصب قرار دیا جارہا تھا۔ ان ہی کوششوں کا ایک شاخسانہ اردو ہندی قضیہ تھا' اس کی بنیاد فرقہ واریت میں تلاش کی جاسکتی ہے' ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر یہ مطالبہ شروع کردیا گیا کہ اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتی اور سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے' اس کے حصول کی کوششوں میں حقیقت اور تاریخ کو نظر انداز کردیا گیا' اس واقعہ سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ اردو کی ابتدا اور ترویج میں دونوں قوموں ہر حصہ تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان تو عربی تھی اور اسی سے تاریخی اور ثقافتی رشتوں کی بنیاد پر ان کو خصوصی لگاؤ تھا' لیکن اسلام کی رواداری اور "لا اکراہ فی الدین" کے زرین اصول کے نتیجہ میں مسلمان جس علاقے میں بھی گئے انہوں نے وہاں کی مقامی زبانوں اور ثقافت کی ترویج و ترقی میں پوری کوشش کی' اور بہت سی زبانیں ان ہی کو کوشش سے اپنے عروج کی آخری منزلوں تک پہنچیں مثلاً فارسی

زبان جس کو انھوں نے اسلامی دنیا کے شرقی ممالک کی دفتری و تہذیبی زبان بنا کر ایک نئی زندگی عطا کی۔ برصغیر میں علاقائی زبانیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں۔ یہاں ان کا یہ ایک عظیم کارنامہ تھا کہ ایک ایسی مشترک زبان کو جنم دیا اور ترقی کے لئے کوشش کی جو مختلف علاقوں میں سمجھی جاسکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے خط نستعلیق کا جو فارسی زبان کی نمایاں خصوصیت بن چکا تھا، انتخاب کیا گیا۔ اس کو مغلیہ دور حکومت میں ہندو اور مسلمان، دونوں قوموں نے اختیار کیا۔ لیکن جنگ آزادی سنہ (۱۸۵۷ء) کے بعد فرقہ واریت کی بڑھتی ہوئی قوتوں نے جن خطرناک تحریکوں کو جنم دیا ان میں اردو ہندی کا جھگڑا بھی تھا، ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ اردو کی طرح ہندی کو بھی جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی تھی عدالتی اور سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

برطانوی حکمرانوں کو جنھوں نے اپنی حکمت عملی کی بنیادیں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر بنانے اور اس طرح ان کو متحد ہونے سے روکنے پر رکھی تھی، اس مطالبہ میں ایک عمدہ موقع نظر آیا اور یوپی کے لفٹنٹ گورنر نے اس کو منظور کرلیا، اردو کی ترویج و ترقی کے راستہ پر یہ ایک زبردست حملہ تھا، چنانچہ محسن الملک نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور لکھنؤ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، برطانوی استعمار کو یہ کیونکر گوارا ہوسکتا تھا کہ ہندو مسلم تعلقات میں خلیج کو وسیع کرنے کا ایسے عمدہ موقع سے فائدہ نہ اٹھائے لفٹنٹ گورنر میکڈانل نے اقتدار کی روایتی ضد اور غرور پر عمل کرتے ہوئے سخت

رویہ اختیار کیا، محسن الملک کو دھمکی دی کہ ان کو کالج کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہونا پڑے گا ورنہ اردو کے دفاع میں جو کوشش کی جارہی ہے اس کو بند کیا جائے۔ وہ خود تو مستعفی ہوجاتے لیکن کالج کو اس سے ناقابل برداشت صدمہ پہنچتا، ان پر زور ڈالا گیا اور کالج کے مفاد میں وہ راضی ہوگئے کہ اس تحریک سے دستکش ہوجائیں۔ حکومت کا فیصلہ قائم رہا، اور ادبی اور سیاسی زندگی کی ایک قدیم روایت جس نے ہندو اور مسلم قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا دم توڑ گئی۔ اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ سید احمد خان کے بتلائے ہوئے دو قومی نظریہ کو ہندوؤں کی اس اردو دشمن تحریک سے قوت حاصل ہوئی۔ اگرچہ چند سال بعد ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ایک حد تک کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں اور بالاخر سنہ ۱۹۱۶ کے لکھنؤ پیکٹ [میثاق لکھنؤ] نے اس بیمار جسم میں کچھ مدت کے لئے نئی جان ڈال دی، لیکن مسلم قوم اس قضیئے کو بھول نہ سکی اور نہ ہی اس کے لئے تیار تھی کہ اردو کو ہندی نواز اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو جو اصولاً یک قومی نظریہ پر اعتقاد رکھتے تھے ہندی اردو کا جھگڑا اس اتحاد کے راستہ میں ایک رکاوٹ نظر آتا تھا اور یہ واقعہ بھی تھا کہ یک قومی نظریہ کے لئے مشترک زبان کی اہمیت بہت زیادہ تھی، گاندھی جی کی سرپرستی میں جو ہندو قوم کے لیڈر کی حیثیت شہرت حاصل کرچکے تھے اور خواہاں تھے کہ مسلمانوں کا اعتماد بھی ان کو حاصل ہوجائے یہ تحریک شروع ہوگئی کہ اردو اور ہندی کی بجائے ایک مشترک زبان

دونوں قومیں تسلیم کرلیں اور یہ زبان دونوں رسم الخط میں لکھی جاسکے۔ ہندی کی مقبولیت ہندوؤں میں اسقدر عام نہیں تھی جیسی کہ اردو کی مسلمانوں میں تھی۔ لہذا عملی نقطۂ نظر سے یہ تحریک اردو کو ختم کردینے کا ایک موثر ذریعہ بن سکتی تھی۔ بہرحال ان مسلمانوں نے جو کانگریس کے ہمنوا تھے اس کو خوش آمدید کہا، اس کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ ادارے بھی قائم کئے گئے جن میں یوپی کی ہندوستانی اکیڈمی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کانگریس نواز مسلمان سیاسی لیڈروں کے علاوہ بعض فضلاء اور ادیب بھی اس کے دوررس اثرات کا اندازہ نہ لگاسکے۔ بہت کم مسلمان ایسے ہوں گے جنھوں نے اردو کی اسقدر وسیع پیمانہ پر خدمت کی جیسی کہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاءکار اور ان کے ادارے یعنی دارالمصنفین اعظم گڈھ نے کی ہے، لیکن مولانا نے ہندوستانی کی ترویج میں عملی حصہ لیا، اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بظاہر ہندوستانی کی تحریک میں کوئی خطرہ اس لئے نظر نہیں آتا تھا کہ بہرحال اردو یعنی نستعلیق رسم الخط کو ختم نہیں کیا جارہا تھا۔ لیکن ہندو مسلم قوموں کی فطرتی تفریق کو زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا اور بالاخر وہ ختم ہوگئی، مگر اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اردو اور بالخصوص اردو (نستعلیق) رسم الخط سے ہندو تعلیمیافتہ طبقہ کی دلچسپی کم ہوتی گئی اور اس طرح وہ صرف مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی۔ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں جو عارضی، جذبات پر قائم ہوئی تھیں جلد ہی متزلزل ہونے لگیں اور اس کے ساتھ ہی اردو اور مسلم قوم کا تعلق اپنی خصوصیت میں گہرا ہوتا گیا،

تحریک پاکستان کے دوران حقیقت کھل کر نظر آنے لگی اور ہم جانتے ہیں کہ مسلمانان برصغیر کی اس عظیم تحریک کو آگے بڑھانے اور آخرکار کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں اردو کا کسقدر اہم کردار رہا، جن لوگوں نے حصول پاکستان کے لئے جدوجہد میں حصہ لیا ہے یا مسلم لیگ کے کارکنوں کی کوششوں کو کسی حیثیت سے بہ چشم خود دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ قوم کے افراد میں جذبات ایثار و جاں نثاری کو ابھارنے اور مستحکم کرنے میں اردو میں شایع ہونے والے سیاسی لٹریچر اور قومی نظموں نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ اس بات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں لیگ کے جتنے بھی جلسے ہوتے تھے اور ان میں عوام سے خطاب کیا جاتا وہاں تقریریں اردو ہی میں ہوتی تھیں، چنانچہ مطالبہ پاکستان کے تسلیم کئے جانے سے پہلے ہی یہ ایک امر بدیہی متصور ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کی نئی مملکت کی جس کا پاکستان کے نام سے وجود میں آنا یقینی تھا قومی زبان اردو ہی ہوگی۔[3] خدا کا شکر ہے کہ اب اردو پاکستان کی قومی زبان بن چکی ہے۔

بیسوین صدی کے ابتدائی سالوں میں دو نہایت اہم واقعات ہوئے جو قابل ذکر ہیں اور جن کا تعلق براہ راست علیگڈھ اور اس کے متعلیقین سے ہے، یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اور انتخاب جداگانہ کے اصول کا تسلیم کیا جانا۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ہندو قوم اپنے جذبہ فرقہ واریت سے سرشار لیڈروں کے اثر میں آچکی تھی اور سنہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد انہوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی،

مسلمانوں کا سیاسی شعور اب کافی آگے بڑھ چکا تھا اور ان کو یقین ہوگیا تھا کے اپنے تشخص کو برقرار اور مستحکم رکھنے کے لئے انقلابی اقدامات ضروری ھیں۔ ان میں سب سے اہم یہ خیال تھا کہ کانگریس کی طرح ان کو بھی اپنا ایک ادارہ قائم کرنا چاھئے۔ لیکن بعض وجوھات کی بناء پر یہ منصوبہ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اس سال کے ابتدائی مہینوں میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کے وہ ھندوستان کے لئے سیاسی اصلاحات کا ایک منصوبہ تیار کرنا چاھتی ھے۔ نواب محسن الملک نے جب یہ خبر پڑھی تو ان کو خیال پیدا ہوا کے اب موقع ھے کہ کوئی اہم قدم اٹھایا جائے۔ بعض شواھد سے معلوم ہوتا ھے کہ علیگڈہ کے ایک رئیس حاجی اسماعیل نے محسن الملک کو خط لکھ کر ان کو توجہ دلائی کے مسلمانوں کے لئے حق جداگانہ انتخاب حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاھئے، محسن الملک نے نواب وقارالملک سے رابطہ قائم کیا اور علیگڈہ کے کچھ سربرآوردہ مسلمانوں کا جلسہ ہوا جس میں طے کیا گیا کہ اس سلسلہ میں وائسرائے کے پاس ایک وفد جانا چاھئے، محسن الملک نے علیگڈہ کالج کے پرنسپل پروفیسر آرچبولڈ کو جو شملہ گئے ہوئے تھے خط لکھا کہ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے رابطہ قائم کرکے وائسرائے سے وفد کی ملاقات کے لئے اجازت لیں۔ آرچبولڈ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے نواب محسن الملک کو اس سلسلہ میں تفصیلی خط لکھا۔ اس عرصہ میں نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نے ایڈریس کا مسودہ تیار کرلیا۔ جو ایک نمائندہ میٹنگ میں پیش ہوا اور منظور کرلیا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ

ہز ہائی نس سر آغا خان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس وفد کی قیادت کریں، وہ بھی تیار ہوگئے۔

پہلی اکتوبر ۱۹۰۶ء کو یہ عظیم وفد جس میں مسلمانوں کے ستر نمائندہ لیڈر شریک تھے، وائسرائے سے ملا۔ ایڈریس کے جواب میں جس میں متعدد مطالبات شامل کئے گئے تھے، وائسرائے نے کہا کہ وہ جداگانہ انتخاب کے مطالبہ سے متفق ھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈیا کونسل ایکٹ کے ذریعہ جب سنہ ۱۹۰۶ء میں اصلاحات کی نئی قسط کا اعلان کیا گیا تو اس میں جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا تھا، مسلمانوں کی تاریخ یہ واقعہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ھے۔ ھندو لیڈروں کے ایک طبقہ نے اس کی مخالفت کی لیکن بالاخر کانگریس نے بھی اس اصول کو تسلیم کرلیا، اور سنہ ۱۹۱٦ء میں لکھنؤ پیکٹ کے ذریعہ دونوں قوموں کے نمائندوں نے اس پر مہر (قبولیت) ثبت کی، اس کے بعد ھندو مسلم اتحاد کی تحریک کو کچھ استحکام حاصل ہوا اور تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانہ میں یہ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ مگر یہ عارضی ثابت ہوئی اور سات آٹھ سال بعد ہی اس میں شگاف پڑنے شروع ہوگئے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دو قومی نظریہ کی عملی تشکیل کی یہ پہلی منزل تھی اور جیسا کہ آغا خان نے اپنی یاد داشتوں (میمائرز)[4] میں ذکر کیا ھے اس کا لازمی اور آخری نتیجہ تخلیق پاکستان تھا، ھندو مورخین کی اکثریت اس کو کمانڈ پرفارمینس (Command performance)[5] یعنی تکمیل حکم کہتے رھے ھیں اور کہتے رھیں گے۔ ایک طویل مدت تک ھندو سیاست داں اور

مصنفین یہی پروپاگنڈا کرتے رہے کے مسلمانوں کے وہ لیڈر جو
علیگڈھ سے منسلک تھے' برطانوی حکومت کے خوشامدی تھے' اور
اسی کے اشارے پر انہوں نے وفد بھیجنے کا اہتمام کیا تھا' اس
خیال سے بعض مسلمان لیڈر بھی اتفاق کرتے رہے۔ ان میں ابتدائی
دور میں بدرالدین طیب جی اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد،
مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دوسرے علماء جو جمعیت العماء
ہند سے منسلک تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ
ہے (اور اس کو مورخین نظرانداز کرتے رہے ہیں) کہ سید احمد خاں
کے زمانہ سے ہی دو قومی نظریہ، مسلمانوں کے سیاسی تصورات اور
مقاصد کے لحاظ سے برابر مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ
ان کے مستقبل کا لائحہ عمل بھی سہی سمت میں متعین ہورہا تھا کے
ان کو اپنے حقوق اور تشخص کے لئے خود کوشش کرنا چاہئے اور
ان کو یقین ہوگیا تھا کے نہ حکومت ان کے حقوق کی حفاظت
کرسکتی ہے اور نہ کانگریس' اس کا بھی اندازہ ان کو ہوگیا تھا
کے اپنے نصب العین تک پہچنے کے لئے ایک حد تک حکومت سے
تعاون ضروری ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی
قوت اور حکومت کے خلاف کانگریس کی تحریک کا زور کم کرنے
کے لئے مسلمانوں کی تنظیم اور ان میں سیاسی شعور کا استحکام
موثر کردار ادا کرسکتے تھے' اسی وجہ سے برطانوی حکومت نے
اپنی اس مسلم کش حکمت عملی میں جو انقلاب سنہ ۱۸۵۷ کے
بعد سے شروع ہوئی تھی کچھ نرمی شروع کردی تھی' اس دور
کی سیاسی تاریخ کی یہی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ کانگریس
کی پالیسی نے ان کو مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنی جد و جہد آزادی

کی جنگ دو محاذوں پر لڑنے کی تیاری کریں۔ ان کی حصول آزادی
کے لئے برطانوی حکومت کے علاوہ کانگریس کے خلاف بھی
جدو جہد ضروری تھی' ان حالات کا لازمی نتیجہ یہی تھا کے بعض
مسائل میں ایک حد تک حکومت سے تعاون کیا جائے اور آخری
منزل یعنی حصول پاکستان تک یہی طریقہ کار قائم رہا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء

سید احمد خان کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے اس احساس
میں شدت پیدا ہوئی تھی کے اپنی علیحدہ ایک تنظیم قائم کرنا
ضروری ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں ۲۱-۲۲ اکتوبر
سنہ ۱۹۰۱ء کو ایک جلسہ سید شرف الدین بیرسٹر پٹنہ کی صدارت
میں ہوا' نواب وقارالملک نے ایک مدلل تقریر کی اور لوگوں نے
ان کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ ایک علیحدہ تنظیم کا وجود
عمل میں آنا چاہئے۔ لیکن بعض حالات کی بناء پر یہ تجویز عملی
جامہ نہیں پہن سکی' پانچ سال بعد جب مسلمان لیڈروں کو وفد
کی شکل میں شملہ میں جمع ہونے کا موقع ملا تو انہوں نے اس سے
فائدہ اٹھا کر اس پر تفصیلی غور کیا' بعد میں نواب ڈھاکہ سر
سلیم اللہ خان نے کچھ تجاویز (notes) تیار کر کے شایع کئے'
چنانچہ سنہ ۱۹۰۶ء میں دسمبر کے آخری ہفتہ میں جب مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا تو اسی
موقع پر نمائندہ مسلم لیڈروں کی ایک میٹنگ نواب وقارالملک
کی صدارت میں ہوئی اور اس میں آل انڈیا مسلم لیگ نام سے
ایک ادارے کے قیام کی تجویز منظور کی گئی' محسن الملک اور

وقار الملک دونوں کو جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا اور نئے ادارے کا دستور تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی تشکیل کی گئی، ایک سال بعد یعنی دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء میں کراچی میں لیگ کا باقاعدہ اجلاس ہوا، جس میں کمیٹی کا پیش کردہ دستور منظور کرلیا گیا، پھر یہی ملتوی شدہ اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو مزمل ہاس علیگڈھ میں شاہ دین (لاہور) کی صدارت میں ہوا، چونکہ محسن الملک کی وفات (اکتوبر سنہ ۱۹۰۷) کے بعد وقار الملک علیگڈھ کالج کے سکریٹری منتخب ہوگئے تھے انھوں نے لیگ کی سکریٹری شپ قبول کرنے سے معذرت کی چنانچہ سید حسین بلگرامی کو سکریٹری اور ہزہائی نس آغا خان کو صدر منتخب کیا گیا۔

جنگ بلقان

تعلیمی نقطہ نظر سے تو علیگڈھ کالج ترقی کرھی رہا تھا، لیکن سید احمد خان اور محسن الملک کی وجہ سے جو مسلمانوں کے سیاسی لیڈر بھی تھے، یہ کالج تعلیمی ادارہ ہونے کے علاوہ سیاسی دلچسپیوں کا بھی مرکز بن گیا تھا، نواب وقار الملک کی سرپرستی میں اس کی یہ حیثیت زیادہ ممتاز ہوگئی۔ اگرچہ کہ انھوں نے لیگ کے سکریٹری کا عہدہ قبول نہیں کیا تھا، پھر بھی سیاسی زندگی میں ان کے مشورے مختلف طریقوں سے اثرانداز ہو رہے تھے۔ اور اس دور کے وہ ایک ممتاز لیڈر سمجھے جاتے تھے، سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء خلافت عثمانیہ کو دو جنگیں لڑنا پڑیں، یورپ کی کی عیسائی قومیں سلطنت ترکیہ کے ہمیشہ سے خلاف تھیں اور

ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ہر طریقہ سے اس کی قوت کو کمزور کیا جائے، اور اس طرح ایک مسلم مملکت اور مسلموں کو متحد رکھنے والا ایک اہم ادارہ یعنی خلافت غیر موثر ہوکر رہ جائے لیکن سیاسی شعور ابھرنے کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں میں اتحاد اسلام (pan Islamism) کا تصور بھی مستحکم ہورہا تھا، خلافت عثمانیہ سے ان کی عقیدت دن بہ دن بڑھ رہی تھی، اس کا نمایاں اظہار اس تحریک میں نظر آتا ہے جو ان لڑائیوں کے دوران یہاں چلائی گئی، جنگ بلقان سنہ (۱۹۱۲ء) کے موقع پر مختلف مقامات پر جلسے ہوئے جن کے ذریعہ حکومت برطانیہ پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو ترکیہ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دینا چاہئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ برطانیہ کی پالیسی اس سے کس حد تک متاثر ہوئی، لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے جس زور شور سے اپنے جذبات کا مظاہرہ کیا وہ ان کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ انھوں نے فراخدلی سے چندے جمع کئے اور ایک میڈیکل مشن بھی بھیجا، جس کے لئے سب سے زیادہ کوشش مولانا محمد علی نے کی جو علیگڈھ کے ایک ممتاز اولڈ بوائے تھے، طلبہ کے جوش کی بھی یہ انتہا تھی کہ انھوں نے اپنے کھانے میں گوشت کو ختم کردیا تھا، تا کہ اس سے جو کچھ بچت ہو وہ بطور چندہ ترکی بھیج دی جائے۔

تحریک خلافت

دو سال بعد یعنی سنہ ۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور سلطنت ترکیہ نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا

ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر لندن ٹائمز میں چوائس آف دی ٹرکس کے عنوان سے ایک مقالہ شایع ہوا' جواباً مولانا محمدعلی جوہر نے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں اسی عنوان سے مقالہ شایع کیا' جس نے سیاست اور صحافت کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے' حکومت برطانیہ نے محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی کو خطرناک لیڈر تصور کرکے نظر بند کردیا' ان کی نظر بندی سے ایک سال پہلے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سرکردگی میں ایک نئے ادارے کا قیام عمل میں آیا (یعنی انجمن خدام کعبہ) برطانوی حکومت چاہتی تھی کے مسلمانوں کی وفاداری کے لئے ضمانت مہیا ہونی چاہئے' کمشنر لکھنؤ نے سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک میٹنگ بلائی اور مولانا عبدالباری سے بھی کہا کہ اس میں شریک ہوں انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ حکومت اعلان کرے کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کردیا گیا' لیکن اس کے بعد علی برادران کی نظر بندی نے حالات کا رخ بدل دیا۔

جنگ کا زور اور پھیلاؤ بڑھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں آزادی کی جدو جہد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لکھنؤ پیکٹ سنہ ۱۹۱۶ء کے بعد ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ کوششیں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ لڑائی کے ابتدائی دور میں اتحادیوں کی پوزیشن کمزور ہوگئی تھی' چنانچہ انگریزوں کی پالیسی نرم تھی اور انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی طرف نرم رویہ اختیارکیا بعد میں اتحادیوں کی کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو سختی کی پالیسی اختیار کی جس کا نمایاں ثبوت سنہ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ

کا پاس ہونا تھا۔ مسلمانوں کو بھی یقین ہونے لگا تھا کے حکومت برطانیہ کے وعدوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا اور خلافت اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ موثر اقدامات کئے جائیں۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں عارضی صلح (armistice) ہونے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ حکومت برطانیہ اپنے ان وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں جو مقامات مقدسہ کی حفاظت کے سلسلے میں کئے گئے تھے' چنانچہ مسلمان لیڈروں نے موثر اقدامات شروع کرنے کا تہیہ کیا۔ سب سے پہلا قدم بمبئی کے چند سیٹھوں نے اٹھایا اور ایک مجلس خلافت قائم کی لیکن یہ زیادہ فعال نہ بن سکی' جلد ہی مولانا عبدالباری نے سربرآوردہ مسلمان لیڈروں کی ایک میٹنگ لکھنؤ میں بلائی اس میں منجملہ اور نمایاں لیڈروں کے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرینس میں (سنہ ۱۹۱۹ء) آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا پہلا کھلا اجلاس ۲۴ نومبر کو دھلی میں مولوی فضل الحق (ف ۱۹۶۲ء) کی صدارت میں ہوا۔ اس میں کئی اہم ریزولیوشن پاس ہوئے جن میں اہم ترین یہ تھا اگر حکومت برطانیہ حفاظت مقامات مقدسہ کے سلسلہ میں موثر اقدامات نہ کرے تو ترک موالات کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس موقع پر گاندھی جی بھی موجود تھے اور انہوں نے یقین دلایا کہ وہ ہندو لیڈروں کو تیار کریں گے کہ تحریک خلافت میں حصہ لیں' اور جیسا کہ مورس فرانکس نے جواھرلال نہرو کی سوانح حیات میں ذکر کیا ہے اسی ریزولیوشن سے گاندھی جی کے ذھن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ترک موالات کی تحریک برطانوی

حکومت پر اثر اور دباؤ ڈالنے کا موثر طریقہ ثابت ہوسکتی ہے۔ جمعیت العلماء ہند نے جس میں زیادہ تر دیوبند کے علماء شریک تھے ایک خصوصی اجلاس میں اسی قسم کا ریزولیوشن پاس کیا۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند، سب نے اپنے اجلاس امرتسر میں منعقد کئے، علی برادران نے بھی جو جیل سے آزاد ہوکر سیدھے یہاں پہنچ گئے تھے ان اجلاس میں شرکت کی، اسی موقع پر مولانا محمد علی نے جن کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا تھا اپنے یہ مشہور الفاظ کہے تھے کہ ہم تو چھندواڑہ جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آئے ہیں۔ خلافت کانفرنس نے دو اہم فیصلے کئے، ایک تو یہ کہ ایک وفد وایسرائے کے پاس جاکر خلافت اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات کی اہمیت پر زور دے اور دوسرا یہ کہ ایک وفد محمد علی کی سربراہی میں انگلستان بھیجا جائے۔ چنانچہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ کو ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک وفد جس میں ہندو لیڈر بھی شریک تھے وائسرائے سے ملا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے کہا کہ وہ کوشش تو کریں گے لیکن ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ کے حصے کرنے اور اس کی قوت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں یورپ کی عیسائی حکومتوں نے جنگ کے دوران کئی خفیہ معاھدے کرلئے تھے۔ ان کا ذکر خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب ”کانفلکٹ آف ایسٹ اینڈ ویسٹ ان ٹرکی“ میں کیا ہے۔ برطانوی حکومت کے ارباب اقتدار جانتے تھے کہ عراقی علاقوں جو عرب سرداروں کا اقتدار ان کے ذریعہ اور ان ہی کی سرپرستی میں قائم کیا جاچکا ہے اس میں تبدیلی ممکن

نہیں، لیکن پھر بھی سیاسی چالبازیوں کا یہی تقاضا تھا کہ مسلمان لیڈروں کے سامنے دل خوش کرنے والی باتیں کہی جائیں۔ اتفاق سے برطانیہ میں اس وقت لائیڈ جارج وزیراعظم تھے اور اس فن میں وہ اچھی دسترس رکھتے تھے، چنانچہ مولانا محمد علی کی سرکردگی میں جو وفد یورپ اور انگلستان گیا اس کو بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

ترک موالات اور جامعہ ملیہ کا قیام

محمد علی کی عدم موجودگی میں مولانا عبدالباری اور مولانا شوکت علی نے تحریک خلافت کو بہت زیادہ آگے بڑھایا۔ انہوں نے وسیع پیمانہ پر دورے کئے اور ۲۸ مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں خلافت کمیٹی کا ایک اہم جلسہ کیا جس میں ترک موالات کی تحریک کا باقاعدہ ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ چند ماہ بعد کلکتہ میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے خصوصی اجلاس ہوئے۔ گاندھی جی کی کوشش سے بعض بااثر لیڈروں کی مخالفت کے باوجود جن میں مسز بیسنٹ، موتی لال نہرو اور سی۔ آر داس قابل ذکر ہیں، ترک موالات کا ریزولیوشن پاس ہوگیا۔ مسلم لیگ نے بھی اپنے اجلاس میں اس کو منظور کرلیا۔ اکتوبر میں خلافت کا وفد ناکام واپس آگیا، محمد علی جوہر اب حد سے زیادہ برطانوی حکومت کے خلاف ہوگئے تھے، انہوں نے تحریک خلافت میں نئی روح پھونک دی۔ دسمبر میں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں ہوا اور محمد علی اور گاندھی جی کی کوششوں سے اس میں ترک موالات کا ریزولیوشن پاس ہوگیا۔

ترک موالات کے پروگرام کا ایک نمایاں حصہ تعلیمی اداروں
سے متعلق تھا جس میں یہ اپیل کی گئی تھی کہ حکومت سے اداروں
کے لئے امداد نہ لی جائے اور اگر ان کے ارباب اقتدار اس کو نہ
مانیں تو طلبہ تعلیم ترک کر کے اپنے گھروں کو چلے جائیں' اس
سلسلہ میں علیگڈھ خاص طور پر قابل ذکر ہے' مولانا محمد علی
اور دوسرے لیڈر یہاں بھی پہنچے۔ کالج کے ٹرسٹیز نے ان کی اپیل
مسترد کردی اور حکام کی مدد سے ان کو کالج کے احاطہ سے باہر
جانے پر مجبور کیا' چونکہ طلبہ کی بڑی تعداد نے کالج چھوڑنے پر
آمادگی ظاہر کی اس لئے مولانا محمد علی کی کوششوں سے کالج کے
نزدیک کچھ مکانات حاصل کر لئے گئے۔ اور خیمے لگائے گئے۔ ان
میں ایک نئی قومی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی' جس کو جامعہ
ملیہ کا نام دیا گیا' مولانا محمد علی اس کے خود سربراہ تھے اور
کچھ عرصہ تک وہ پڑھاتے بھی رہے' بعد میں ادارہ دہلی منتقل
ہو گیا اور بالآخر ایک مستقل یونیورسٹی بن گئی جسے آج بھی بھارت
کے ممتاز ترین تعلیمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی

سیاسی کشمکش اور ہنگامہ خیزی کے اسی دور میں ایم اے او
کالج کو نئے ایکٹ کے تحت مسلم یونیورسٹی بنادیا گیا جس کے پہلے
وائس چانسلر راجہ صاحب محمودآباد اور پہلے پرووائس چانسلر ڈاکٹر
ضیاء الدین تھے' مسلم یونیورسٹی کی تشکیل سے سارے برصغیر کے
مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا تھا اور دور دور سے طلبہ
وہاں آکر داخل ہورہے تھے' چونکہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی

کوششوں سے یونیورسٹی کو میٹرک کے امتحان میں پرائیوٹ طلبہ
کو شرکت کرانے کی اجازت مل گئی تھی' اس لئے بہت سے طلبہ
دور دراز علاقوں سے آکر یہاں امتحان دیتے تھے اور ان میں
سے بڑی تعداد اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے یہیں داخلہ لے لیتی
تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے متعدد وظیفوں کا بھی انتظام کیاجاتا
تھا اور خوش حال گھرانوں کے علاوہ متوسط طبقہ کے بھی طلبہ
کافی تعداد میں آنے لگے تھے۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۰ء سے برابر تعداد
بڑھ رہی تھی۔ غرضیکہ علیگڈھ نے مسلمانوں میں بڑی مقبولیت
حاصل کرلی تھی اور ہر طالب علم کو خواہش ہوتی تھی کے
وہاں جا کر تعلیم حاصل کرے۔ یہی خواہش میرے دل میں بھی
تھی اور میں چاہتا تھا کہ بی اے پاس کرنے کے بعد ایل ایل بی
کی تعلیم کے لئے علیگڈھ جاؤں۔

مسلم یونیورسٹی میں داخلہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴

بہرحال سنہ ۱۹۲۲ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان
پاس کیا تو یہ ممکن نہ ہوسکا اور بزرگوں کے تعمیل ارشاد میں
میرٹھ کالج میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا' لیکن اس سے دلچسپی
نہ ہونے کی وجہ سے قانون کی پڑھائی کی طرف قطعی توجہ نہ دی
بلکہ فیض عام اسکول میں بھیا بشیرالدین مرحوم کی وساطت سے
پہلے تو اعزازی اور بعد میں باقاعدہ ٹیچری کرلی۔ دو سال اسی طرح
گذار دئے۔ اسی دوران مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس
میں جو علیگڈھ میں منعقد ہوا' اپنے دو عزیز دوستوں یعنی
ارشاد علی خان مرحوم اور وحیدالرحمٰن عرفانی کے ساتھ میں بھی

علیگڈھ گیا' اس سے علیگڈھ میں داخلہ کا شوق بہت زیادہ بڑھ گیا اور میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ یونیورسٹی میں داخلہ لونگا۔ چنانچہ گرما کی تعطیل میں میں نے والد صاحب قبلہ مرحوم کو راضی کرلیا کہ میں علیگڈھ چلا جاؤں۔

ہوسٹلوں میں رہائش زندگی کی خصوصیات

یونیورسٹی میں داخلہ ایسے طلبہ کے لئے ایک مرحلہ تھا جن کہ خاندان بہت زیادہ خوشحال نہ تھے' اور ہمارے خاندان کا شمار بھی اسی زمرہ میں تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں قیام و طعام کا انتظام بورڈنگ ہاؤس میں کرنا ہوتا تھا' اور حقیقت یہ ہے کہ علیگڈھ میں تعلیم کی سب سے نمایاں خصوصیت بھی یہی تھی' اس کے بانی اور ارباب حل و عقد بجا طور پر اس کو بہت اہمیت دیتے تھے' اور اس کے فوائد پر یہاں بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس میں شک نہیں کہ ہوسٹلوں میں قیام سے طلبہ کو اپنے اساتذہ کے قریب آنے اور ان کی تربیت سے فائدہ اٹھانے کے بہت زیادہ مواقع ملتے تھے' جس کے نتیجہ میں ان کے خیالات میں وسعت اور اطوار میں شائستگی کا عنصر نمایاں ہوجاتا تھا غالباً یہ دعویٰ بھی غلط نہیں کہ تعلیم و تربیت کا یہ پہلو یعنی ہوسٹلوں میں رہائش کا طریقہ اسقدر کامیاب کہیں نہیں ہوا جتنا علیگڈھ میں تھا' اس کا سبب منتظمین اور اساتذہ کی اس مسئلہ میں غیر معمولی اور عملی دلچسپی تھی۔ یہ تو کہنا شاید مبالغہ ہوگا کہ وہ اپنے شاگردوں کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا برتاؤ ہمدردانہ ہی نہیں بلکہ مشفقانہ ہوتا

تھا۔ اس کے علاوہ ہوسٹلوں کی رہائش کا ایک عظیم اور دیرپا فائدہ یہ تھا کہ مختلف مقامات سے آئے ہوئے طلبہ میں چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ اور ایک ہی ماحول میں رہنے سے اخوت ہم آہنگی اور بڑی حد تک ہمرنگی کے گہرے جذبات پیدا ہوجاتے تھے' دکھ اور بیماری میں ایک دوسرے کی خدمت کرنے سے اچھی طرح معاشرتی و عملی زندگی کی تربیت ان کو حاصل ہوجاتی تھی' اچھی ہمسائگی کی ان خصوصیات کے علاوہ مساوات یکسانیت کا بھی سبق ملتا تھا۔ صوم و صلٰوۃ کی پابندی کرانے کی بھی کوشش کی جاتی تھی، مسجد میں جو ایک عالی شان عمارت کی شکل میں آج بھی موجود ہے بہت زیادہ تو نہیں لیکن خاصی تعداد طلبہ کی نماز ادا کرتی، غیرحاضری پر جرمانہ بھی کیاجاتا اور پریفر مانیٹرز کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے اپنے ہوسٹلوں کے طلبہ کی رجسٹروں میں حاضری درج کریں۔

مسجد کے علاوہ ڈائننگ ہال میں سب جمع ہوکر ایک ہی جگہ کھانا کھاتے۔ ظاہر ہے کہ یہاں تو حاضری مکمل ہوتی اور مخصوص حالات ہی میں کھانا کمروں پر منگایا جاسکتا تھا۔ ڈائننگ حال' بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کی دلچسپ اور نمایاں خصوصیت تھی' یہاں سب کو ایک جگہ جمع ہونے' بےتکلفانہ باتیں کرنے اور ایک دوسرے سے قریب آنے کے مواقع ملتے تھے' کھانے پر تفصیلی تبصرہ کرنا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ دونوں وقت اور روزانہ ایک ہی انداز اور کم و بیش ایک ہی مزے کا کھانا کھاتے کھاتے طبعیت اکتا جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کے ہر زمانہ میں ڈائننگ ہال کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا،

کبھی کبھی اسٹرائک بھی ہوتے تھے، جن سے دلچسپ اور اکثر
پریشان کن صورت حال رونما ہوتی۔ ہفتہ میں ایک روز یعنی
دوشنبہ کو بریانی اور جمعہ کو کوئی میٹھی ڈش ہوتی تھی.
اس میں اکثر شاہی ٹکڑے ہوتے تھے اور ان کے لئے علیگڈھ
مشہور ہوگیا تھا۔ ایک اور خصوصیت جس کا ذکر ضروری ہے،
طلبہ کی یونی فارم تھی۔ یہ سیاہ شیروانی، سفید پاجامہ اور ترکی
ٹوپی یعنی سرخ رنگ کی وہ ٹوپی جس کا رواج ترکیہ میں اس
صدی کے ابتدائی دور تک رہا۔ یونی فارم کے دو فائدے تھے،
ایک تو علیگڈھ کے طالب علم کو پہچاننے میں دقت نہ ہوتی تھی،
دوسرے امیر اور غریب خاندانوں کے طلبہ کے لباس میں کوئی
فرق نہیں معلوم ہوتا تھا اور کردار میں یکسانیت پیدا کرنے کا یہ
بہترین طریقہ تھا، طلبہ کے اجتماعات کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں
کہہ سکتا تھا کہ ان میں پشاور سے مدراس تک اور بمبئی سے
آسام تک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالب علم موجود ہیں،
شاید سب سے زیادہ اہم نتیجہ ہوسٹلوں میں رہائشی زندگی کا یہ
تھا چونکہ اردو علیگڈھ کی عام زبان تھی وہ لوگ بھی جن کی وہ
مادری زبان نہ تھی اس کو اچھی طرح بولنے لگتے تھے، لہجوں اور
انداز میں ضرور فرق ہوتا تھا۔ لیکن سب کو اردو بولنے کی مشق
ہوتی تھی۔ علیڈہ یونیورسٹی سے میرا تعلق بحیثیت طالب علم،
استاد اور وارڈن اکتوبر ۱۹۲۳ سے مارچ ۱۹۴۸ تک رہا اور اس
طویل عرصہ میں اس کی خوبیاں اور مشکلات کا اندازہ لگانے کا ہر گوشے
اور ہر سے نقطہ نظر سے بہت اچھا موقع ملا ہے اس لئے اس موضع
پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے ان ہی چند

اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ امر ضرور ذکر کے قابل ہے کہ
یہاں کی زندگی سے جو جذبہ علیگڈھ سے انسیت اور وہاں کے
طالب علموں سے ذاتی ملاقات نہ ہونے کے باوجود پیدا ہوجاتا
تھا وہ یقیناً تعجب انگیز ہے۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے علیگڈھ کی رہائشی زندگی
کی جن خصوصیات کی طرف اشارات کئے گئے وہ وہاں کی چوبیس سالہ
سکونت کی بنیاد پر کئے گئے ہیں۔ جس وقت وہاں داخلہ لینے کی
کوشش کی جارہی تھی مجھے ان تمام باتوں سے واقفیت نہ تھی
ہاں ہر تعلیمیافتہ مسلمان کی طرح میرے دل میں بھی اس کی
کشش اور اہمیت کا دھندلہ سا تصور یہی تھا کہ اس کو مسلمانوں
کے تمام علمی اداروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مقبولیت اور مرکزیت
حاصل ہے، ان ہی خیالات نے دل میں وہاں جاکر تعلیم حاصل کرنے
کا شوق پیدا کردیا تھا۔

آفتاب احمد خان

دادی صاحبہ مرحومہ کی عمر ہمارے بچپن یعنی اس صدی
کے ابتدائی دور میں سو سال سے زیادہ ہوچکی تھی، وہ اکثر ہم لوگوں
خاندانی روایات اور قصے سنایا کرتی تھیں، وہ بصارت سے محروم
ہوچکی تھیں لیکن اتنی عمر کے باوجود ان کی تندرستی اچھی تھی
اور مجھے یاد نہیں کہ وفات سے قبل وہ کبھی بیمار ہوئی ہوں۔
ان کے بیان کردہ واقعات اور کہانیوں میں جنوں سے لیکر چوروں
تک اور پیغمبروں اور بزرگان دین سے لے کر اپنے اجداد تک کے
قصے ہوتے تھے۔ ان میں اکثر تو یقیناً قصے ہی ہوتے تھے، لیکن بعض

اوقات صحیح روایات اور واقعات کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ روایات جو ان سے ہم تک پہنچی ہے خاصی دلچسپ تھی۔ دادا صاحب قبلہ (سید ظہورالحق) جیسا کہ باب اول میں بیان کیا گیا ہے اور بوعلی شاہ قلندر کے مزارات پرگوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے مزارات معتقدین نے کئی مقامات پر بنائے تھے، ان میں ایک مزار ریاست کنجپورہ[6] میں بھی تھا، اور وہ یہیں اسی مزار پر رہتے تھے۔ کنجپورہ اور قریب و جوار کے علاقہ میں رہنے والے کافی لوگ ان سے بیعت ہوگئے تھے۔ ان کے ایک مرید اسد علی خان کو میں نے بھی دیکھا تھا، اس لئے کہ وہ پابندی سے ہرسال مخدوم علاءالدین احمد صابر کلیری رح کے عرس میں آتے تھے، والد صاحب قبلہ کو دیکھ کر فوراً قدموں پر گرجاتے تھے، اور رئیس ہونے کے باوجود انتہائی عجز اور خاکساری سے ملتے تھے، دادا صاحب قبلہ کی تعریف اور ذکر میں رطب اللسان رہتے تھے، ایک اور مرید نے جو زیادہ خوشحال نہ تھے اپنے ایک لڑکے کو دادی صاحب کی خدمت کے لئے مرادآباد بھیج دیا تھا اس کا نام ظہوری، دادا صاحب کے نام کی نسبت سے رکھا گیا تھا، دادی صاحبہ مرحومہ کو تو زیادہ خدمت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو زیادہ وقت اپنے بستر یا جائے نماز پر گذارتی تھیں، لیکن ظہوری ہمارے کھیل کے ساتھی ہوگئے تھے، دادی صاحبہ کے انتقال کے بعد وہ کنجپورہ واپس چلے گئے، دادا صاحب کے ان ہی مریدوں میں ایک غلام احمد خان تھے۔ یہ نواب نجابت خان کی اولاد میں تھے اور ریاست کنجپورہ میں حصہ دار بھی تھے۔ لیکن نواب صاحب جو ریاست کے منتظم تھے اور جن کا نام مجھے یاد پڑتا ہے

ابراهیم علی خان تھا، ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے، نجابت خان کی اولاد اور خاندان کے لوگ ہمارے دادا کے دادا یعنی سید محمد پیر اشرف صاحب رح کے زمانے سے اس خاندان سے عقیدت رکھتے تھے جس کی وجہ دادی صاحبہ مرحومہ یہ بیان کرتی تھیں کہ اس دور کا نواب پاگل ہوگیا تھا، اور میاں پیر اشرف صاحب کی دعا سے اس کو افاقہ ہوا تھا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ رؤساء کنجپورہ اس خاندان کے اس وقت سے معتقد تھے، ابراهیم علی خان کو بھی دادا صاحب قبلہ سے بے حد عقیدت تھی اور شاید وہ مرید بھی تھے، والد صاحب قبلہ یعنی سید شاہ مجیب الحق شاہ رح فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ کنجپورہ دادا صاحب کی خدمت میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ابراهیم علی خان کو حضرت سے کسقدر عقیدت تھی، وہ روزانہ گوشت، شکر، گھی، چاول وغیرہ روزانہ پابندی سے ان کی خدمت میں بھجواتے، لیکن دادا صاحب اس کو استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کرادیتے۔

غلام احمد خان کے تعلقات، ابراهیم علی سے خوشگوار نہیں تھے اور وہ ریاست کی آمدنی میں ان کا حصہ دینے میں تاخیر کرتے اور ان کو پریشان کرتے تھے۔ غلام احمد خان اپنی ان مشکلات کوحل کرنے کے لئے دادا صاحب کی خدمت میں عرض کراتے اور اور نواب سے سفارش کراتے تھے۔ غلام احمد خان نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں اپنے بعض دوسرے عزیزوں کے ایک رسالہ میں سوار کی حیثیت سے نوکری بھی کرلی تھی، ایک دفعہ دادا صاحب نے ان سے کہا کہ وہ رسالہ کی نوکری چھوڑدیں اور کنجپورہ سے ترک وطن کر کے چلے جائیں اور کسی دیسی ریاست میں جا کر ملازمت

کرلیں ۔ غلام احمد خان نے اپنے پیر کے اس ارشاد پر عمل کیا، پہلے ٹونک گئے اور پھر گوالیار، جہاں انہوں نے استقدر ترقی کی کے بالاخر مادھوجی سندھیہ کی ریجنسی کونسل کے ممبر ہوگئے۔ غلام احمد خان کو کنجپورہ چھوڑے ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کے سنہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب شروع ہوگیا اور اس رسالہ کے جو کنجپورہ میں مقیم تھا اکثر لوگ جن میں غلام احمد خان کے عزیز بھی شامل تھے قتل ہوگئے' غلام احمد خان اور ان کے اہل خاندان معجزانہ طور پر اس عظیم حادثہ سے بچ جانے اور غیر معمولی عروج حاصل کرنے کو اپنے پیر کی کرامت سے منسوب کرتے تھے' دادی صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ غلام احمد خان کی بیوی (شاید اس زمانہ میں جب وہ آفتاب احمد خان کے ساتھ علیگڈہ میں رہتی تھیں) اظہار عقیدت مندی کے پیغامات بھیجتی تھیں ۔ یہ بھی ذکر کیا جاسکتا ہے کہ غلام احمد خان کے دونوں بیٹوں نے بہت عروج پایا کیونکہ دونوں کو ان کے والد نے علیگڈہ کالج اور انگلستان میں اعلیٰ تعلیم دلائی تھی' بڑے صاحبزادہ یعنی سلطان احمد گوالیار میں وزیر ہوئے اور سر کا خطاب حاصل کیا' آفتاب احمد خان نے علیگڈہ میں بیرسٹری کی اور اس میں بہت شہرت حاصل کی' بعد میں یہاں ایک کوٹھی (آفتاب منزل) بنالی۔ ۱۹۱۷ میں ان کو انڈیا کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا' تین سال بعد یعنی سنہ ۱۹۲۰ میں مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا' جنوری سنہ ۱۹۲۳ میں پہلے وائس چانسلر یعنی راجہ صاحب محمودآباد نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیا' عارضی طور پر نواب مزمل اللہ خاں وائس چانسلر مقرر ہوئے' دسمبر ۱۹۲۳ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بحیثیت مستقل

وائس چانسلر منتخب ہوئے۔[7]

ظاہر ہے کے ان روایات کی بنیاد پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتے تھے کے آفتاب احمد خاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں علیگڈہ میں تعلیم اور دیگر مسائل کے سلسلہ میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے والد صاحب قبلہ رح کو مجبور کیا کہ جون سنہ ۱۹۲۴ء میں جب داخلہ کے لئے علیگڈہ جاؤں تو وہ میرے ہمراہ چلیں اور آفتاب احمد خاں سے متعارف کرادیں' وہ خود تو ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یونیورسٹی میں قاضی جلال الدین جغرافیہ کے پروفیسر موجود ہیں۔ صرف یہ ہی نہیں کہ وہ مرادآباد کے رہنے والے ہیں بلکہ ہمارے خاندان سے ان کے اچھے تعلقات ہیں۔ لیکن پھر بھی میں نے والد صاحب کو مجبور کیا اور بالاخر وہ تیار ہوگئے۔

علیگڈہ ریلوے اسٹیشن پر گاڑی تقریباً دس بجے پہنچی تھی۔ وہاں سے ہم سرسید کورٹ (جو عام طور پر پکی بارک کہلاتی تھی) قاضی جلال الدین صاحب مرحوم کے پاس گئے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا اور چند منٹ بعد آفتاب منزل جاکر وائس چانسلر سے ملنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے فوراً بلایا۔ اس مقصد کے متعلق جس کی وجہ سے ہم ان سے ملنے گئے تھے انہوں نے نہایت مختصر اور قدرے مایوس کن الفاظ میں اتنا کہا کے اس سے ان کو خوشی ہوئی کہ میں نے علیگڈہ میں ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے' لیکن بحیثیت وائس چانسلر کسی قسم کی خصوصی اعانت نہیں کرسکیں گے' دادا صاحب قبلہ کے ذکر پر اپنے والد کے مرید

ہونے اور پرکی ہدایت پیر ترک وطن سے متعلق واقعات سے انہوں نے
قطعئی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا' جہاں تک مجھے یاد ہے' اس سلسلہ
میں دو باتیں کہیں' ایک تو یہ کہ امتحان کے بعد ہم ان درویش
کی خدمت میں کامیابی کے لئے دعاء کے لئے جاتے تھے اولا دوسرے
یہ کہ کنچپورہ میں ہفتہ وار بازار لگتا تھا' اس میں جانے کا شوق
اس سے زیادہ ہوتا تھا جو اس عمر میں پیرس کی نمائش کے لئے تھا،
اس کے بعد انہوں نے اپنی خدمات پر روشنی ڈالی اور پھر لکچر
کے انداز میں مشائخ و صوفیہ پر اعتراضات اور لعن طعن کرتے رہے'
ان کی ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ صوفیہ نے اسلام اور
مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ظاہر ہے کہ والد صاحب کو
اس انداز گفتگو سے سخت کوفت ہورھی تھی لیکن شائستگی کا
تقاضا یہی تھا کہ اجازت لینے کے لئے اس وقت تک انتظار کریں
جب تک وہ اپنے اس لیکچر کو ختم نہ کریں۔[8] ان کی تقریر کے اختتام
پر اجازت لی اور ہم قاضی صاحب کے کمرے پر واپس آگئے۔ ان کو
آفتاب احمد خان کے رویہ اور گفتگو کی تفصیلات سن کر زیادہ
تعجب نہیں ہوا کیونکہ یونیورسٹی اسٹاف میں ان کی غیر مقبولیت
کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا' داخلہ کا فارم پرکر کے ہم نے قاضی
صاحب سے درخواست کی کے وہ دفتری کارروائی مکمل کرادیں'
اور شام کو پانچ بجے کی گاڑی سے مرادآباد واپس آگئے۔ اس کے
بعد موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوگئیں۔ قاضی صاحب مرادآباد
تشریف لائے اور انہوں نے بتلایا کہ والد صاحب قبلہ رح کی
خواہش کے مطابق انہوں نے مجھے ۳۶ نمبر کمرہ میں جگہ دے دی
ہے۔ وہ خود ۳۹ و ۴۰ نمبر کمروں میں قیام پذیر تھے۔

تین ماہ بعد یونیورسٹی کا سشن شروع ہونے والا تھا اور طلبہ
کو اکتوبر کے شروع میں پہنچنا تھا، لیکن اس سال صوبہ کے
دریاؤں یعنی گنگا اور اس کی شاخوں میں اسقدر شدید طغیانیاں آئیں
کہ ریل کے متعدد پل ٹوٹ گئے' چنانچہ بیرالہ راجگھاٹ کا پل
ٹوٹ جانے کی وجہ سے مرادآباد کے طلبہ کو چندوسی سے سیدھا
راستہ اختیار کرنے کے بجائے پہلے الہ آباد جانا پڑا اور وہاں سے
دوسری لائن سے علیگڈھ پہنچے۔

سرسید کورٹ

یونیورسٹی کی سب سے زیادہ شاندار اور وسیع ہوسٹل اس وقت
سرسید کورٹ تھی' اس کواڈرینگل (quadrangle) کا صدر دروازہ
(وکٹوریہ گیٹ) جنوب کی جانب تھا۔ تین جانب یعنی جنوب' مشرق
و مغرب گھروں کی قطاریں تھیں۔ شمال کی جانب اس زمانہ کے لحاظ
سے نہایت وسیع ہال تھا جو اسٹریچی ہال کہلاتا تھا۔ اس کے ہر دو
جانب کلاس روم تھے' کورٹ کے مغربی جانب بہت شاندار اور
وسیع مسجد تھی۔ اسٹریچی ہال کے مغربی جانب لائبریری تھی
جس کا نام لارڈلٹن کے نام پر تھا' وکٹوریا گیٹ سے اسٹریچی ہال
تک پختہ کنکر کی سڑک تھی اور شرقاً غرباً بھی سڑک تھی جو
ایک طرف مسجد تک اور دوسری جانب لائبریری تک جاتی تھی'
مسجد کی دیوار سے ملحق ایک بڑا دروازہ تھا۔ اس کے سامنے
کرکٹ فیلڈ تھی۔ یہ عمارت خود سرسید مرحوم کے زمانہ میں
تیار ہوئی تھی اور اسی وقت سے کالج اور بعد میں یونیورسٹی کی
زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی' وکٹوریہ گیٹ سے مشرق

کی طرف کمروں کی قطار ڈائننگ ھال تک جاتی تھی، اسی میں ۳۹ و ۴۰ نمبر کمرے چھوڑ کر جن میں ھمارے ٹیوٹر یعنی قاضی جلال الدین صاحب کی رھائش تھی ۳۸ نمبر سے طلبہ کی رھائش کے کمرے شروع ھوتے تھے' مجھے ۳۶ نمبر کمرے میں جگہ ملی تھی۔ برابر کے یعنی ۳۷ نمبر کمرے میں مختار زمن صاحب کے والد رھتے تھے۔ جو نہایت ذھین' اور خوش مزاج اور کم و بیش ھر وقت اور ھر معاملہ میں ھمارے کمرے میں رھنے والوں کے ساتھ شریک رھتے تھے۔ ھر کمرہ دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک روم نسبتاً چھوٹا ھوتا تھا لیکن اس میں ''سینیر،، طالب علم کو جگہ ملتی تھی' آگے کے حصہ میں دو طالب علم رھتے تھے، لیکن سنہ ۱۹۲۴ء میں تعداد زیادہ ھونے کی وجہ سے تین کی بجائے چار طالب علم ایک کمرے میں رھتے تھے، ھمارے کمرے میں سب سے زیادہ سینیر طالب علم سید مسعود الحسن صاحب تھے جو طلبہ میں کافی مقبول اور بااثر تھے چنانچہ جلد ھی ان کا تقرر بحثیت ڈپٹی سینیر فوڈ مانیٹر ھوگیا۔ قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد شیخ مسعود الحسن نے وکالت شروع کردی تھی۔

ھمارے دوسرے ساتھی عزیز احمد صاحب نظامی تھے' وہ بھی ایل ایل بی کے طالب علم تھے' نہایت ذھین' خوش مزاج اور ھمدرد تھے' پڑھنے لکھنے سے صرف اسقدر دلچسپی تھی جو امتحان پاس کرنے کے لئے ضروری تھی۔ باتیں خوب کرتے تھے اور چونکہ میں نے ایم اے ھسٹری میں بھی داخلہ لیا تھا اور زیادہ پڑھنا چاھتا تھا' مجھے چھیڑنے کے لئے غیر ضروری باتیں بھی شروع کردیتے تھے' میں نے یہ پروگرام بنالیا تھا کہ رات کو کھانا کھانے

کے بعد جلد ھی سوجاتا تھا' عزیز صاحب کے نماز فجر سے کافی پہلے اٹھ کر پڑھنا شروع کردیتا تھا' قریب ھی کسی کے کمرے میں ھارمونیم باجا تھا' عزیز صاحب کبھی مجھے چھیڑنے کی غرض سے وہ باجا منگوا کر میرے بستر کے قریب بیٹھ جاتے اور بجانے لگتے۔ ھارمونیم بجانا نہ ان کو آتا تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ باجے کا شور مچانے سے ان کا مقصد مجھے جگائے رکھنا ھوتا تھا۔ چند روز بعد یہ مذاق بند ھوگیا۔ عزیز صاحب کی شادی ھوگئی تھی، چنانچہ کوئی موقع چھٹیوں کا چاھے وہ دو تین دن کے لئے ھی ھوتا وہ امروھہ جائے بغیر نہیں رھتے تھے' شیخ مسعود الحسن کا وطن بھی امروھہ ھی تھا۔ دونوں میں یہ نمایاں فرق تھا کہ آخرالذکر بہت زیادہ سوشل تھے، ان کے احباب کا دائرہ وسیع تھا اور ان کا زیادہ وقت کمرے سے باھر گذرتا تھا' عزیز صاحب کم و بیش گوشہ نشین تھے اور بہت کم ادھر اودھر جاتے تھے۔

چوتھے ساتھی محمد عبدالمعبود تھے' یہ بی اے کے طالب علم تھے' یہ عربی النسل تھے اور ان کے والد نے مرادآباد میں سکونت اختیار کرلی تھی' ان کے والد ھمارے مکان پر کم و بیش روزانہ آتے تھے اور ھمارے ماموں صاحب کے پاس بیٹھتے تھے' طبابت کے سلسلہ میں نماز فجر کے بعد سے دوپہر تک مکان ھی پر رھتے تھے' ھمارے یہاں ان کو سب عرب صاحب کہتے تھے' عبدالمعبود کے ایک دوست ممتاز ھاؤس میں رھتے تھے جو ھمارے ھوسٹل سے زیادہ دور نہ تھا۔ عبدالمعبود اپنا زیادہ وقت ان ھی کے کمرے میں گذارتے تھے، اکثر کھانا بھی وھیں منگوالیتے تھے' کچھ عرصہ کے بعد وہ کسی اور ھوسٹل میں چلے گئے اور ان کی جگہ ایک اور

صاحب آ گئے، ان کا نام انوار احمد تھا اور غالباً بھرائچ یا اودھ کے کسی اور شہر کے نہایت خاموش طبع اور سادہ مزاج تھے۔ انھوں نے بھی ہمارے کمرے میں زیادہ مدت قیام نہیں کیا دوسرے ہوسٹل میں چلے گئے۔ اب کراچی میں ہیں، ایک مرتبہ مجھ سے ملنے بھی آئے تھے۔

ان کے بعد ہمارے کمرے میں سلیمان محمود آئے جو مارہرہ کے رہنے والے تھے اور محمد یامین خان صاحب زبیری ممبر لیجسلیٹو اسمبلی آف انڈیا کے چھوٹے بھائی تھے، ان کے اور دو چھوٹے بھائی ہارون احمد خان اور محمد عیسیٰ خان بھی علیگڈھ ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی یعنی عیسیٰ خان سے 'میرے تعلقات زیادہ تھے کیونکہ وہ میرٹھ میں فیض عام ہائی اسکول میں شاگرد رہ چکے تھے۔ سلیمان محمود سے ملنے وہ کم و بیش روزانہ ہمارے کمرے میں آتے تھے، تعلیم ختم کرنے کے بعد دونوں بھائی گورنمنٹ آف انڈیا کی Accounts Dept. میں ملازم ہو گئے تھے، اور تقسیم کے وقت پاکستان آ گئے، افسوس ہے کے عیسیٰ خان ابھی جوان العمر ہی تھے کے ان پر دل کا دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہوا۔ نہایت ذہین اور سادہ مزاج انسان تھے، ہارون احمد خان لائلپور کے اگریکلچر کالج میں پروفیسر یا پرنسپل ہو گئے تھے۔ سلیمان محمود کے سلسلہ میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ ایک روز شام کو میں اسٹوو جلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چاء تیار کی جائے۔ سلیمان اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، یکایک کود کر میرے پاس یہ کہتے ہوئے آئے، یار اتنی دیر لگادی تم بھی عجیب آدمی ہو، یہ کہہ کر اسٹوو کے بہت قریب آئے اور دیا سلائی سلگائی،

اسٹوو کی گیس میں آگ لگ گئی اور ان کی قمیض کا دامن اسی کی جھپٹ میں آ گیا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باھر بھاگے اور ھوا کی وجہ سے قمیض کا گریبان جلکر ان کا چھرہ بھی جل گیا۔ خیر آگ پر تو قابو چند سکنڈ میں پالیا لیکن ان کا چھرا کافی جل گیا اور کافی عرصہ کے لئے ان کو ھسپتال میں رھنا پڑا، بعد میں بھی چھرے پر کچھ نشان رہ گئے تھے، محمود نہایت بہادر اور وسیع الاخلاق انسان تھے، بعد میں اس واقعہ کا ذکر کبھی نہیں کرتے تھے۔

دوسرا واقعہ بہت دلچسپ ھے۔ ایک روز میں جمعہ کی نماز کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ سعید الدین صالح مرحوم آ گئے۔ ہم دونوں باتیں کر ھی رہے تھے کے یکایک ایک فقیر منش انسان جس کے کپڑے بھی صاف نہیں تھے اور ننگے پیر ہونے کی وجہ سے پیروں پر گرد بھی تھی کمرے میں آیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا، مجھے اس کا آنا اور بلا تکلف کرسی پر بیٹھ جانا کچھ ناگوار ھی گذرا اور میں نے کہا کہ ہم اس وقت آپ کی کچھ مدد نہیں کرسکیں گے اور یوں بھی ہم جلدی میں ہیں نماز کا وقت کم رہ گیا ھے۔ اس نے نہایت بے باکانہ انداز میں کہا اچھا چلے جانا لیکن جانے سے پہلے مجھے پیڑے منگوا کر کھلواؤ۔ میں نے کہا، اس وقت کچھ ممکن نہیں۔ نماز جمعہ کی وجہ سے تمام دوکانیں بند ہیں، آپ معاف کریں اور تشریف لے جائیں، میری شریفانہ انداز میں گفتگو کے باوجود قدرے گستاخ لہجے میں کہا، جھوٹ نہ بولو پیڑے تو تمہاری الماری میں رکھے ہیں، میں نے کہا یہ باتیں نہیں چلیں گی آپ جائیں۔ میں کمرے میں تالا لگاؤں گا، اس نے

کہا میں پیڑے کھائے بغیر نہیں جاؤں گا' الماری پر سے پردہ ہٹاؤ اور وہ پلیٹ اتارو جس میں پیڑے رکھے ھیں۔ قصہ ختم کرنے کے لئے میں الماری کے قریب گیا اور پردہ ہٹایا۔ میری اور سعید مرحوم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب ہم نے دیکھا کہ پلیٹ پیڑوں سے لبالب بھری ہوئی ھے' اب وہ دلیر ہوگیا اور کہنے لگا' اٹھاؤ فکر کا ھے کی ھے۔ تم سے اس کے پیسے کوئی نہیں مانگے گا۔ میرا رویہ اس کی طرف سے کچھ مودبانہ ہوگیا، ہم نے پیڑے کھائے اور بچے ہوئے الماری میں رکھ دئیے' وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں فلاں ہوسٹل میں عقیل صاحب (یہ عزیز صاحب کے چھوٹے بھائی تھے) کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ اب پھر آؤں گا' ہم دونوں خاموش تھے، اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ کمرے میں اس سے پہلے کوئی نہیں آیا تھا، نہ ملازم اور نہ کوئی طالب علم، اور اتنی تعداد میں پیڑوں کی موجودگی کا معمہ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رفتہ رفتہ ان سے طلبہ کو دلچسپی پیدا ہوگئی' جسٹس ایم بی احمد مرحوم بھی خاصے متاثر ہوگئے چنانچہ ایک شب کو انہوں نے ''فقیر،، صاحب کی دعوت کی اور ہمارے بعض دوست بھی اس میں شریک ہوئے' اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ھے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو اور ایم بی احمد مرحوم کے قریبی دوست شفیع اللہ ایک سادہ مزاج طالب علم تھے' ہم سب دعوت کے سلسلہ میں تفریح کر رہے تھے اور ان کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کے وہ قانون کی جماعت یعنی L.L.B کلاس میں جا کر سب کی حاضری بولیں۔ اس جماعت کے لکچرز

اسٹریچی ہال میں بعد مغرب ہوا کرتے تھے۔ طلبہ کی تعداد کافی زیادہ یعنی کم و بیش ڈیڑھ سو دو سو ہوتی تھی' ایک پروفیسر یعنی مسٹر محمد اسحاق تو کم سنتے تھے اور اکثر ناموں کے آگے حاضری لگا دیتے تھے۔ دوسرے پروفیسر مولانا عبدالخالق صاحب نہایت قابل اور نیک طبع بزرگ تھے، عادۃً نگاہیں نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں بھی بہت کم منہ اٹھا کر بات کرتے۔ اپنے بلند اخلاق اور قابلیت کے باعث طلبہ میں بہت زیادہ مقبول اور ہردلعزیز تھے' اتنے وسیع کمرے میں طالب علموں کی اتنی زیادہ تعداد میں ذاتی طور پر ہر فرد کو پہچان لینا یقیناً مشکل تھا' غالباً یہی سبب تھا کہ جس نام کے پکارے جانے پر کسی کی آواز میں 'یس سر، نکل گیا۔ حاضری لگ گئی۔ اس لئے شفیع اللہ کا کام زیادہ دشوار نہ تھا، کچھ لوگوں کے لئے خود حاضری بول دیتے اور کچھ کے لئے دوسروں سے بلوا دیتے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ علیگڈھ میں بھی اس دور کے دوسرے اداروں کی طرح حاضری کا مسئلہ بہت سنجیدہ بلکہ کٹھن تھا' امتحان میں شرکت کے لئے پچھتر فیصد حاضری لازمی تھی' بیماری اور کھیلوں وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ رعایت ضرور مل جاتی تھی۔ لیکن یہ بہت کم ہوتی تھی' شاید پانچ یا دس فیصد' اور اس کے لئے بھی بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی' آج کل جو سہولتیں اس سلسلہ میں طلبہ اور طالبات کو جائز یا ناجائز طریقہ پر حاصل ہیں' ان کا اس زمانہ کے حالات سے کوئی مقابلہ نہیں۔ بڑے بڑے با اثر خاندانوں کے طلبہ کو غیر معمولی رعایت حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ ایک واقعہ یاد آتا ھے کہ ایک طالب علم کی حاضری مقررہ

حد سے صرف ایک فیصد کم تھی۔ اس کے والد پنجاب میں شاید
ڈپٹی کلکٹر تھے' وہاں سے وہ خود آئے اور بےحد کوشش کے
باوجود ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے صاحبزادے کو امتحان
میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔

ذکر یہ کیا جارہا تھا کہ شفیع اللہ صاحب کلاس سے واپس
آئے تو ایم بی احمد صاحب نے "فقیر صاحب" سے کہا کہ ان
کے لئے کچھ کھانے کی چیز اپنے "ہمزاد" سے منگوا کر دیں۔
انھوں نے کہا کہ یہ نہیں ہوگا۔ یہ بزرگ یعنی شفیع اللہ "چور"
ہیں اور ان کے کوٹ کی جیب میں "چرائی ہوئی" چھوٹی
الائچیاں ہیں۔ قدرتی طور پر شفیع اللہ نے جیب میں ھاتھ ڈالا تو
تقریباً آدھ پاؤ الائچیاں جیب میں سے نکلیں۔ سب بڑے زور سے
ہنس پڑے اور شفیع اللہ بےحد نادم ہوئے۔ اس واقعہ کو جس نے
دیکھا نہیں تھا اس کو یقین نہ آتا تھا' چنانچہ بعد میں جب
میں نے سلیمان محمود سے یہ ذکر کیا تو انھوں نے بھی ھمارا خوب
مذاق اڑایا اور ھم کو ضعیف العقیدہ کہنے لگے۔ میں کچھ نہیں
کہہ سکتا تھا اس لئے کہ میری سمجھ میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں
آتی تھی۔ "فقیر" صاحب کے سلسلہ میں کرامت کا ذکر تو کیا
نہیں جاسکتا' وہ ولی کیا باعمل مسلمان بھی نہ تھے۔ نماز' روزے
یا کسی اور دینی عمل سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا' ظاھری حالت
بھی صاف ستھری نہ تھی' اکثر ننگے پیر اور ایک کثیف سا سیاہ
رنگ کا چغہ پہنے رہتے تھے' لیکن وہ مطلوبہ چیزیں منگاتے تھے
اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسری دفعہ جب وہ
علیگڈھ آئے تو میں ایم اے فائنل میں تھا' دسمبر سنہ ۲۰ یا جنوری

سنہ ۲۶ کی بات' ان مہینوں سردی نہایت شدید ہوتی ہے۔ میں
نے سلیمان محمود سے کہا کہ چلو گے "میاں صاحب" آئے ہوئے ہیں
اور سرسید ہال کے قریب ہسپتال کے ایک کوارٹر میں ایک کمپونڈر
صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔ وہ تیار ہوگئے اور اپنے ایک دوست
محمد عزیز صاحب کو ساتھ لے کر میرے ہمراہ رات کو دس بجے کے
بعد ان کمپونڈر صاحب کے گھر گئے۔ "میاں صاحب" چار پائی پر
کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے' ہم لوگ برابر میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
سب لوگ چلے گئے تو میں نے کہا' "میاں صاحب" یہ ھمارے
دوست ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ناگپور کا تازہ ٹوٹا ہوا سنگترا
منگوا دیجئے' وہ نہایت برھم ہوئے اور کہنے لگے' میں اس وقت
کہاں سے منگوا کر دونگا' میں کیا جادوگر ہوں۔ اس جواب سے
مجھے نہایت ندامت ہوئی اور سلیمان نے اوورکوٹ کی جیب میں
ھاتھ ڈالے ہوئے مجھے ٹوکا۔ میرے پاس سوائے خموشی کے کوئی
چارہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ان سے اجازت لی۔ جوں ھی سلیمان
محمود نے ان سے ھاتھ ملایا وہ پیچھے کو اچھلے کیونکہ یکایک ان
کے ھاتھ میں ایک سنگترہ تھا' آخر میں چلنے لگا تو بولے' تم کہو گے
مجھے نہیں لو یہ ہے اور ایک سنگترہ مجھے بھی دیدیا۔ یہ واقعہ
ھمارے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہے گا۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ
جب میں بچہ تھا' شاید سات آٹھ سال عمر ہوگی تو ایک صاحب
بڑے بھائی صاحب مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے اور آتے ھی
مجھ سے کہتے تھے' جاؤ بیٹا پانی لاؤ اور پان کا ٹکڑا۔ میں جب
یہ لاتا تو فوراً مٹھائی مجھکو دیتے۔ خیر میں یہ تو نہیں سمجھتا

تھا کہ وہ اسی وقت منگواتے ھیں، لیکن بعد میں بھائی صاحب مرحوم نے بتلایا کہ وہ بھی اسی طرح چیزیں "ھمزاد" سے منگواتے ھیں۔ ایک مرتبہ چند لوگ بیٹھے تھے، ان میں سے ایک صاحب نے فرمائش کی کہ بھائی میاں جان خان (یہ ان کا نام تھا) ھم جب تمہارا کمال سمجھیں کہ خالص سونے کا ایک پاؤ کا ٹکڑا آپ منگالیں۔ میاں جان خان نے کہا، اچھا اپنی ٹوپی لاؤ۔ ان کی ٹوپی کو ھاتھ میں لے کر مسلا اور واپس کی کردی۔ سب کی کوئی حیرت نہ رھی کہ جب انھوں نے ٹوپی کو کھولا تو ایک پاؤ کا سونے کا ٹکڑا اس میں موجود تھا۔ خان صاحب بولے یہ نظربندی (آنکھ کا دھوکا) نہیں، جاؤ اس تخت پر جو وھاں پڑا ھوا تھا اس کو پٹکو۔ نہایت زور سے اس کی آواز ھوئی۔ پھر ھر ایک نے ھاتھ میں لے کر اس کو دیکھا اور خان صاحب کو واپس کردیا۔ انھوں نے ٹوپی میں ڈال کر اس کو اسی طرح مسلا اور خالی شدہ ٹوپی واپس کردی۔ میاں جان خان کا اس سے بھی حیرت انگیز "کمال" کا ذکر مجھ سے میرٹھ کے رئیس بھیا شیخ بشیرالدین مرحوم نے کیا کہ ان کے کمرے میں بیٹھے ھوئے چند معزز لوگوں کی موجودگی میں اور ان کی فرمائش پر خان صاحب نے دس من لکھنؤ کے خربوزوں کے بیس پارسل رسیوں سے بندھے ھوئے منگوائے تھے، میاں جان خان کا تو شغل ھی تھا کہ مرادآباد سے وہ دورے پر نکلتے اور مختلف شہروں میں اہل ثروت اور بااثر لوگوں کے پاس جاتے اور یہ "کمالات" دکھا کر انعامات وصول کرتے، کئی ماہ بعد لوٹ کر آتے اور ان ھی انعامات کو خرچ کرتے رھتے۔ بھائی صاحب فرماتے تھے کے ھمارے گھر ھر ایک مرتبہ

لوگوں کے اصرار پر انھوں نے اپنے "ھمزاد" کو اسطرح دکھلایا کہ سب لوگ صحن میں بیٹھ گئے اور صحنچی کے تینوں دروازے بند کردے گئے، میاں جان خان نے زور سے کہا، ھاں بھئی ذرا ان حضرات کو اپنا ھاتھ دکھلادو۔ چنانچہ دروازہ جو بند تھا خود بخود کھلا اور اندر سے ایک ھاتھ پھیلا ھوا نظر آیا۔ بعد میں ھاتھ غائب ھوا اور دروازہ کھل گیا۔

میاں جان خان سے جب اصرار کے ساتھ ان کے احباب نے دریافت کیا بتلاؤ یہ کیا فن ھے اور کیا کمال ھے، تو انھوں نے جواب دیا کہ نہ کمال ھے نہ کرامت، میں نہ فقیر ھوں اور نہ ولی، صرف شعبدہ بازی ھے جس کو میں نے ذریعہ معاش بنالیا ھے۔ لیکن اپنے ھمزاد کی موجودگی سے انھوں نے انکار نہیں کیا۔[9]

جوبلی دسمبر سنہ ۲۵ء

میری طالب علمی کے زمانہ کا عظیم اور تاریخی واقعہ پچاس سالہ جوبلی کا انعقاد تھا۔ اس کے انعقاد کا سلسلہ طویل ھے۔ تاریخ مقررہ یعنی دسمبر ۲۰ کی ماہ قبل وہ شروع ھو گیا تھا۔ قدرتی طور پر چونکہ یونیورسٹی ایک رھائشی ادارہ تھی، اساتذہ اور طلبہ میں اس کا چرچا رھتا اور ھوسٹل کے کمروں میں اکثر یہی باتیں ھوتی رھتی تھیں۔ آفتاب احمد خان وائس چانسلر اور ان کے مشیروں کا خیال تھا اور انھوں نے صحیح رائے قائم کی تھی، کہ یونیورسٹی کی مسلمانوں میں بڑھتی ھوئی مقبولیت کے باوجود، اس کی شہرت اور مرکزی ادارہ تعلیم کی حیثیت سے اس پر مختلف گوشوں سے حملے کئے جارھے تھے اور خود حکومت کے بعض اعلیٰ افسر بھی بدگمانی کا اظہار کرتے تھے، اس کا سب سے بڑا سبب خود یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے اختلافات تھے، یہ

اس اب راز میں نہ تھا کہ دو مخالف گروہوں میں سے ایک کے
لیڈر آفتاب احمد خان وائس چانسلر اور دوسرے کے ڈاکٹر
ضیاء الدین احمد تھے، دونوں ہماری تاریخ کی نمایاں شخصیتیں
شمار کی جاتی ہیں۔ ان کے اختلافات کا تجزیہ دلچسپی سے
خالی نہیں۔

صاحبزادہ آفتاب احد خان اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد10 کی
تربیت، مزاج اور کردار میں بعض بنیادی اختلافات تھے، لیکن یہ
امر قابل غور ہے کہ ایک خصوصیت مشترک تھی، یعنی مسلم قوم
سے بالعموم اور علیگڈھ سے بالخصوص انتہائی خلوص اور محبت۔
دونوں کے دل اور ذہنوں میں ایک ہی مقصد کارفرما تھا، مگر
طریقہائے کار میں قدم قدم پر اختلاف نظر آتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب
نے خوشحال اور با اثر خاندان میں تربیت پائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب
ایک متوسط الحال گھرانے کے فرد تھے اور ان کی ترقی اور عروج
کا واحد سبب ان کی ذاتی قابلیت اور محنت تھی، انگلستان سے
تعلیم ختم کرنے کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ان کی شہرت
مسلمانوں میں سب سے زیادہ بڑے ریاضی داں کی تھی۔ دونوں کی
عمر میں دس سال کا فرق تھا۔ صاحبزادہ صاحب سنہ ۱۸۶۷ء اور
ڈاکٹر صاحب دس سال بعد سنہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ چھپن سال
کی عمر میں جب صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا چارج
لیا تو وہ عمر کی آخری منزل میں داخل ہوچکے تھے اس لئے کہ
اگلے سال یعنی سنہ ۱۹۲۰ میں ان کی تندرستی نے جواب دے دیا
اور اگرچہ وہ کچھ عرصہ وائس چانسلر رہے لیکن بیماری مہلک
ثابت ہوئی اور طویل علالت کے بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا

انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر جب وہ یونیورسٹی کے
وائس چانسلر مقرر ہوئے، ۴۳ سال تھی، ذہانت، توانائی اور محنت
میں۔ اپنے عروج پر تھے ڈاکٹر صاحب دن رات کام کرتے تھے اور ہر
مسئلہ کا نہایت سرعت سے حل سوچ لیتے تھے، صاحبزادہ صاحب بھی
بہت محنت کرتے لیکن قانونی موشگافیوں میں الجھنے کے باعث ان کے
کام کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوسکتی تھی۔ کردار کی جس خصوصیت
نے صاحبزادہ صاحب کے راستہ میں زبردست رکاوٹیں پیدا کیں اور ان
کے بعض رفقائے کار، خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے شرکت کار
میں تعاون کو تقریباً ناممکن بنادیا وہ ان کی خود رائی اور ضد
تھی، ان کو یہ خیال کبھی نہ آیا کہ تعلیم ایک مخصوص فن ہے
اور اس کے سمندر میں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک تجربہ کار
تیراک کی سی تھی اور وہ کنارے پر کھڑے ہوئے اس تماشائی
کی طرح تھے جو پانی میں طوفان خیز موجوں کو روکنے کے لئے
نظریات اور بنیادی اصولوں پر عمل کرنے اور اس کی تلقین میں
قیمتی وقت صرف کردیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں اختلافات
شروع ہوگئے اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ اسقدر بڑھ گئے کہ اساتذہ
میں باقاعدہ دوگروہ وجود میں آگئے، ایک صاحبزادہ صاحب کی
تائید کرتا تھا اور دوسرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھا، اکیڈمک
اور ایگزکیوٹیو کونسل کے جلسے رزمگاہ بن جاتے جہاں ہر اہم
مسئلہ پر اختلاف اور بحثیں ہوتی تھیں۔ طلبہ قدرتی طور پر زیادہ
تعداد میں ڈاکٹر صاحب کے مداح تھے کیونکہ ان کا تعلق
پرووائس چانسلر سے ہی ہوتا تھا، جہاں چند طلبہ جمع ہوتے وہ
ڈاکٹر صاحب ہی کی تعریف کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ پروفیسر

مجید الدین مرحوم جو کبھی کبھی ہمارے کمرے پر تشریف لے آتے
تھے ڈاکٹر صاحب کے خلاف تقریر کرتے تھے' لیکن اس کا طلبہ پر
کوئی اثر نہ ہوتا تھا' یہاں ان اختلافات کی تفصیلات بیان نہیں
کی جاسکتیں۔ لیکن مثال کے طور پر یہ ذکر کیا جاسکتا ہے کہ
ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کی طرف سے میٹرک میں
پرائیوٹ طلبہ کو اجازت ملنی چاہیئے اور اس میں کوئی قانونی رکاوٹ
یا بندش نہیں ہونا چاہئے۔ ابتداء ہی سے بعض لوگ اس کے خلاف
تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس پر اصرار رہا اور وہ امتحان لیتے
رہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرائیوٹ طلبہ کی کثیر تعداد کامیاب
ہو کر یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگی اور اس سے معیار ایک حد تک
متاثر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں میں تعلیمی
کمی کو دور کرنے کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے۔ اور وہ اس سلسلہ
میں کلکتہ یونیورسٹی کی مثال دیا کرتے تھے۔ جب تک ان کو
یہ موقع ملا یہ سلسلہ انہوں نے جاری رکھا اور یہ صحیح ہے کہ
اس سے مسلمانوں میں تعلیم پھیلنے اور یونیورسٹی میں داخلے زیادہ
ہونے میں یہ اقدام کارگر ثابت ہوا۔

بہرحال وائس چانسلر اور پرووائس چانسلر کے اختلافات
یا یوں کہئے کہ یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی شعبوں کا
دو علیحدہ خانوں میں بٹ جانے سے تعلیمی معیار اور رہائشی زندگی
دونوں کو نقصان پہنچا، اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ
مسلمانوں کے دو مسلم لیڈر جو مخلص اور ہمدرد ضرور تھے ایک
حد تک اس نقصان کے ذمہ دار ضرور تھے، نقصان کی وسعت کا اندازہ
اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر طرف سے یونیورسٹی کے خلاف

پروپاگنڈا ہونے لگا کہ یہاں کی ڈگریاں ناقص ہیں اور امتحانات
کا کوئی معیار نہیں۔ چنانچہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں
کو ملازمت حاصل کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ
حکومت کے افسران و کارکن بھی اس پروپاگنڈے کا اثر قبول
کرنے لگے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس دور کے علیگڈھ کی
ڈگری ہولڈروں کو اس پروپاگنڈے سے کسقدر شدید نقصان پہنچا،
اس پروپاگنڈے میں ہندو پریس نے بھی حصہ لیا۔ الہ باد کا لیڈر
(Leader) اور اس کے ایڈیٹر مسٹر چنتامنی، خاص طور پر قابل ذکر
ہیں۔ انگریز افسران میں یو پی کے ڈائریکٹر تعلیمات مسٹر میکنزی کا
نام سرفہرست تھا، پروپاگنڈا کرنے والوں نے صاحبزادہ صاحب
اور ڈاکٹر صاحب کے اختلافات سے بہت فائدہ اٹھایا' اس مسئلہ
کے بعض پہلوؤں کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

جوبلی کے انتظامات

سال کے وسط میں جوبلی کے انتظامات کا سلسلہ شروع ہوگیا
تھا۔ وائس چانسلر نے یہ سارے انتظامات براہ راست اپنی نگرانی
میں شروع کئے تھے اور چند پروفیسر جن سے وہ خوش تھے اس میں
ان کی مدد کے لئے منتخب کئے گئے تھے، ان میں ہمارے عزیز دوست
مسٹر ہمت علی سرفہرست تھے' وہ نہایت خوش اخلاق' خوش مزاج
اور ذہین شخص تھے، اگرچہ صرف گریجویٹ تھے اور ایم اے کی
ڈگری نہیں رکھتے تھے لیکن انگریزی میں عمدہ گفتگو کرتے
تھے اور اسی بناء پر ان کا تقرر چند ماہ پہلے ہوا تھا، صاحبزادہ
صاحب ان سے کافی متاثر تھے، جوبلی کے عظیم جشن اور اس کے

وسیع انتظامات کے لئے مسٹر ھمت علی موزوں نہیں تھے' ان کو
علیگڈھ کا کوئی تجربہ نہیں تھا' وہ وھاں کے طالب علم نہیں رھے
تھے اور حال ھی میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرار انٹر میڈیٹ کالج
ھوا تھا۔ نتیجہ یہ ھوا کہ انتظامات کی رفتار سست اور ناقابل
اطمینان تھی' ان حالات سے ان کو جو مایوسی ھورھی تھی اس
سے صاحبزادہ صاحب کی تندرستی پر گہرا اثر پڑرھا تھا' صرف
ڈاکٹر صاحب ھی نہیں بلکہ اساتذہ کی بیشتر تعداد ان کی بےجا
اور لاحاصل تنقیدوں اور بعض انتظامی اقدامات سے ناخوش تھے'
چنانچہ ایک عجیب کیفیت مایوسی کی پیدا ھوگئی تھی۔ بالاخر
ان کی تندرستی اسقدر متاثر ھوئی کہ ڈاکٹروں کے مشورے پر ان
کو آرام کی غرض سے یہ جملہ انتظامات مکمل اختیارات کے ساتھ
ڈاکٹر صاحب کے سپرد کرنا پڑے۔ وقت بہت کم اور کام کا پھیلاؤ
بہت زیادہ ھوگیا تھا' لیکن ڈاکٹر صاحب نے انتظامات ھاتھ میں
لےکر بہت تن دھی اور تیزی سے کام شروع کردیا' وہ خود بھی
دن رات کام کرتے اور اساتذہ میں سے کافی تعداد ایسی تھی جو ان
کے ساتھ تعاون کے لئے ھمہ تن تیار تھی' مجھے ذاتی طور پر
طالب علم کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نہیں پہچانتے تھے' لیکن
ایک ضروری کام میرے بھی سپرد کیا گیا۔ حافظ عثمان صاحب
ریاضی کے لکچرار تھے اور ڈاکٹر محمد اسحاق کی وجہ سے جن سے
میرٹھ ھی سے راقم کے دوستانہ تعلقات تھے ان سے واقفیت ھوگئی
تھی' سنتے کم تھے لیکن نہایت دلکش شخصیت کے مالک تھے'
طالب علموں میں اپنی قابلیت اور محنت سے پڑھانے کے باعث نہایت
مقبول تھے' عثمانیہ ھوسٹل کے وارڈن تھے' اور وھیں رہتے تھے۔

حافظ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ' بھئی معین الحق
ایک ضروری کام کرنا ھے اور وہ تم ھی خوبی کے ساتھ انجام
دے سکتے ھو' میں خاموش رھا۔ انھوں نے کہا سمجھے؟ میں نے کہا
فرمایئے' فرمانے لگے۔ کل ڈاکٹر صاحب کا خان بہادر شیخ وحیدالدین
کے نام خط لےکر میرٹھ جاؤ اور وھاں سے سواسو خیموں کا انتظام
کرکے بذریعہ ریل لےآؤ' میں تو سمجھا کہ یہ کام جوئےشیر کا
لانا ھے لیکن ساتھ ھی کچھ اپنی اھمیت کا خیال کرتے ھوئے دل
میں سرور کی ایک کیفیت بھی پیدا ھوئی' ایک طالب علم کےلئے
اس خدمت کا انجام دینا یقینی ایک امتیازی خدمت تھی' چنانچہ
دوسرے روز میں میرٹھ پہنچ گیا۔ خان بہادر صاحب مرحوم نے
جو میرٹھ کے رئیس اعظم اور انتہائی با اخلاق اور با اثر بزرگ
تھے' خط پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ اس کی پوری کوشش کی جائےگی۔
چنانچہ انھوں نے اپنے ملازمین کو ھدایات دیں کہ وہ ضروری
معلومات حاصل کرکے بتلائیں کہ کتنی تعداد میں اور کس
کرایہ پر خیمے مل سکتے ھیں۔ دو تین دن کی تگ و دو کے
بعد ان لوگوں نے سو سے زائد خیموں کا انتظام کرلیا' اور ریل کی
ویگن میں لادکر وہ علیگڈھ کےلئے روانہ کردیئے گئے' ظاھر ھے
کہ اتنی تعداد میں خیموں اور ساتھ ھی ویگن کا اس سرعت کے
ساتھ دستیاب ھوجانا، خان بہادر صاحب مرحوم کے اثر ھی کی
وجہ سے ممکن تھا' لیکن واپسی پر احباب کے حلقہ میں اس کی
شہرت ھوگئی کہ معین میرٹھ سے خیمے لےآئے جن کی وجہ سے منتظمین
جوبلی سخت پریشان تھے' ڈاکٹر صاحب نے بھی مسکرا کر ایک
آدھ جملہ کہا جو یاد نہیں اور پھر جیسی کہ ان کی عادت تھی

قطعئی طور پر بھول گئے۔

یہاں مختصراً اس کا بھی ذکر کیا جاسکتا ھے کہ جوبلی کا پنڈال اور کیمپ اس میدان میں لگایا گیا تھا جو سائنس کالج کی بارکوں سے ملحق ھے اور بعد میں جوبلی میدان کے ھی نام سے مشہور ھوگیا تھا' اب وھاں یونیورسٹی کی نئی لائبریری ھے۔ انتظامات کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ھے کہ چھ سات ھزار مہمانوں کی امید کی جاری تھی۔ صحیح تعداد شرکاء کی بتلانا مشکل ھے لیکن ھجوم یقیناً بہت زیادہ تھا۔ وسیع پنڈال اور بہت بڑی تعداد میں خیموں کا انتظام بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف سے کیا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ تزئین اور وسعت دونوں لحاظ سے نہایت شاندار تھا۔ محمد امین زبیری صاحب نے بجا طور پر اس کو مدینۃالخیام لکھا ھے۔ جوبلی کا یہ جشن مادی اور اخلاقی لحاظ سے بہت کامیاب ھوا' سب سے اھم نتیجہ یہ ھوا کہ اس پروپاگنڈے کے اثرات جو چند سال سے کیا جارھا تھا، زائل ھونے لگے اور اس کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ھوا۔ ایک خاصی رقم چندے کی بھی جمع ھوگئی جس سے یونیورسٹی کے ترقیاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی مدد ملی۔

سلطانیہ ھسٹاریکل سوسائٹی

زمانہ طالب علمی کا ایک قابل ذکر واقعہ' سلطانیہ ھسٹاریکل سوسائٹی کے سکریٹری کا انتخاب تھا' یونیورسٹی کے اھم شعبوں میں علیحدہ علیحدہ ادبی انجمنیں تھیں جن کو اس رقم کا کچھ حصہ دیا جاتا تھا جو اس مد میں طلبہ سے فیس کے ساتھ

لی جاتی تھی، شعبہ تاریخ کی انجمن کا نام، بیگم صاحبہ بھوپال کے نام پر سلطانیہ ھسٹاریکل سوسائٹی رکھا گیا تھا' تاریخ سے فطری دلچسپی کے باعث شروع ھی سے میری خواھش تھی کہ اس سوسائٹی سے منسلک ھوجاؤں۔ ھمارے ایک ساتھی شیخ مسعود احمد طلبہ کی انتخابی مہموں اور اس قسم کے دوسرے ھنگاموں میں دلچسپی لیتے تھے اور یونین کے انتخابات میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا ضرور انتخاب لڑنا چاھئے چنانچہ میں تیار ھوگیا اور بالاخر منتخب بھی ھوگیا' میرے پیش رو جناب طاھر رضوی تھے جو بعد میں جغرافیہ کے ریڈر اور اس شعبہ کے سربراہ ھوگئے اور تاھنوز رٹائر ھونے کے بعد بھی' علیگڈھ ھی میں مقیم ھیں۔ سوسائٹی کا سکریٹری منتخب ھونے کا ایک ظاھری فائدہ یہ ھوا کہ شعبہ کے دونوں پروفیسروں یعنی پروفیسر اے بی اے حلیم جو صدر شعبہ بھی تھے اور پروفیسر محمد حبیب سے تعلقات بڑھ گئے۔ دونوں حضرات اپنی شرافت اور قابلیت کے لئے مشہور تھے' دونوں کے پاس اکسفورڈ کی آنرز کی ڈگریاں تھیں۔

ھسٹری ڈپارٹمنٹ

یونیورسٹی کے تعلیمی شعبوں میں ھسٹری ڈپارٹمنٹ اپنے بلند معیار کے لئے سارے ملک میں مشہور تھا اور یقیناً' اس شہرت کا سبب ان ھی دو پروفیسروں کی موجودگی تھی۔ خاص طور پر پروفیسر حبیب کی قابلیت جو علیگڈھ ھی میں نہیں بلکہ اس کے باھر بھی اپنا سکہ جما چکی تھی۔ اس زمانہ میں تاریخ و سیاسیات کے شعبے علیحدہ علیحدہ نہیں تھے' بلکہ دونوں کا ایک ھی شعبہ تھا۔

سیاسیات اور تاریخ ہند کے پرچے پروفیسر حبیب پڑھاتے تھے اور یورپ اور انگلستان کی تاریخ پروفیسر حلیم پڑھاتے' انتظامی سہولت کے پیش نظر' ایم اے سال اول اور دوئم کی جماعتیں ساتھ ہی ہوتی تھیں۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی سے جو طلبہ ہسٹری میں ڈگری لیتے تھے، وہ گویا ہسٹری اور سیاسیات دونوں کی ڈگری رکھتے تھے' باوجود اس کے دونوں مضامین کا معیار ہر طرح سے دوسری یونیورسٹیوں کے معیار کے ہم پلہ تھا، جس کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ ممتحنوں کی زیادہ تعداد بیرونی یعنی دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی ہوتی تھی' چھ پرچوں میں سے صرف دو پرچے یعنی ایک پروفیسر حلیم اور ایک پروفیسر حبیب کے پاس ہوتے تھے' باہر کی یونیورسٹیوں سے ان لوگوں کو پرچے دئے جاتے تھے جو ملک گیر شہرت کے حامل ہوتے تھے مثال کے طور پر ہمارے زمانہ کے ممتحنین میں ڈاکٹر تارا چند' ڈاکٹر ترپاٹھی' ڈاکٹر رادھا کمود مکرجی (لکھنؤ) اور پروفیسر بوس (لاہور) کے ناموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اپنے اساتذہ کی تعلیمی قابلیت اور ان کے تدریسی معیار پر تنقید خلاف ادب ہے لیکن ہمارے دونوں استاد کسی معیار سے بھی بلند پایہ تھے، پروفیسر حلیم لکچرز وغیرہ کی تیاری کے علاوہ ٹہلنے کے بہت شوقین تھے اور روزانہ شام کو کئی میل ٹہلتے تھے۔ حبیب صاحب کا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ اس زمانہ ان کے دو مقالے، ایک محمود غزنوی پر اور دوسرا امیر خسرو پر شایع ہوئے تھے جن کی وجہ سے ان کی شہرت بہت زیادہ ہوگئی تھی' سیاسی خیالات میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی کے زبردست حامی تھے اور

ہندو لیڈروں کی ثنا گوئی ان کی نمایاں خصوصیت تھی' مجھے اور بعض دوسرے ساتھیوں کو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا' لیکن اس سلسلہ میں گفتگو اور بحث کو ہم لوگ بے ادبی تصور کرتے تھے اور ان کے لکچرز اور گفتگو کو خاموشی سے سنتے۔ ہاں دو ایک مرتبہ ایسا ضرور ہوا کہ یونین کے پلیٹ فارم پر مجھے اور پروفیسر حبیب کو ایک ہی موضوع پر تقریر کے دوران ایک دوسرے کے دلائل سے اختلاف کرنا پڑا۔ اگرچہ اس کا اظہار پروفیسر مذکور نے کبھی نہیں کیا، لیکن مجھے یقین ہے اور واقعات مابعد میں اس کی شہادت ملتی ہے کہ یہ اختلاف ان کو پسند نہیں تھا۔

یونیورسٹی کے محدود وسائل اور ناکافی گرانٹ کے باعث مختلف شعبوں میں اعلیٰ تنخواہ پانے والے اساتذہ کی تعداد کم ہوتی تھی، کسی شعبہ میں ایک سے زیادہ پروفیسر کی تقرری ممکن نہ تھی' لیکن تاریخ میں دو پروفیسروں کا تقرر خاص وجوہات کی بناء پر ہوگیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی سال تک ان حضرات کے علاوہ صرف دو لکچرار اور تھے' ایک سید نوشہ علی صاحب اور دوسرے قاضی جلال الدین صاحب۔ یہ دونوں صاحب مرادآباد ہی کے رہنے والے تھے۔

خزائن الفتوح

انگلستان سے پروفیسر حبیب اپنے ہمراہ امیر خسرو کی تصنیف خزائن الفتوح یا تاریخ علائی کے نسخہ کی ایک نقل اس غرض سے لائے تھے کہ اس کا انگریزی ترجمہ شایع کریں۔ چنانچہ بعد

میں یہ شایع بھی ہوا، یہاں آکر ان کو خیال پیدا ہوا کے اس
کا فارسی متن بھی شایع کردیں اور میرے متعلق یہ معلوم ہونے کے
بعد کہ فارسی میں کچھ دسترس ہے انھوں نے مجھ سے کہا کہ مسودے
کو مرتب کرنے میں ان کی مدد کروں اور کتاب کو سلطانیہ
ہسٹاریکل سوسائٹی سے شایع کردیا جائے' چنانچہ شام کو تقریباً
روزانہ میں ان کے مکان پر جاتا، میرے ساتھ ایک کلاس فیلو
مسمیٰ سلطان حمید بھی ساتھ ہوتے تھے' یہ کام نہایت دشوار
اور صبرآزما ثابت ہوا' اس کی وجہ یہ تھی کے زبان اور فن کے
لحاظ سے کتاب آسان نہیں۔ ساتھ ہی نسخہ ایک ہی تھا اور وہ
بھی کرم خوردہ۔ لیکن ان دشواریوں کے باوجود ہم نے کام جاری
رکھا اور آخرکار کتاب طبع ہوگئی' کتابت کی غلطیوں اور ناقص
پروف ریڈنگ کے علاوہ اس میں اور بھی غلطیاں رہ گئیں' چنانچہ
لاہور کے پروفیسر شیرانی مرحوم نے کتابت پر نہایت مفصل تنقید
شایع کی اور بہت سے جا اور بےجا اعتراضات کئے' بعد میں ڈاکٹر
وحید مرزا لکھنوی نے اس کا ایک اچھا ایڈیشن شایع کیا۔ پروفیسر
حبیب کا انگیزی ترجمہ ان نقائص کے باوجود جن کی نشان دہی
پروفیسر شیرانی نے کی ہے' انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہوا
اور اب شاذ ملتا ہے' جہاں تک میرا تعلق ہے خزائن الفتوح کی اشاعت
میرے لئے ایک اہم واقعہ ہے جس وقت وہ شایع ہوئی میں اسٹاف
پر آچکا تھا' اگرچہ اظہار کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا، لیکن
اندرونی طور پر ایک عجیب فخر محسوس کرتا تھا کے ایک
عظیم المرتبت مصنف کی کتاب کا میں مرتب ہوگیا ہوں' کتاب
کی اشاعت اور اس پر فخر کا نتیجہ یہ تھا کے اسی وقت سے مصنف

یا مؤلف بننے کا شوق دل میں پیدا ہوگیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ
بڑھتا ہی گیا' مجھے اس کا احساس ضرور تھا کہ ناقص ایڈٹنگ کی
وجہ سے میرا نام بحیثیت مرتب دیا گیا تھا' لیکن ابتدائی دور
میں ایک عظیم کتاب کا مرتب ہوجانا انتہائی مسرت کا باعث
ضرور تھا۔

ایم اے کی ڈگری

اس زمانہ میں ایم اے پریویس کا امتحان علیحدہ نہیں ہوتا
تھا بلکہ دو سال بعد سب پرچوں میں ایک ہی امتحان ہوتا تھا۔
اس لئے میں نے شروع ہی سے یہ پروگرام بنالیا تھا کہ سنہ ۲۵ء
میں ایل ایل بی سال اول کا امتحان دوں گا اور سنہ ۲۶ء میں
ایم اے کا۔ ہاں یہ حق حاصل کرنے کے لئے کہ بعد میں ایل ایل بی
سال دوم کے امتحان میں پرائیوٹ طور پر شریک ہوسکوں اس کے
امتحان میں بھی بیٹھوں گا جس میں ظاہر ہے کامیاب نہیں ہوسکوں گا
کیونکہ ایم اے فائینل اور ایل ایل بی فائینل کے امتحانات میں
وقت کا فرق تھا' یہ منصوبہ اس غرض سے بنایا تھا کہ میری خواہش
تھی کے ایم اے ہسٹری میں فرسٹ ڈویژن حاصل کروں' لیکن
بدقسمتی سے آخر کے دو پرچوں کے دنوں میں طبعیت خراب ہوگئی
اور بخار کی حالت میں پرچے کرنے پڑے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کے
چند نشانات سے فرسٹ ڈویژن رہ گیا۔ امتحان کے سلسلہ میں
دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ زبانی امتحان کے لئے اس سال لکھنؤ سے
پروفیسر رادھاکمود مکرجی کو بلایا گیا تھا' یہ تو سب جانتے
ہیں کہ زبانی امتحان سے طلبہ خائف ہی رہتے ہیں چاہے تیاری

کتنی اچھی کیوں نہ ہو' مجھ سے ڈاکٹر مکرجی نے دریافت کیا
تاریخ ہند کے لئے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے چند
فارسی تاریخوں کا بھی ذکر کیا' تو بولے فارسی اچھی جانتے ہو'
جب میں نے کہا جانتا ہوں تو کہنے لگے کوئی شعر پڑھو'
میں نے مثنوی مولانا روم کے دو تین شعر سنائے۔ تو کہنے لگے ان
کا مطلب اور تشریح بیان کرو میں نے حسب استعداد مطلب بیان
کیا۔ اسی سے اسقدر خوش ہوئے کہ کہا اب زیادہ سوالوں کی
ضرورت نہیں۔ اس پر پروفیسر حبیب نے سیاسات سے متعلق ایک
سوال کیا جو مشکل نہ تھا' شام کو ڈاکٹر مکرجی کو چند طلبہ
گاڑی پر چھوڑنے گئے' میں بھی تھا' مجھ سے علیحدہ کھڑے ہوکر
کہنے لگے کہ تمہارے جوابات سے مجھے بہت خوشی ہوئی اور
مجھے یقین ہے تم فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگے۔ اب یقینی امید
تھی لیکن جب نتیجہ شایع ہوا اور سکنڈ ڈویژن میں نام دیکھا تو
مایوسی ہوئی' لیکن بعد میں نشانات کی فہرست دیکھ کر اندازہ
ہوا کہ علالت کے باعث یہ صورت پیش آئی۔ چند ماہ بعد
انٹرمیڈیٹ کالج میں بحیثیت ہسٹری لکچرار تقرر ہوگیا۔

۱۹۱۷ میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں سفارش
کی گئی تھی کہ انٹر میڈیٹ کی دونوں جماعتوں کو یونیورسٹی سے
علیحدہ کر کے اسکول کی نویں دسویں جماعت سے ملا کر نئے
ادارے انٹر میڈیٹ کالجوں کے نام سے قائم کئے جائیں اور ان کا
انتظام علیحدہ بورڈز کے سپرد کیا جائے' ڈاکٹر ضیاء الدین اس
کمیشن کے رکن تھے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں اس سفارش پر
عمل کیا گیا۔ پہلے ایک انگریز پروفیسر میجر ڈین جو علم جغرافیہ

کے ماہر خیال کئے جاتے تھے اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن
تجربہ نے ثابت کیا کہ طلبہ کی تعداد میں تیز رفتار اضافہ کے
باعث کالج کو قابل اطمینان طریقہ پر چلانا ممکن نہ ہوگا' چنانچہ
ان کی جگہ عبدالمجید قریشی کا تقرر کیا گیا۔ قریشی صاحب کا
تقرر اس لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب تھا کہ وہ ایک نمایاں
شخصیت' دلکش انداز گفتگو اور احباب و رفقاء کار اور طلبہ سے
ہمدردی کے علاوہ علیگڈھ سے خاص انسیت رکھتے تھے' قریشی
صاحب کی یہ خصوصیات آج بھی اسی قدر نمایاں ہیں جیسی
پچیس سال قبل تھیں۔ کالج کی عمارت علیحدہ نہیں تھی بلکہ
منٹوسرکل کے چارھوسٹلوں میں سے ایک یعنی منٹو بی (B) کی بالائی
منزل پر کلاس روم تھے۔ اور یہیں لکچرز ہوتے تھے تعداد کے لحاظ
سے ۱۹۱۶ میں یعنی جس سال میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا
تھا' کالج اپنے عروج پر تھا۔

اس کی طرف اشارہ تو پہلے ہی کیا جاچکا ہے کہ میں نے
ارادہ کرلیا تھا کہ میں درس و تدریس ہی کو بطور پیشہ اختیار کروں
اور اب ہسٹری میں ڈگری لینے کے بعد یہ طے تھا کہ تاریخ کا
استاد ہی بننا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شفاعت احمد خان کے مشورے
سے پہلی کوشش کسی سرکاری کالج میں ملازمت حاصل کرنے کی
کی گئی[11]

ڈاکٹر شفاعت احمد خان

مزید واقعات کے ذکر سے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے
تعلقات کے متعلق چند الفاظ لکھنا نامناسب نہ ہوگا۔ شفاعت

احمد خاں کا وطن مرادآباد تھا، ان کے والد سجاد احمد خاں یہاں کے بڑے زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کی افادیت اور ضرورت سے کچھ زیادہ دلچسپی تھی مجھے تفصیلات نہیں معلوم لیکن سنا یہ ہے کہ میٹرک کے بعد اپنے والد کی خواہش کے خلاف مرادآباد چھوڑ کر چلے گئے اور شاید اپنے بزرگوں کی اعانت سے کچھ انتظام کر کے انگلستان چلے گئے اور اپنی تعلیم جاری رکھی، یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ حاصل کرلی۔ واپس آنے پر ان کا الہ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تاریخ تقرر ہوگیا۔ جس زمانہ میں، راقم الحروف میرٹھ کالج میں زیر تعلیم تھا، الہ آباد یونیورسٹی نے سربراوردہ پروفیسروں کو مختلف کالجوں میں بھیج کر خصوصی لکچروں کا پروگرام بنایا تھا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کا انتخاب میرٹھ کالج کے لئے ہوا، اور اسی وقت ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کو ملاقات نہیں بلکہ زیارت کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ صرف نیازمندی ہی کا موقع ملا۔ میں کالج کا طالب علم اور ڈاکٹر صاحب ایک عظیم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر اور سربراہ علاوہ ازیں اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کے خیالات، اور مطمح نظر بلکہ انداز گفتگو پر مغرب کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور انگریز پروفیسروں کی طرح وہ بھی خود کو ہندوستانی طلبہ کے مقابلہ میں ارفع و اعلاء شخصیت سمجتے تھے،

چند سال بعد، خاص طور پر پروفیسری کے ساتھ ساتھ (ریسرچ کو تقریباً خیرباد کہہ کر) جب انہوں نے عملی سیاست کی دنیا میں قدم رکھا تو ان کے خیالات اور روئیے میں تبدیلی رونما ہوئی اور پھر تو جب ان سے گفتگو ہوتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ دو

خالص مرادآبادیوں میں بے تکلفانہ انداز میں باتیں ہورہی ہیں، واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے، سیاست میں دلچسپی لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب، یوپی کی صوبائی اسمبلی کے لئے مرادآباد کے دیہی حلقہ سے کھڑے ہوئے، اس وقت ان کے کارکنوں کو خیال ہوا کے الیکشن میں مجھ سے کام لیا جاسکتا ہے، چنانچہ میں اور ظہیر احمد صاحب (مرحوم ایم بی احمد کے بڑے بھائی جو میرٹھ کالج میں زیر تعلیم تھے) مرادآباد پہنچے اور ہمیں کام کرنے کے لئے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹانڈہ میں بھیجا گیا، حلقہ کے اس حصہ میں ڈاکٹر صاحب کے سب سے زیادہ با اثر مددگار موضع بھوجپور کے زمیندار شیخ حمیدالدین تھے، وہ والد صاحب قبلہ مرحوم کے دوست تھے اور ہمارے خاندان سے بخوبی واقف تھے، انہوں ہی نے ڈاکٹر صاحب سے مجھے بلوانے کے لئے کہا تھا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس وقت الیکشن میں سیاسی پارٹیوں سے زیادہ با اثر افراد بالخصوص زمینداروں کی مدد اور کوشش زیادہ کارگر ثابت ہوتی تھی۔ حمیدالدین صاحب اپنے اور قرب و جوار کے علاقے میں مقبول اور با اثر تھے، اس لئے ڈاکٹر صاحب سمجھتے تھے کے ان کی مدد اور کوشش بہت مفید ثابت ہوگی۔ وہ کئی مرتبہ بھوجپور گئے اور شیخ صاحب سے گہرے بلکہ دوستانہ روابط قائم کرلئے۔

ٹانڈہ میں ہم نے نہایت محنت سے کام کیا، اور اس حلقہ سے اچھی خاصی تعداد میں ووٹ حاصل کئے۔ ڈاکٹر صاحب انتخاب میں کامیاب ہوئے اور اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے، اسمبلی میں ڈاکٹر صاحب کا کارنامہ قابل ذکر ہے۔ بنیادی طور پر ان کی تمام

کوششیں مسلمانوں کے حقوق کے لئے تحفظ حاصل کرنے پر مرکوز تھیں - مختصراً چند اہم اقدامات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے -

۱۹۲۲ کے بعد سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ مختصر دور جو لکھنؤ (۱۹۱٦) سے شروع ہوا تھا، ختم ہوگیا - یہاں ہمارے لئے تفصیلات بیان کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کے اسباب پر مفصل بحث کی جاسکتی ہے - اس دلچسپ اور اہم موضوع پر اب متعدد کتابوں میں مواد مل سکتا ہے، مسلم سیاسی لیڈروں میں بڑی تعداد ایسی تھی جنہوں نے واقعات سے مجبور ہوکر اپنے ہم مذہبوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کوششیں شروع کردی تھیں - لیکن ڈاکٹر شفاعت احمد کا ان سیاست دانوں میں شمار ہوتا ہے جو ابتداً ہی سے ان خطوط پر کام کرنے کا تہیہ کرچکے تھے، وہ مسلم لیگ میں شامل ہوچکے تھے، لیکن اس جماعت کے بعض اراکین، چند اہم مسائل پر جن میں ہندو مسلم اتحاد اور حکومت سے تعلقات کی نوعیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں اختلاف رائے رکھتے تھے - مثال کے طور پر مولانا محمد علی جوہر اور شفاعت احمد خان کو پیش کیا جاسکتا ہے - دونوں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور دونوں کے خلوص پر شبہ کرنے کا جواز موجود نہیں، لیکن انداز گفتار اور طریقائے کار میں بہت زیادہ فرق تھا -

شفاعت خان نیم سرکاری ادارے (یعنی الہ آباد یونیورسٹی جس کا چانسلر انگریز گورنر ہوتا تھا) میں ملازم تھے اور ظاہر ہے وہ حکومت کی مخالفت کھل کر نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی پروفیسری ترک کر کے خالص سیاسی لیڈر بن سکتے تھے - بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ شغل تدریس کے ساتھ ساتھ سیاسی زندگی سے

عملی تعلق ان کے لئے اسی وجہ سے ممکن تھا کہ حکومت سمجھتی تھی بلکہ اس کو یقین تھا کہ ان کی سیاسی کوشش کبھی نہج سے اس کے مفاد کے خلاف نہیں - بہرحال اپنی قابلیت اور خلوص کے باعث انھوں نے لیگ میں مقام حاصل کرلیا تھا، وہ صف اول کے لیڈروں میں تو نہیں پہنچ سکے لیکن اہم شخصیات میں ان کا شمار ضرور تھا، چنانچہ اس کے بعض اجلاسوں میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا، ۱۹۲۴ کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں لیگ نے ایک کمیٹی مسٹر جناح (قائد اعظم) کی سربراہی میں اس غرض سے نامزد کی کہ وہ خلافت کمیٹی سے ہندوستان کے لئے ایک مناسب دستور تیار کرنے کے سلسلہ میں گفتگو اور مشورہ کرے اس کمیٹی کے ایک رکن شفاعت احمد خان بھی تھے - آئیندہ لیگ کے تاریخی اجلاس منعقدہ علیگڈھ میں سر علی امام اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی طرف سے یہ ریزولیشن پیش ہوا کہ حکومت برطانیہ اس دستور میں جو ہندوستان میں نافذ تھا بنیادی ترمیمات کے لئے (جن میں سے بعض کی نشان دہی بھی تجویز میں کی گئی تھی) ایک رائل کمیشن مقرر کریں، اس میں مولانا محمد علی نے چند ترامیم پیش کیں جو منظور نہ ہوسکیں چنانچہ انھوں نے اصل ریزولیشن کی مخالفت کی - اس کی تائید میں مسٹر جناح کے ساتھ شفاعت احمد خان اور ملک برکت علی نے تقریریں کیں - بالاخر بہت بھاری اکثریت سے ریزولیشن پاس ہوگیا - اسی اجلاس میں مسٹر مسعودالحسن (بیرسٹر مرادآباد) اور شفاعت احمد خان نے ایک ریزولیشن پیش کیا کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی نگہبانی اور آپس میں صلح قائم رکھنے کے لئے ضلع کی سطح پر

صلح بورڈز قائم کئے جائیں، یہ تجویز بھی منظور کرلی گئی۔ ۱۹۲۶ کے دھلی اجلاس میں شیخ دین محمد کی اس تحریک پر کہ پنجاب کی حکومت میں کم از کم ایک مسلم وزیر کا تقرر کیا جائے' شفاعت احمد خان نے اپنی تقریر میں اس امر پر زور دیا کے یہ مطالبہ "روٹی اور مچھلیوں" کی حصول کی بنیاد پر نہیں کیا جارہا ھے' بلکہ اس لئے ضروری ھے کہ اس کے بغیر ایک اہم طبقہ یعنی مسلمانوں کو حکومت پر اعتماد نہیں ھوسکتا۔ اسی اجلاس میں لیگ نے ایک مرکزی اور اس کے علاوہ صوبائی کمیٹیاں مقرر کیں کہ دوسری جماعتوں کے نمائندوں سے رابطہ قائم کر کے دستور میں ترمیمات کے لئے رائل کمیشن کے تقرر پر گفتگو کریں اور اپنی رپورٹیں مرکزی کمیٹی کو بھیج دیں۔ یوپی کمیٹی کے ممبروں میں شفاعت احمد خان بھی تھے۔

۱۹۲۸ کا سال برصغیر کی سیاسی تاریخ اور جنگ آزادی کی بڑھتی ھوئی رفتار میں خاص اھمیت رکھتا ھے۔ ۱۹۲۷ میں حکومت برطانیہ نے سرجان سائمن کی صدارت میں ایک رائل کمیشن اس غرض سے مقرر کیا کے آئیندہ دستوری اصلاحات کے لئے سفارشات مرتب کرے چونکہ اس میں صرف انگریز ھی ممبر تھے اور کسی ھندوستانی کو نہیں لیا گیا تھا' اس لئے کانگریس' خلافت کمیٹی اور جمیعتہ العلماء ھند نے اس کا بائیکاٹ کیا' مسلم لیگ میں اس پر اختلاف رائے تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کے بعض اراکین نے سر محمد شفیع کی صدارت میں ۳۱ دسمبر کو ایک جلسہ کیا' جس میں کمیشن کے ساتھ تعاون کے لئے ریزولیشن منظور کیا گیا۔ یہ امر قابل ذکر ھے اور دلچسپی کا بھی ایک پہلو رکھتا ھے کہ ریزولیشن

مسٹر غزنوی نے پیش کیا تھا' اور اس کی تائید مولانا حسرت موھانی نے کی۔ اسی اجلاس میں شفاعت احمد خان نے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی گرانٹ میں اضافہ کے متعلق ایک ریزولیشن پیش کیا جو منظور ھوگیا۔

لیکن اس سلسلہ میں شفاعت احمد خان کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ سائمن کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے انھوں نے یوپی کے مسلمانوں کی طرف سے ایک طویل یاد داشت مرتب کی جس کی اھمیت سیاسی سے زیادہ تاریخی ھے۔ کمیشن پر اس کا اثر زیادہ نہیں ھوسکتا تھا۔ حقیقت یہ کہ مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ھوگئی تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت اور ان کے اکثر ممتاز سیاسی لیڈر اس جماعت کے ساتھ تھے جس کے صدر مسٹر جناح تھے اور جس نے اپنا اجلاس اسی سال (۱۹۲۷) کلکتہ میں منعقد کیا، بعد میں شفیع گروپ والی لیگ جس کا اجلاس لاھور میں ھوا تھا ختم ھوگئی۔ لیگ کی یہ عارضی تقسیم جس کی ذمہ داری شفیع گروپ پر تھی اس لحاظ سے اھم ھے کے اس کے بعد سے لیگ میں وہ عنصر کمزور ھوتا چلا گیا جو ھر صورت میں حکومت برطانیہ سے وفاداری اور تعاون کا حامی رھتا تھا۔

شفاعت احمد خان نے جو محضر (minute) سائمن کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار کیا تھا' اس کا ذکر مولانا طفیل احمد[12] نے اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں ان الفاظ میں کیا ھے:

ایک طرف تو ملک کی طرف سے سائمن کمیشن کا پرزور مقاطعہ کیا جارھا تھا' دوسری طرف ھندو مسلمانوں کی بعض جماعتیں

اپنی اپنی عرضداشتیں سائمن کمیشن کے سامنے پیش کررہی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم اور وقیع صوبہ متحدہ کے مسلم ممبران اور کونسل کی اکثریت نے جولائی سنہ ۱۹۲۸ میں ممبران مذکور کی خدمت پیش کی۔ یہ عرضداشت فل اسکیپ کاغذ کے پانچ سو صفحات پر تھی۔ اس میں سب سے زیادہ زور زبان، تمدن اور مذہب کی حفاظت پر ان تعلیم یافتہ اصحاب کی طرف سے دیا گیا تھا جو بقول مولوی بشیرالدین (اٹاوہ) اپنی زبان اور اپنا تمدن چھوڑ کر، انگریزی زبان اور انگریزی تمدن اختیار کرچکے ہیں۔ اس عرضداشت میں زبان تمدن اور مذہب کے مطالبہ کے ساتھ، یورپ کے ان ممالک کی نظیرین پیش کی گئی تھیں جو یورپ کی لڑائیوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ازسرنو بنائے گئے تھے اور جس کی وجہ سے بعض اقلیتیں ایسی حکومتوں کے تحت میں آگئیں جن کی زبان اوار قانون، مذہب اور تمدن سب کے سب مختلف تھے۔ اس لئے یورپ میں ان اقلیتوں کی حفاظت کی ضرورت پیش آئی تھیں۔ مگر ہندوستان کی حالت تو بالکل مختلف ہے جہاں ایک ہزار سال سے زیادہ مختلف قومیں ایک ہی حالت میں چلی آرہی ہیں اور ایک ہی زبان بولتی ہیں اور اپنے اپنے مذہب پر قائم ہیں اور ملک کی کوئی ایسی بین اور نمایاں تقسیم نہیں جس سے عام حالت میں فرق پڑتا''۔

اس اقتباس سے اور آگے کے بعض دوسرے فقروں سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے مسلمانوں کی تاریخ اور بنیادی مسائل کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا اور کانگریس کی تائید کے جذبہ سے مغلوب ہوکر ان کے ہر اقدام پر طعنہ زنی اور مخالفانہ

تنقید کی ہے، لیکن ہمارے زیر غور اس وقت یہ مسائل نہیں اور نہ مولوی طفیل احمد کی شخصیت اور ان کے خیالات ہیں۔ ہم اقتباس کے چند فقروں سے شفاعت احمد خان کی تیارکردہ یادداشت کے اندراجات اور اس میں جو تاریخی مواد ہوگا اس کا اندازہ لگاسکتے ہیں[13]۔

جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے سنہ ۱۹۲۸ سے ۳۶ء تک آٹھ سال کے عرصہ میں برصغیر کی سیاسی زندگی مین عظیم انقلابات رونما ہوئے، مسلمانوں کے نقطہ نظر سے دو واقعات قابل ذکر ہیں اور انقلابی حیثیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے لیگ کے خطبہ صدارت میں وہ مطالبہ پیش کیا جس کا تصور مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے بعض طبقات مین چند سال سے پھیلتا جارہا تھا یعنی برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ ایک خود مختار مملکت کا قیام۔ دوسرا اہم واقعہ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کی ازسرنو تنظیم تھی۔ موخرالذکر تبدیلی کے بعد لیگ کا پہلا اجلاس سنہ ۱۹۳۶ء میں بمبئی مین ہوا اور دوسرا ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں۔ غالباً یہ لیگ کا آخری اجلاس تھا جس میں شفاعت احمد خان نے شرکت کی اس کے بعد وہ لیگ سے الگ رہے لیکن جسقدر لیگ کی مقبولیت بڑھتی گئی اسی قدر اس سے علیحدہ ہوجانے والوں کی سیاسی تصویر دھندلی ہوتی گئی، سنہ ۱۹۴۶ء میں جب لیگ نے Interim Govt. میں شروع میں شریک ہونے سے انکار کیا تو وائسرائے نے تین مسلمانوں یعنی شفاعت احمد خان، آصف علی اور سید علی ظہیر کو مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے کیبنٹ

میں لے لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد شملہ میں شفاعت احمد خان پر
کسی نے قاتلانہ حملہ کیا اور وہ زخم سے جانبر نہ ہوسکے۔

انٹر میڈیٹ کالجز کی اسکیم (۱۹۲۶-۳۲)

نظام تعلیم سے متعلق جن مسائل پر ماہرین میں اختلاف رائے
رہا ہے، ان میں ایک اہم مسئلہ انٹرمیڈیٹ کلاسز کی حیثیت اور
مقام کا ہے، یونیورسٹیاں قائم ہونے کے بعد سے ان جماعتوں کی تعلیم
یونیورسٹی میں یا اس سے الحاق شدہ کالجوں میں، بی اے اور ایم اے
کے ساتھ ہوتی تھی، اس طرح مکمل تعلیم کا دور دو منزلوں پر
مشتمل تھا، اسکولوں میں دسویں جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی
اور اس کا آخری امتحان میٹری کیولیشن اور بعد میں اسکول لیونگ
سرٹفیکٹ کا امتحان کہلاتا تھا، اس میں کامیابی کے بعد ایف اے
یا ایف ایس سی یعنی انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں داخلہ ہوتا تھا،
میں نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے اسکول لیونگ سرٹفیکٹ کا
امتحان سیکنڈ ڈویژن میں مرادآباد کے مشن اسکول سے پاس کیا
تھا، اور انٹرمیڈیٹ و بی اے کے امتحانات میرٹھ کالج سے پاس کئے
تھے جو اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے تحت تھا۔

معیار تعلیم

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں تعلیم کا معیار آجکل
کے معیار سے کافی زیادہ بلند تھا، یہاں تفصیلی تقابل کی گنجائش
تو نہیں لیکن بعض متعلقہ امور کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے،
بنیادی حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں ذمہ داریوں کا احساس
کم و بیش ہر شخص کو تھا، مجھے یاد نہیں کہ اسکول میں کوئی

استاد بھی کلاس میں دیر سے آنے کا عادی تھا۔ ادھر گھنٹہ بجا
اور ادھر استاد اپنا رجسٹر لئے ہوئے کلاس میں داخل ہوگیا، اسی
طرح بغیر وقت ضایع کئے وہ برابر پڑھاتا تھا، اساتذہ کی پابندی
وقت اور سنجیدگی سے کام کرنے کا طلبہ پر یہ اثر ہوتا تھا کہ وہ
بھی پابندی کے ساتھ وقت پر اسکول پہنچتے اور کلاسوں میں
داخل ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ڈرل یعنی جسمانی
ورزش اور ریسس (recess) کے علاوہ اسکولوں کے احاطہ میں
کالجوں سے باہر طلبہ نظر نہیں آتے تھے، آج آزادی اور مساوات کا
تصور اسقدر مسخ ہوگیا ہے کہ اس میں اور بے ادبی و بدتہذیبی
میں بہت کم امتیاز باقی رہ گیا ہے، انتہائی تنگدست اور محدود
تعلیم حاصل کئے ہوئے اساتذہ کا بھی معاشرے میں احترام کیا جاتا
تھا۔ شروع ہی سے طالب علم کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوجاتا
تھا کہ استاد کا احترام لازمی اور ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ
انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر
شعیب قریشی، جنھوں نے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی اپنے اقرباء
سے ملنے مرادآباد آئے تھے، وہ والد صاحب قبلہ مرحوم کے
شاگرد تھے، چنانچہ ان سے ملاقات کے لئے ہمارے گھر آئے۔
والد صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے آرام فرما رہے تھے، میں اور
میرے چھوٹے بھائی عرفان الحق مرحوم اور برادر محترم سید
احسان الحق مرحوم جو شعیب صاحب کے اسکول میں معاصر بھی
رہے تھے، فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ والد صاحب کی
چارپائی کے برابر ایک کرسی موجود تھی، لیکن شعیب صاحب نے
اصرار کیا اور والد صاحب کے پاؤں کے قریب ہی بیٹھے اور یہی

کہتے رہے کہ ہماری عزت اسی میں ہے کہ آپ کے قدموں میں بیٹھیں' ہم سب کے متعلق مفصل حالات معلوم کرتے رہے اور جب ان کو یہ پتہ چلا کہ عرفان مرحوم نے میٹرک کے بعد تعلیم ترک کردی تھی اور کہیں ملازم بھی نہیں تھے تو والد صاحب سے کہا کہ وہ ان کی ملازمت کے لئے اپنے دوست مسٹر غلام محمد کو جو اس وقت ریلوے کے اعلیٰ افسر تھے خط لکھیں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد عرفان کی تقرری کا خط آیا لیکن وہ مرادآباد سے باہر جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے' استادوں کے احترام میں شعیب صاحب منفرد نہیں تھے' بلکہ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہر شریف انسان اعلیٰ مراتب پر پہنچکر اپنے استادوں کا اسی طرح احترام کرتا تھا' اس واقعہ کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں سہولت ہوکہ آج سے نصف صدی قبل بزرگوں کا احترام کس طرح کیا جاتا تھا اور اس کے نتائج نوجوانوں کو کس طرح متاثر کرتے تھے' اسکولوں کے ماحول اور تربیت سے متاثر ہوکر طلبہ جب معاشرے میں داخل ہوتے تھے' تو ان کے کردار اور طریقوں کو مثالی تصور کیا جاتا تھا' یہی وجہ تھی کہ تعلیمیافتہ طبقہ کو معاشرے میں نمایاں حیثیت تھی۔

پہلی جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴

یہ ساٹھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ پہلی جنگ عظیم کی حربی ہولناکیاں تو ختم ہوچکی تھیں لیکن انہوں نے دنیا کے مختلف معاشروں کو جس طرح متاثر کیا تھا' انہی کے نتائج زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آنے لگے تھے' اختتام

جنگ پر فاتح اقوام نے صلح کے بعد شکست خوردہ قوموں سے جس بےدردی اور ناانصافی کا رویہ اختیار کیا' اس کی تفصیلات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ اس کے متعدد ابواب میں ہم صرف سلطنت عثمانیہ کی تقسیم اور تباہی کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں' اس لئے کہ اس کے سربراہ خلیفتہ المسلمین بھی تھے اور اس حیثیت سے سارے عالم اسلام کا ان سے ایک تعلق تھا اگرچہ کہ یہ تعلق اب برائے نام اور جذباتی حدتک تھا' پھر بھی عثمانی سلطان یعنی خلیفتہ المسلمین کی ذات سے بحیثیت خادم الحرمین' مسلمانان عالم کو خاص لگاؤ تھا۔ انگریز اس پر ناز کرتے تھے کہ مسلمانوں کی غیر معمولی کثیر تعداد ان کے زیر حکومت ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ مسلمان بھی جو ان کے محکوم ہیں سلطان روم یعنی خلیفتہ المسلمین سے کیا تعلق قایم رکھے ہوئے ہیں' جنگ عظیم (اول) سے دو سال قبل ہی جنگ بلقان میں انہوں نے جس جوشیلے انداز میں ترکوں سے اظہار ہمدردی کیا تھا اس سے تاریخ کے طلبہ ناواقف نہیں ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ میں ترکی کے لئے جب چندے کی رقوم جمع ہورہی تھی تو علیگڈھ کالج کے طلبہ نے جن کی اکثریت ہوسٹلوں میں رہتی تھی گوشت کھانا چھوڑکر صرف دال پر اکتفا کی تھی تاکہ اس طرح جو رقم ان کے کھانے کے اخراجات سے بچے وہ ترکی بھیجدی جائے' جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران بھی ان کو ترکوں سے ہمدردی تھی لیکن اس کا عملی طور پر اظہار ممکن نہ تھا' لیکن ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے عظیم رہنماء مولانا محمد علی جوہر کو اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں

(Choice of the Turks) کے عنوان سے مقالہ لکھنے پر ھی جیل بھیجا گیا تھا۔

خلافت کا خاتمہ سنہ ۱۹۲۴

بہرحال جنگ کے خاتمہ پر جو صلحنامے مرتب ہوئے ان کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کے وسیع علاقوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یہ ریاستیں نیم خود مختار تھیں کیونکہ ان پر برطانیہ اور فرانس کا اقتدار قائم رکھا گیا تھا۔ اس وقت مسلمانان برصغیر برادران وطن یعنی ہندوؤں کے ساتھ مل کر برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہے تھے اور اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے دونوں قوموں کے درمیان لکھنؤ پیکٹ (۱۹۱۶) ہوچکا تھا برصغیر کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم یعنی انڈین نیشنل کانگریس جس پر ہندو اکثریت کا زبردست غلبہ تھا جنگ کے دوران یہ امید قائم کئے رہی کہ اس کے اختتام پر ہندوستان آزدی حاصل کر لے گا، لیکن جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے لیڈروں نے اندازہ کرلیا کہ برطانوی یقین دھانیاں "وعدہ ھائے فرنگی" ھی تھے، چنانچہ آزادی کی جنگ تیزتر ہوتی گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی کی شخصیت ہندوؤں میں اور مولانا محمد علی جوھرکی حیثیت مسلمانوں میں عظیم ترین لیڈوں کی ہوگئی، دونوں میں یگانگت اور اتفاق رائے بھی انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ مسلمانوں کے لئے آزادی کی جنگ کے علاوہ خلافت کے تحفظ کا مسئلہ بھی نہایت اہم تھا، چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ادارہ "خلافت کمیٹی" کے نام سے قائم ہوچکا تھا۔ کثیر تعداد میں مسلمان اس

میں داخل ہوچکے تھے اور حصول مقصد کے لئے کوشش کر رہے تھے، علی برادران یعنی مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی، اور مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے عظیم رہنماؤں میں تھے۔ ان کے علاوہ متعدد علماء اور دوسرے مسلمان لیڈر بھی تحریک میں شامل تھے، گاندھی جی نے انتہائی سیاسی دانشمندی سے کام لے کر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہمدردیاں بھی خلافت تحریک کے لئے پیش کردی تھیں۔ اس طرح جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی متحدہ کوششیں مضبوط ہوگئیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اسی صورت حال نے برطانوی مدبرین کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کردیا کہ بالاخر ان کو برصغیر سے دستکش ہونا ھی پڑے گا۔

جنگ کے خاتمہ پر یعنی ۱۹۱۹ سے برصغیر میں دونوں تحریکیں زور شور سے چل رہی تھیں۔ اس تحریک کی عمر مختصر تھی۔ لیکن ان دوتین سالوں میں ہندو اور مسلمان، دونوں نے عظیم الشان مالی اور جانی قربانیاں دیں اور بےشمار لوگ جیلوں میں ڈال دئے گئے، لیکن زیادہ دن نہ گذر نے پائے تھے کہ بعض ہندو لیڈروں نے جن میں پنڈت مدن موہن مالویہ اور شردھانند پیش پیش تھے، ہندو مہاسبھا کی کوششوں کو جو شروع ہی سے فرقہ واریت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، تیز تر کردیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں ہل گئیں اور دونوں قومیں لڑنے جھگڑنے لگیں، اور آپس کے بلوے لوٹ مار، آتش زنی اور قتل و غارت کے واقعات عام ہوگئے، اتحاد تحریک پارہ پارہ ہوگئی اور بعض مخلص لیڈروں کی کوششیں جو انھوں نے اس

مین جان ڈالنے کےلئے کیں نا کام ثابت ہوئیں ۔

ہندو مسلم اتحاد کی بڑھتی ہوئی نا کامی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ تحریک خلافت بھی کمزور ہونے لگی' لیکن اس کی نا کامی کا بڑا سبب بین الاقوامی سیاست کے اثرات تھے' صلحناموں کی رو سے سلطنت عثمانیہ کے علاقے کو بے حد مختصر کردیا گیا تھا' اسی زمانہ میں ترکوں کی شکت خوردہ اور انحطاط پذیر قوم کی قیادت مصطفیٰ کمال (جن کو بعد میں اتاترک کا لقب دیا گیا) کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی فراست اور بہادری کے نتیجہ میں ترکوں نے اپنے حریف یعنی یونانیوں پر فتح حاصل کی اور بالاخر فاتحین جنگ عظیم کو ترکی سلطنت (جس کو مسلمان سلطنت روم کہتے تھے) کی خود مختارانہ حیثیت تسلیم کرنا پڑی۔ اتاترک نے سلطنت کو ختم کرکے جمہوریہ (Republic) قائم کی۔ اتاترک کی فتح اور اصلاحات پر برصغیر کے مسلمان بہت خوش تھے اور مختلف طریقوں سے انہوں نے اپنی خوشیوں کا اظہار کیا تھا، لیکن جمہوریہ ترکیہ کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کے پہلے صدر یعنی اتاترک کی قیادت میں وہاں کی پارلیمنٹ نے "خلافت" کو ختم کردیا۔ اس پر مسلمانان برصغیر کو جو صدمہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

اس پس منظر کا قدرے تفصیلی ذکر اس لئے ضروری تھا کہ جنگ عظیم کے ہولناک واقعات اور اس کے اختتام پر صلحناموں کے ذریعہ فاتح اقوام کے نمائندوں نے جو نیا نقشہ دنیا کا تیار کیا، اس نے زندگی کے سیاسی' اقتصادی اور اخلاقی پہلوؤں پر جو

انقلابی نقوش چھوڑے ان میں آخرالذکر اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اخلاقی زندگی سے متعلق بنیادی اقدار میں تبدیلی فرد کی شخصیت کو قطعی طور پر بدل دیتی ہے اور جب یہ تبدیلی ملک گیر یا عالمگیر حیثیت حاصل کرلیتی ہے تو معاشرہ یا سوسائٹی دوسرا رنگ اختیار کرلیتی ہے' اس انقلاب نے جو اس صدی کی تیسری دہائی سے شروع ہوا انسانی معاشرے کے اخلاقی پہلو کو بہت بڑی حد تک سیکیولر (لادینی)[14] بنا دیا۔ یہاں "مذہبیت" اور "لادینیت" کے تقابل پر بحث کرنا منظور نہیں، لیکن معاشرے میں سیکیولرزم کے غلبہ کا ایک لازمی اثر یقیناً قابل ذکر ہے' اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تعلق "احترام" سے ہے۔ مشرقی روایت میں بنیادی تصورات حیات کو ایک اہم اور بلند مقام حاصل رہا ہے وہ رفتہ رفتہ غایب ہونے لگا (مجھے یاد ہے کہ برادر محترم سید احسان الحق مرحوم کی طرح جب میں نے ہائی اسکول کی اعلیٰ جماعت میں پہنچنے پر شیو (یعنی داڑھی مونڈنا) شروع کیا تو کوشش کرکے ایسی جگہ بیٹھتا تھا جہاں والد صاحب قبلہ کا سامنا نہ ہو)۔

بزرگوں کا احترام جس کی اس دور میں بچوں کو ابتداء ہی سے تربیت دی جاتی تھی یہاں تک کہ یہ تصور ان کے ذہنوں میں مضبوط طریقہ سے جم جاتا تھا' اب صاف طور پر غائب ہوتا ہوا نظر آتا تھا' جنگ آزادی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار اور اس سلسلہ میں عوام کا سڑکوں پر آجانا اس لحاظ سے خوش آیند تھا کہ برطانوی استعمار کا خوف دلوں سے جاتا رہا' لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بزرگوں کا احترام جن میں والدین اور

اساتذہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تیزی کے ساتھ کم ہوتا گیا۔ علیگڈہ میں جہاں طلبہ کی کثیر تعداد ہوسٹلوں میں رہتی تھی اس تبدیلی کا اثر نظر تو آتا تھا لیکن بہت کم۔ طلبہ کی رہائشی زندگی سے میرا بھی تعلق بحیثیت وارڈن براہ راست کم و بیش بیس سال تک رہا، مگر اس طویل مدت میں کسی ایک طالب علم سے بھی مجھے یہ شکایت نہ ہوئی کہ وہ میرے ساتھ بدتہذیبی کا مرتکب ہوا، اگرچہ ان میں سے بعض انتہائی شریر تھے، ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے، میں جوبلی ہوسٹل کا وارڈن تھا، ۳۱ مارچ اور پہلی اپریل کی درمیانی شب کو سب لڑکے ہوسٹل میں سو رہے تھے اور میں بھی وہیں سو رہا تھا، یکایک دو بجے کے قریب چند طالب علم آئے اور نہایت ادب سے مجھے بیدار کر کے کہا کہ ایک طالب علم ہوسٹل کی چھت پر سے گر گیا ہے اور اس کے بہت چوٹ آئی ہے۔ میں اس کو دیکھنے گیا تو چارپائی پر بےہوش لیٹا تھا اور جو چادر اوڑھے ہوئے تھا اس پر خون کے کافی دھبے تھے، میں نے فوراً ایک خط لکھ کر میڈیکل آفیسر کو بلایا جن کو سائکل پر آنے میں یقیناً زحمت ہوئی۔ وہ بھی دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ چوٹ شدید ہے، ان کو فوراً ہسپتال بھجوانے کا انتظام کیجئے۔ یہ ہدایت دینے کے بعد جب وہ جانے لگے تو وہ لڑکا یکایک چارپائی سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ 'سر' دو گھنٹے ہوئے کہ اپریل فول کا دن شروع ہو گیا ہے۔ میرے پاس بھی چند "سینیر" طلبہ آئے اور زحمت دہی کی معافی مانگنے لگے۔ دوسرے روز مجھے بھی ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہی کرنا پڑی۔ سرخ روشنائی کے جو دھبے چادر پر ڈالے گئے تھے، ان کو عجلت اور

پریشانی کے باعث نہ میں پہچان سکا اور نہ ڈاکٹر صاحب۔ اس حرکت پر سزاء نہیں دی گئی کیونکہ انگریزی اقتدار کے زمانہ میں اپریل فول منایا جاتا تھا۔

کالج لکچراری کی کم و بیش آٹھ سالہ مدت میں بہت سے واقعات کا سامنا کرنا پڑا جن میں بعض یقیناً تلخ بھی تھے، نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر احباب اور رفقائے کار میں سے چند کا مختصر الفاظ میں ذکر کروں، کالج کے پرنسپل پروفیسر عبدالمجید قریشی ریاضیات کے استاد تھے۔ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے جو اس فن میں اپنی غیر معمولی قابلیت کی بدولت بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے اور اب بحیثیت پرووائس چانسلر یونیورسٹی کی اکیڈمک لائیف کے سربراہ تھے، کے شاگرد تھے ان کے معتمدین میں شامل تھے کالج کی ذمہ داریاں ان کو اسی وجہ سے سپرد کی گئی تھیں۔ اس ادارے مین طلبہ کی تعداد کافی زیادہ تھی اور ان کو قابو میں رکھنے اور مسائل حل کرنے کے لئے انتہائی تجربہ کار اور ذہین شخص کی ضرورت تھی۔ قریشی صاحب (مرحوم) نے سات آٹھ سال (۱۹۲۴-۱۹۳۲) کی پرآشوب مدت میں نہایت کامیابی سے اپنے فرائض انجام دئے۔ سب سے نمایاں خصوصیت ان کے کردار کی یہ تھی کہ سخت منتظم (ڈسپلنیرین) ہونے کے باوجود طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے، اول الذکر خطا پر سزاء کم دیتے لیکن ڈانٹ خوب پلاتے تھے، قریشی صاحب (مرحوم) جن کی وفات حال ہی میں ہوئی ہے، علیگڈہ کالج اور بعد ازاں مسلم یونیورسٹی کی ممتاز ترین شخصیات میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ جس جلسہ میں تشریف فرما ہوتے اپنی شخصیت اور ذاتی وقار کی

بدولت نمایاں حیثیت حاصل کرلیتے۔ یوں تو ہر اس ذمہ داری کو جو ان کے سپرد کی جاتی وہ نہایت خوبی اور کامیابی سے سرانجام دیتے، لیکن انتظامی امور (administration) میں ان کی کامیابیاں خاص طور پر نمایاں تھیں۔ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے خاص شاگرد تھے، اور علیگڈھ کی زندگی میں ہر موقعہ اور مشکل میں ان کے لئے تیار رہتے تھے، سینیر اساتذہ کی جماعت میں دو فریق ہوگئے تھے، ایک وہ جو ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حکمت عملی اور خیالات سے متفق تھی، اور دوسرا وہ جو ان کی مخالفت کرتا تھا، یہ ظاہر ہے کہ قریشی صاحب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھے، لیکن ان کے تعلقات تمام اساتذہ سے اچھے تھے، قریشی صاحب کے اوصاف پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن میں نے ان کا ذکر مختصر الفاظ میں کیا ہے، میرے دل میں ان کا احترام ہمیشہ بہت زیادہ رہا اور اگرچہ میں ان کا شاگرد نہیں تھا، میں ان کو اپنا بزرگ ہی سمجھتا تھا۔

پرنسپل قریشی صاحب کے علاوہ چند دیگر رفقائے کار ذکر بھی مختصر الفاظ میں کرنا چاہئے، وائس پرنسپل سید ولی محمد صاحب انگریزی زبان کے لکچرار تھے، سادہ مزاجی کے علاوہ، پابندی اوقات اور ادائیگی فرض کا شدید احساس، ان کی نمایاں خصوصیات تھیں، ان کا مکان ہمارے غریب خانے کے قریب تھا، ان کی دوسری شادی ہوئی تھی اور بیگم صاحبہ سے میری بیوی کے بہت اچھے تعلقات تھے، لیکن سید صاحب ''گہری دوستی'' کے قائل نہ تھے، ہر وقت ''سنجیدہ'' رہتے تھے ہنستے بہت کم تھے، کبھی کبھی مسکرادیتے تھے، انگریزی کے دوسرے لکچرار، میرے پڑوسی اور قریبی دوست

عبدالشکور صاحب دیکھنے میں سنجیدہ نظر آتے لیکن ان کی طبیعت اور گفتگو میں مزاح کا انداز غالب تھا۔ شام کو اکثر ہم دونوں بیٹھ کر ہر قسم کے موضوعات یا علیگڈھ کی اصطلاح میں گپ کرتے رہتے۔ اکثر کھانا بھی ساتھ کھاتے تھے۔ کالج میں فرصت کے وقت میں کبھی کبھی آتے اور کہتے: ممون! چلو ذرا سید صاحب کے پاس چلیں، ذرا ان کی مسکراہٹ دیکھیں گے، وائس پرنسپل کا دفتر ایک انتہائی مختصر کمرے میں تھا جو پرنسپل کے دفتر سے ملحق تھا، میز پر ایک شلف (چھوٹی الماری) میں ہر وقت عرضیاں اور دوسرے دفتری کاغذات رکھے رہتے تھے اور سید صاحب ان کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ ہم دونوں جا کر سلام عرض کرتے تو نہایت غیر جذباتی انداز میں جواب دیتے۔ میں تو خاموش رہتا، لیکن شکور صاحب دریافت کرتے، کہئے سید صاحب، جلندھر (یعنی ان کی سسرال میں) خیرت، سید صاحب مسکراتے ہوئے جواب دیتے، خدا کا شکر ہے اور جواباً ہمارے متعلقین کی خیریت بھی دریافت فرماتے، تقسیم ہند کے بعد سید صاحب بھی پاکستان آگئے، سنہ ۱۹۵۰ء میں جب میں کراچی میں اردو کالج کا وائس پرنسپل ہوا تو میں نے ان کو یہاں بلالیا اور انگریزی کا شعبہ ان کے سپرد کردیا۔

فارسی کے لکچرار، محمد صادق صاحب، باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، خوش لباسی اور شیریں گفتاری ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ نصابی کتابوں کے علاوہ مطالعہ سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، لیکن ایک کامیاب استاد تھے اور طلبہ ان سے مطمئن رہتے۔ عمدہ کھانوں کے شوقین تھے اور ڈائننگ ہال اور باورچی خانہ

کے انتظام میں جو ان کے سپرد تھا بہت دلچسپی رہتی۔ طالب علمی
کے زمانہ ھی سے انھوں نے اپنے لئے مقام پیدا کرلیا تھا۔ بعد میں
وہ ان چند اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے جن پر ڈاکٹر ضیاءالدین
کو بہت اعتماد تھا' شاعر تھے لیکن شعرگوئی کا خبط نہیں تھا'
تقاریب کے مواقع پر ان سے مزاحیہ قصیدے لکھنے کی فرمائش
کی جاتی تو دلچسپ نظمیں لکھکر اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر
سناتے جس سے سامعین بےحد محظوظ ہوتے۔ لاولد تھے اور اولاد کی
بہت خواهش تھی کافی عمر گذر جانے کے بعد دوسری شادی کی'
رٹائر ہونے سے پہلے ھی بیکری کھول کر کاروبار شروع کردیا تھا۔
اب مرحوم ہوچکے ھیں۔

عبدالشکور صاحب کو ڈربن (افریقہ) کے کالج میں جگہ
مل گئی' ان کے جانے کے بعد برابر کے مکان میں جناب عبدالاحد
صاحب لکچرار ریاضی آگئے' ان سے بحیثیت پڑوسی اور رفیق کار
گہرے تعلقات رہے۔ نہایت اچھے اور باعمل مسلمان تھے' ان
کے بھتیجے سید ناصرالدین اب کراچی کے ممتاز وکلاء میں شمار
کئے جاتے ھیں۔

چند ان رفقائے کار کا ذکر بعد میں کیا جائے گا جو میری طرح
سنہ ۱۹۳۲ میں کالج ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی اسٹاف میں
لے لئے گئے' لیکن اپنے عزیز دوست پروفیسر سعیدالزمان لکچرار تاریخ
کا ذکر ضروری ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں اسپورٹس سے اپنی
دلچسپی اور شغف کے لئے مشہور تھے' کالج اسٹاف پر آنے کے بعد
ان سے بہت جلد تعلقات شروع ہوئے اور تھوڑے ھی مدت میں
گہرے دوستوں کے مختصر دائرے میں وہ بھی شامل ہوگئے' ان

کے خلوص اور محبت کی جسقدر بھی تعریف کی جائے' کم ھی معلوم
ہوتی ہے' کوئی مسئلہ اور موقع ایسا نہ ہوتا جس میں وہ اپنے
احباب کی مدد اور خدمت کرنے کے لئے ہمہ تن تیار نہ ہوجاتے ہوں
حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے کہ سر شاہ محمد سلیمان قائم مقام
وائس چانسلر نے ان کے اور عربی کے لکچرار جناب توقیر مرزا
کے تقررات کو ختم کردیا' اور مستقل نہیں کیا۔ سعید' حیدرآباد
دکن چلے گئے اور گلبرگہ کالج میں لکچرار ہوگئے۔ چند سال بعد
علیگڈھ کے ایک وفد میں جس میں شیخ عبدالرشید اور ڈاکٹر
امیر حسن صدیقی مرحوم بھی شامل تھے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا
تو سعید کی خواہش اور کوشش کے نتیجہ میں ہم لوگ گلبرگہ
گئے جہاں حضرت خواجہ گیسو درازہ کے مزار پر حاضری کا موقع
ملا۔ سعید نے اپنے کالج میں ایک جلسہ کیا جس میں طلبہ اور
اساتذہ کے علاوہ عمائدین شہر بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔
انسپکٹر آف کالجز نے جلسہ کی صدارت کی' چونکہ اس زمانہ
میں میرے لکچرز اور بالخصوص سلطان محمد بن تغلق پر تحقیقی
کام کی ایک حد تک شہرت ہوچکی تھی' سعید نے مجبور کیا کہ
جلسہ سے میں اسی موضوع پر خطاب کروں' میں نے بہت معذرت
کی مگر سعید اس کا اشتہار دے چکے تھے' اور اس پر تیار نہ
ہوئے کہ اس لیکچر کو ملتوی کیا جائے' خدا کا شکر ہے کہ
لکچر نہایت کامیاب رہا۔ سامعین خاص طور پر کیپٹل تھیوری
(یعنی سلطان کا دھلی کے علاوہ دولت آباد کو بھی دارالحکومت کا
درجہ دینا) اور اس کی اس پالیسی کے نتائج یعنی اسلامی تہذیب
اور ثقافت کی ترویج اور ترقی کے متعلق دلائل اور تشریحات سے

بہت خوش ہوئے۔ مقامی حلقوں میں سعید کے اس اقدام نے ان کی بھی مقبولیت میں اضافہ کیا، وہ بے حد خوش تھے' اور ان کی خوشی ہمارے لئے بھی باعث مسرت تھی۔ تقسیم کے بعد سعید بھی پاکستان آگئے اور اپنے وطن لاہور میں رہنے لگے' لیکن افسوس ہے کہ ان کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہوگیا اور یہاں ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ یہ خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا تھا۔ ان کے خلوص اور محبت کی یاد ایسی نہیں جس کو بھلا دیا جائے!

باب پنجم

یونیورسٹی میں لکچراری۔ ۱۹۳۳-۱۹۴۸

انٹر کالج کے آخری چند سال

آفتاب احمد خان اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے اختلافات کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ انہوں نے جلد ہی شدت اختیار کرلی جس سے یونیورسٹی کی شہرت کو سخت نقصان پہنچا۔ آفتاب احمد خان دوبارہ وائس چانسلر منتخب ہونے کے خواہاں تھے۔ یہ انتخاب دسمبر سنہ ۱۹۲۶ میں ہونے والا تھا، ان کے مقابلہ میں نواب مزمل اللہ خان امیدوار تھے۔ ان کا علیگڈھ کے بڑے رؤساء اور زمینداروں میں شمار تھا۔ حکومت کے خطاب یافتہ تھے مگر مغربی (انگریزی) تعلیم سے بہرہ مند نہ تھے صرف مشرقی یعنی فارسی عربی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی تھی' حقیقت یہ ہے کہ وائس چانسلری کے عہدے پر فائض ہوکر یونیورسٹی کا نظم و نسق ان کے لئے سنبھالنا ممکن نہ تھا۔ یونیورسٹی سے ہمدردی رکھتے تھے اور چندے وغیرہ دیتے رہتے تھے' بحیثیت ممبر کورٹ جو یونیورسٹی کے نظام میں اعلیٰ اختیاراتی جماعت تھی' وہ یونیورسٹی کے معاملات میں گہری اور ذاتی دلچسپی لیتے تھے' ڈاکٹر ضیاء الدین بہ سلسلہ "بغض معاویہ" یعنی آفتاب احمد خان کی مخالفت میں مزمل اللہ خان کو وائس چانسلر منتخب کرانے کی کوشش کر رہے تھے' شاید ان کو خیال ہوگا کہ ان کے منتخب

ہوجانے پر وائس چانسلری کے اختیارات عملی طور پر ان کے ہاتھ میں رہیں گے'

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں جوبلی کی تقریب جو ۱۹۲۵ میں منائی گئی ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی خواہش تھی کہ ایم اے او کالج کے قیام کے پچاس سال مکمل ہوجانے پر اس ادارے کی کارکردگی اور اس مدت میں مسلم قوم کی ترقی کے سلسلہ میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے نتائج کو قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کے نمائندے خود علیگڈھ آکر ان کی عملی شکل اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ اس کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ سید احمد خاں مرحوم کی زیر قیادت علیگڈھ تحریک نے مسلم قوم کے علیحدہ تشخص کا تصور پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عملی اقدامات بھی کئے' جنھوں نے ان کے عظیم رفقاء کار یعنی محسن الملک اور وقار الملک کی کوششوں سے اور ان کی سرکردگی میں جداگانہ حق انتخاب اور آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی شکل میں برصغیر کی تاریخ کے اہم ابواب کی حیثیت حاصل کرلی۔ ۱۹۲۵ء تک مسلمانان ہند کے ایک علحیدہ قوم ہونے کا تصور اپنے منطقی نتیجہ کی ابتدائی منزل کے آغاز تک پہنچ چکا تھا تقسیم ہند اور مسلم قوم کے لئے ایک خود مختار وطن کا باضابطہ مطالبہ تو ابھی دور تھا اور اس کے لئے پندرہ سال کی کوشش ابھی باقی تھی 'لیکن ہندو مسلم تعلقات کا اہم اور پیچیدہ مسلہ حل کرنے کے لئے تقسیم ملک کی تجویز کا ذکر ہونے لگا تھا' اس سلسلہ میں ''گاندھی کے نام کھلا خط''

جو ایک فرضی نام سے شایع کیا گیا تھا' ایک قابل ذکر تاریخی دستاویز ہے۔[۲] اس کے بعد مسلمانوں میں بالخصوص نوجوان طبقوں میں تقسیم ہند کا تصور اور مطالبہ روز بہ روز زیادہ مقبول ہوتا جارہا تھا' یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال مرحوم نے الہ‌آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے مدلل اور عالمانہ انداز میں اس کو پیش کیا' جوبلی سے متعلق تقریبات میں مسلم لیگ کا بھی ایک اجلاس منعقد ہوا۔

جوبلی کے بعد تین سال میں یونیورسٹی نے نمایاں ترقی کی اور اس کی مقبولیت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا' طلبہ اور اساتذہ کی تعداد کافی بڑھ گئی' لیکن آفتاب احمد خان (جن کی جگہ نواب مزمل اللہ خان وائس چانسلری کے عہدے پر فائز تھے) اور ان کے احباب نے یونیورسٹی کے خلاف پروپاگنڈے کی ایک مہم چلائی' اس کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نواب صاحب جن کا شمار علیگڈھ کے رؤساء میں ہوتا تھا اور جو یونیورسٹی کی مالی امداد کرتے رہتے تھے' وائس چانسلری کے لئے موزوں نہیں تھے' وہ عربی فارسی میں مہارت رکھتے تھے لیکن انگریزی بس یوں ہی سی جانتے تھے' ڈاکٹر ضیاء الدین کی کوشش سے وہ اس عہدے پر فائز ہوئے تھے' چنانچہ لوگ بڑی حد تک بجا طور پر یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے مختصر دور کی خرابیوں کے ذمہ دار' ڈاکٹر صاحب ہی ہیں۔ یونیورسٹی کی شہرت کو جس چیز نے بہت نقصان پہنچایا وہ صاحبزادہ آفتاب کی طرف سے شایع شدہ ایک پمفلٹ تھا' جس میں سابق وائس چانسلر نے متعدد بے ضابطیوں اور قابل اعتراض اقدامات کا ذکر کیا تھا' اس پمفلٹ کی بہت بڑے پیمانہ پر

اشاعت کی گئی' جس چیز نے یونیورسٹی کی شہرت پر سب سے گہرا داغ لگایا' وہ یہ تھا کہ تعلیم کا معیار بہت گرگیا ہے اور اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے میٹری کیولیشن کے امتحان میں پرائیویٹ طلبہ کو بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی تھی' اس مسئلہ پر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اور اساتذہ میں سخت اختلاف رائے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ پرائیویٹ طور پر امتحان میں طلبہ کی شمولیت سے مسلمانوں میں یونیورسٹی کی مقبولیت بہت بڑھ جائے گی' اور یہ حقیقت بھی ہے کہ صرف برصغیر کے ہر گوشہ سے ہی نہیں بلکہ بیرون ملک یعنی افریقہ وغیرہ سے بھی طلبہ آنے لگے اور چار پانچ سال ہی کی مختصر مدت میں یونیورسٹی' مسلمانوں کا عظیم ترین تعلیمی ادارہ اور برصغیر کی مشہور یونیورسٹیوں میں شمار ہونے لگی' اور آفتاب احمد خان کے پمفلیٹ شایع ہونے کے بعد اس کی شہرت گرنے لگی' اور اکثر طبقوں میں یہ خیال کیا جانے لگا کہ علیگڈھ میں تعلیم اور امتحانات کا معیار واقعتی گرگیا' بعض حلقوں میں یہ تذکرے ہونے لگے کہ علیگڈھ کا سیکنڈ ڈویژن کا گریجویٹ دوسری یونیورسٹیوں کے تھرڈ کلاس میں پاس ہونے والے کے برابر ہے۔

یونیورسٹی کے خلاف پروپاگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان اثرات کو دور کرنے کی غرض سے ایک کمیشن آف انکواری مقرر کیا گیا جس کے سربراہ سر ابراهیم رحمت اللہ تھے کمیشن کی رپورٹ' ان شہادتوں کی بنیاد پر جو اس کے سامنے پیش کی گئی تھیں تیار کی گئی' آفتاب احمد کی پمفلیٹ کے علاوہ ان شہادتوں میں یونیورسٹی کے نظم و نسق کی بعض خامیوں کے ساتھ امتحانات کے گرتے ہوئے

معیار کا بھی ذکر کیا گیا تھا، اور ان میں سے اکثر کا سبب ڈاکٹر ضیاء الدین کے بعض اقدامات کو بتلایا گیا تھا' چنانچہ ممبران کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ یونیورسٹی سے ان کی علیحدگی اس کے مفاد میں ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اسٹاف کی ' اصلاح ' کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا' جس کی سفارش پر ان اساتذہ کی ملازمتیں ختم کردی گئیں جن کے پاس ایم اے تھرڈ کلاس کی ڈگریاں تھیں۔ متعدد پروفیسروں کو ریڈر اور ریڈرس کو لکچرار کردیا گیا۔ پرووائس چانسلری پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی جگھہ ایک انگریز کو مقرر کیا گیا' معزول شدہ اساتذہ کی جگھہ نئے اسٹاف کا تقرر عمل میں آیا' ظاہر ہے جن لوگوں کا تقرر ہوا ان میں علیگڈہ کے ڈگری یافتہ بہت کم تھے' ہسٹری میں صرف شیخ عبدالرشید کا تقرر عمل میں آیا۔ اکزیکوٹیو کاونسل یعنی انتظامیہ صرف تین آدمیوں پر مشتمل کردی گئی' یعنی وائس چانسلر' پرووائس چانسلر اور اعزازی ٹریزرر۔

سب سے نمایاں تبدیلی ان حالات کے نتائج میں یہ ہوئی کہ سید احمد خان مرحوم کے پوتے راس مسعود کو جو حیدرآباد دکن میں ڈائریکٹر تعلیمات تھے' یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر فائز کردیا گیا۔ وہ اپنی اہلیت اور صلاحیتوں کے باعث حیدرآباد ہی میں نہیں بلکہ مسلمانان ہند میں ایک خاص شہرت اور مقام حاصل کرچکے تھے' اور اس میں شک نہیں کہ پانچ سال کی مدت میں یونیورسٹی کے وقار اور شہرت کو واپس لانے میں انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انگریز پرووائس چانسلر (مسٹر ھارن) کی غیر متوقع وفات کے بعد ایک اور انگریز پروفیسر مسٹر رمز کا اس اہم

عہدے پر تقرر کیا گیا، تعلیمی امور میں اس کو کافی تجربہ تھا، اور
اچھی شہرت رکھتا تھا، یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی نے اس کے دور
میں کافی ترقی کی، سر راس مسعود کی ان کوششوں کا ذکر جو انہوں
نے یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کے لئے کیں یہاں تفصیل کے ساتھ
نہیں کیا جاسکتا، لیکن سائنس کے مضامین کی لیبارٹریوں کی تعمیر
ان کا ایک شاندار اور مستقل کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ سائنسی
مضامین کے لئے چند پروفیسروں کا تقرر بھی عمل میں آیا۔ عربی
میں پہلے مشہور مستشرق ڈاکٹر کرینکو اور بعد میں پروفیسر
آٹو اسپیر کا تقرر ہوا، یقیناً ان تقرریوں اور نظام حیدرآباد کے
عہدہ چانسلری قبول کرلینے سے یونیورسٹی کا وقار بہت بلند ہوگیا،
حکومت کے اعتماد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی
کی دعوت پر وائسرائے ہند لارڈ ارون بھی آئے اور اپنے اطمینان
کا اظہار کیا۔

راس مسعود کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی
کو اپنی رائے سے اختلاف کی اجازت نہیں دیتے تھے اور ہر مسئلہ
پر اپنے ہی فیصلے کو درست تصور کرتے تھے، وائس چانسلری
سنبھالنے کے بعد انہوں نے بنگال سول سروس کے ایک صاحب کا
رجسٹراری پر تقرر کیا تھا، یہ اپنے طرز گفتگو اور برتاؤ کی وجہ سے
اسٹاف اور طلبہ میں مقبولیت حاصل نہ کرسکے، اور یونیورسٹی کورٹ
کے اراکین بھی ان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے، لیکن راس مسعود
ان سے بہت خوش تھے، اور چاہتے تھے کہ پہلی میعاد ملازمت
(term) ختم ہونے پر ان کا تقرر دوبارہ کیا جائے۔ مگر کورٹ نے
ان کی یہ سفارش رد کردی اور ان کی میعاد ملازمت میں اضافہ

نہیں کیا۔ کورٹ کے اس فیصلے کو راس مسعود نے اپنی توہین
سمجھا اور وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ ریاست بھوپال
نے ان کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بلا لیا، وہیں سنہ ۱۹۳۷
میں انہوں نے وفات پائی۔[3]

راس مسعود مرحوم کے بعد کچھ عرصے کے لئے نواب
محمد اسمٰعیل خان مرحوم نے جو یونیورسٹی کے خازن تھے، وائس
چانسلری کے فرائض انجام دئے۔ مسٹر رمز بوتھم (Rams Botham)
پرو وائس چانسلر تھے، انتظامی امور سنبھالنے کے ساتھ وہ تدریس
سے بھی اپنا تعلق منقطع کرنا نہیں چاہتے تھے، اور ایم اے تاریخ
کے طلبہ کو ایک پیریڈ پڑھاتے تھے، ایک مختصر سی کتاب کے
مصنف بھی تھے، نظم و ضبط کے قوانین کی انتہائی سختی سے
پابندی کرتے تھے، نواب صاحب مرحوم کے دور وائس چانسلری کا
اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ مسٹر رمز بوتھم کے جانے کے بعد پروفیسر
اے بی اے حلیم کو پرو وائس چانسلر بنایا گیا، ڈاکٹر ضیاء الدین
کے بعد سے اس عہدے پر یوروپین پروفیسر کا تقرر ہوتا رہا۔ اس
سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یونیورسٹی نے حکومت کی نظر میں اتنا
وقار دوبارہ حاصل کرلیا، لیکن اب وہ دور آچکا تھا جب زندگی کے
ہر شعبہ میں کلیدی عہدے اور حیثیتیں رفتہ رفتہ انگریزوں کے
ہاتھوں سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آرہے تھے، جہاں
تک مسلم یونیورسٹی کا تعلق تھا، یہ تبدیلی زیادہ آسان نہ تھی،
اسٹاف پر کئی یوروپین پروفیسر موجود تھے اور اکثر لوگوں کا خیال
تھا کہ ان پروفیسروں میں ہی سے کسی کا تقرر اس عہدے پر
ہوگا، لیکن سیاسیات میں نواب صاحب کو جو مقام حاصل تھا، اور

سیاسی زندگی میں ان کا جو نقطہ نظر تھا، اس کا تقاضا یہی تھا
کہ یونیورسٹی کا پرو وائس چانسلر ایک مسلمان پروفیسر ہو،
حلیم صاحب ایک طویل مدت تک اس اہم اور معزز عہدے پر
فائز رہے۔ ان کا عہد پرو وائس چانسلری اس لحاظ سے اہم ہے کے
مسلم قومیت کا احیاء اور مسلمانوں کی عظیم تحریک یعنی ایک
خود مختار وطن کے مطالبہ کا سلسلہ اسی زمانہ میں شروع ہوا،
اس تحریک کا یونیورسٹی سے اس قدر گہرا تعلق رہا ہے کہ اس
کے بعض واقعات کا ذکر ضروری ہے۔

سائمن کمیشن

ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کو جس کی بنیادیں لکھنؤ پیکٹ
(۱۹۱۶) کے بعد سے مضبوط ہوتی جارہی تھی اور جو ۱۹۲۰-۲۱
مین خلافت اور ترک موالات کے باعث انتہائی عروج پر پہنچ چکا
تھا، فروری ۱۹۲۲ مین چوراچوری کے بلوے سے سخت صدمہ پہنچا
اور مسٹر گاندھی کی سفارش پر کانگریس نے ترک موالات کی تحریک
کو ختم کردیا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں قوموں کا اتحاد کمزور
ہونے لگا، فرقہ دارانہ فسادات شروع ہوگئے۔ خود کانگریس بھی
پہلے کی طرح فرقہ دارانہ تعصبات کا شکار ہونے لگی۔ ترکی مین
اتاترک کی نئی حکومت نے خلافت کو ختم کردیا، چنانچہ خلافت
تحریک بھی یہاں کمزور ہوگئی۔

سنہ ۱۹۲۷ء مین حکومت برطانیہ نے ہنوستان کے لئے آئینی
اصلاحات تجویز کرنے کی غرض سے سرجان سائمن کی صدارت مین
ایک کمیشن مقرر کیا، اس کے تمام ممبر انگریز تھے، چنانچہ

ہندوستان میں کانگریس، مسلم لیگ اور بعض دوسری جماعتوں نے
اس کی مخالفت کی، لیکن کمیشن نے اپنا کام جاری رکھا، اور ۱۹۳۰
میں سفارشات پیش کیں۔

نہرو رپورٹ

اس سے قبل سنہ ۱۹۲۸ میں کانگریس کی قائم کردہ نہرو
کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں مسلمانوں کے حقوق،
مثلاً انتخاب جداگانہ، اور مطالبات کو بڑی حد تک نظرانداز کردیا
گیا تھا۔ مولانا محمد علی اور قائداعظم اس وقت انگلستان میں تھے،
وہ اس غرض سے ہندوستان واپس آئے۔ لیکن انہوں نے جو ترمیمات
پیش کیں وہ کمیٹی نے مسترد کردیں، حالانکہ قائداعظم نے لیگ
کی طرف سے اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ ان کی پیش کردہ
شرائط منظور ہوجانے پر مسلمان جداگانہ انتخاب پر اصرار نہیں
کریں گے، لیکن کانگریسی رہنماؤں پر ہندوفرقہ داریت کا اثر اسقدر
زیادہ ہوچکا تھا، کہ وہ مسلمانوں کے اس حق کو جاری رکھنے
کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ اقلیتی صوبوں میں ان کی آبادی کی
نسبت سے کچھ زیادہ نشستیں ان کو دی جائیں۔ یہ حق لکھنؤ پیکٹ
کے ذریعہ سنہ ۱۹۱۶ میں تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اب کانگریسی
رہنماؤں کی بدلی ہوئی ذہنیت کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگایا
جاسکتا ہے کہ ''اقلیت کو اقلیت ہی کی حیثیت سے ہی رہنا پڑے
گا، خواہ اس کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں''۔ بہ الفاظ دیگر
مسلم اقلیت کو اب وہ قطعی طور پر نظرانداز کرنے کے لئے تیار
تھے، باوجود یکہ یہ وہ اقلیت تھی جس نے ایک ہزار سال برصغیر

کے وسیع علاقوں پر حکمرانی کی اور ہندوؤں کے ساتھ انتہائی رواداری برتی اور اس علاقے میں تہذیب و تمدن کو بلند ترین منزلوں تک پہنچایا تھا' اس موقع پر قائداعظم نے کہا تھا کہ اکثریتیں ظلم اور زیادتی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اقلیتوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ ان کے حقوق اور مفاد محفوظ نہ رہ سکیں گے' اس لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ دوسری اقلیتوں کو بھی اطمینان دلایا جائے کہ ان کے حقوق کو کوئی خطرہ نہ ہوگا' غرض یہ کہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ ہندو اور مسلم قومیں علیحدہ علیحدہ راستے اختیار کریں' یہی الفاظ تھے جو قائداعظم نے کانگریس کے رویے سے مایوس ہوکر گفت و شنید کے اختتام پر کہے تھے۔[۹]

۱۹۲۹ سے ۱۹۳۶ تک کی مدت برصغیر کی جدوجہد آزادی میں خاص اہمیت رکھتی ہے' ہندو اکثریت کو اب یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اب تنہا ہی کام کرکے اپنا مقصد حاصل کرلے گی اور مسلمانوں کو من حیثیت القوم نظرانداز کیا جاسکتا ہے' ان کے لیڈر یہ بھی جانتے تھے کہ مسلم لیگ ایک کمزور ادارہ ہے اور وہ انتشار کا شکار ہوچکا ہے' اس کا بھی ان کو یقین تھا کہ کچھ مسلمان رہنما اور ان کے ساتھی یقیناً ان سے ملے رہیں گے چاہے وہ مسلم قوم کے ساتھ کتنی ہی زیادتی کیوں نہ کریں' مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مسٹر آصف علی بیرسٹر وغیرہ' دینی رہنماؤں میں مولانا حسین احمد مدنی' جمعیت العلماء ہند کے کارکن اور بعض دیگر حضرات مسلمانوں کو چھوڑکر ہندو اکثریت کے ساتھ چپٹے رہنے میں پختہ عقیدہ رکھتے تھے حکومت

برطانیہ کا جھکاؤ بھی کانگریس ہی کی طرف تھا۔

حالات کی بڑھتی ہوئی نزاکت کے پیش نظر بعض پر خلوص مسلم رہنماؤں نے جن میں مولانا محمد علی پیش پیش تھے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ کو منعقد کی' اس اجلاس کی صدارت ہزہائی نس آغا خان سوم نے کی' اس میں مسلمانوں کے مطالبات پر ایک جامع رزولیوشن منظور کیا گیا' ان ہی مطالبات کی بنیاد پر قائداعظم نے ایک جامع رزولیوشن مرتب کیا جو بعد میں جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوا' اس وقت لیگ میں دو گروہ ہوگئے تھے یہ اپنے سربراہوں کے نام پر جناح لیگ اور سر شفیع لیگ کے نام سے پکارے جاتے تھے' اس خطرناک تفریق کو دور کرنے کے لئے مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں لیگ کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا لیکن سر شفیع اپنی علالت کے باعث شریک نہ ہوسکے' ان حالات میں اجلاس کی کارروائی مکمل نہ ہوسکی۔

علامہ اقبال کا خطبہ

اس زمانے میں مسلم لیگ کی روزانہ بڑھتی ہوئی نامقبولیت کی یہ کیفیت تھی کہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ میں الہ آباد کے اس اجلاس میں جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی' حاضرین کا کورم پورا نہ تھا اور جلسہ کو روک کر فوری طور پر نئی ممبرسازی کرنا پڑی تھی' بہرحال اس اجلاس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' اس لئے کہ لیگ پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ اس کے صدر نے شمالی مغربی علاقوں (یعنی سرحد' پنجاب' سندھ اور بلوچستان) کو متحد کرکے ایک ریاست کے قیام کا نظریہ پیش کیا

اس وقت برصغیر کی مکمل آزادی کا تصور سامنے نہیں تھا اور
زیادہ زور اس پر تھا کہ ہندوستان بھی دوسری ڈومینینز کی طرح
اگر برٹش کامن ویلتھ میں ایک ڈومینین رہے تو مضایقہ نہیں،
چنانچہ اپنے خطبے میں انہوں نے بھی "خود مختار حکومت سلطنت
برطانیہ میں یا اس کے باہر،" کا ذکر کیا، یعنی باضابطہ طریقے سے
لیگ کی طرف سے اس علاقے کو مسلمانوں کے زیر اقتدار لائے اور
وہاں خود مختار حکومت کے قیام کا ذکر اسی خطبے میں کیا گیا۔
علامہ نے سید احمد خاں کی طرح اس پر بھی زور دیا کہ ہندوستان
کے لئے مغربی انداز کی جمہوریت ناقابل عمل ہے' لیکن اس وقت
مسلم لیگ اسقدر کمزور تھی کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے
جس کا ذکر علامہ نے کیا تھا' کوئی فعال تحریک نہیں چلاسکتی
تھی؛ چنانچہ مسلم رہنماؤں کی توجہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی طرف
مبذول ہوگئی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے پہلے اجلاس کا
کانگریس نے بائیکاٹ کیا اور دوسرے میں شرکت کی لیکن صرف
ایک نمائندہ یعنی گاندھی جی کو بھیجا، ایک اہم اور بنیادی مسئلہ
جس کا تعلق اقلیتوں' بالخصوص مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات
سے تھا' طے نہ ہوسکا۔ حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ یہ مسئلہ
ہندو اور مسلمان آپس میں اتفاق رائے سے طے کرلیں' لیکن یہ ممکن
نہ ہوا اور مجبوراً حکومت نے اپنی طرف سے اس کا فیصلہ کمیونل
ایوارڈ کے ذریعہ کیا۔ اس میں جداگانہ انتخاب کا حق صرف
مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ دوسری اقلیتوں کو بھی دیا گیا اس سے
بھی زیادہ اہم اقدام یہ تھا کہ پست اقوام (Scheduled castes)

اونچی ذات والے ہندوؤں (Caste Hindus) سے علیحدہ قوم شمار
کئے گئے تھے' اس پر ہندوؤں نے بہت واویلا مچایا اور گاندھی جی
نے یہ اعلان کردیا کہ وہ اس پر جان دے دیں گے' اگر نظر انصاف
سے دیکھا جائے تو یہ سراسر زیادتی ہے کہ معاشرتی زندگی میں تو
نیچی ذات والا سمجھا جائے اور شادی بیاہ اور دوسرے معاملات
میں ان کو ادنیٰ درجہ کا انسان قرار دے کر جانوروں کی طرح
علیحدہ رکھا جائے' لیکن اپنی اکثریت میں اضافے کے لئے ان کو
ہندو سمجھا جائے' بہرحال گاندھی جی نے برت (فاقہ) شروع کردیا
اور اعلان کردیا کہ اگر پست اقوام کے لوگوں کو ہندو مت میں
شمار نہ کیا گیا تو وہ برت کو ختم نہیں کریں گے' اور جان
دے دیں گے' چنانچہ پست اقوام کے مسلمہ اور مقبول رہنما' ڈاکٹر
امبیدکار کو اس پر رضامند کرنے کی جان توڑ کوششیں شروع کردی
گئیں کہ وہ کمیونل اوارڈ کے اس فیصلہ کو نہ مانیں کہ پست اقوام
اونچی ذات والے ہندوؤں سے علیحدہ ہیں۔ بالاخر پونہ پیکٹ
(Poona Pact) کے ذریعہ اس اصول کو تسلیم کرلیا گیا کہ
نیچی ذات والی قومیں' مثلاً کولی' چمار' دھوبی وغیرہ عملی زندگی
میں تو اونچی ذات والوں سے علیحدہ رہیں گے لیکن ووٹنگ کے لئے
ان کا شمار ہندو قوم میں ہوگا۔ چنانچہ آج بھی یہی صورت حال
ہے' ایک چمار یا جولاہے کا بیٹا' براہمن یا ویش خاندان کی لڑکی
کے ساتھ شادی نہیں کرسکتا ہے نہ یہ لوگ ساتھ کھانا کھاسکتے
ہیں' بلکہ یہ لوگ ایک مشترکہ مندر میں عبادت بھی ساتھ
نہیں کرسکتے' غرضیکہ سیاسی معاملات کی رفتار نے ہندو مسلم
تعلقات کے مسئلہ پر خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اور اس کا

کوئی حل نظر نہیں آتا تھا کانگریس کی تنگ نظری کے باعث
حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے، صوبوں کو بڑی حدتک
خود اختیاری حیثیت (autonomy) دے دی گئی، یعنی صوبائی
حکومت کے اکثر محکمے منتخب اسمبلیوں اور ان کے نمائندہ
وزیروں کے تحت آگئے، جن میں گورنروں کو وزراء کے مشوروں
پر عمل کرنا ضروری تھا، بہت کم معاملات ایسے تھے، جن میں گورنر
ان سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے پر عمل کرسکتا تھا، لیکن
افسوس ہے کہ گورنروں نے اپنے اختیارات استعمال نہیں کئے، سنہ
۱۹۳۷ء میں متعدد صوبوں میں کانگریس وزارتیں قائم ہوئیں اور
دو سال تک وہ برسراقتدار رہیں۔ اس مختصر مدت میں مسلمانوں
پر بےحد زیادتیاں ہوئیں، بندے ماترم کو جو سراسر مسلمانوں کے
خلاف تھا قومی ترانہ بنایا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں
ہورہی تھیں ان کی ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرنے کی غرض سے
مسلم لیگ نے ۱۹۳۸ میں راجہ پیر پور کی سربراہی میں ایک
کمیٹی تشکیل کی، اس رپورٹ میں جن مظالم اور زیادتیوں کا ذکر
کیا گیا تھا، کانگریس نے ان کو غلط کہہ کر ٹال دیا۔ حکومت
نے بھی ان کی تلافی کےلئے کوئی اقدام نہیں کیا اور شاید ان کا
سلسلہ بڑھتاہی چلا جاتا، اگر آیندہ سال یعنی سنہ ۱۹۳۹ء میں
یورپ میں جنگ نہ چھڑجاتی، جنگ میں تعاون کے مسئلہ پر
حکومت اور کانگریس میں اختلاف پیدا ہوگیا، جس کے نتیجہ میں
کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔

کانگریسی رویہ اب نہایت متکبرانہ انداز اختیار کرچکا تھا،
یہاں تک کہ اس کے رہنماؤں کو اس کا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ
مسلم لیگ نے قائداعظم کی سربراہی میں گذشتہ تین سال کی
مدت میں کسقدر ترقی کرلی تھی، اگرچہ الیکشن میں مسلم لیگ
کی کامیابی سے یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ اب وہ مسلمانوں کی واحد
نمایندہ جماعت کی حیثیت حاصل کرچکی تھی، جواہرلال نہرو
نے تو تکبر کے نشے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں
صرف دو فریق ہیں یعنی حکومت اور کانگریس۔ بہ الفاظ دیگر
انہوں نے مسلم قوم اور اس کی واحد نمایندہ جماعت کو قطعئی
طور پر نظرانداز کردیا تھا۔ قائداعظم نے فوراً اپنے جوابی بیان میں
کہا کہ دو نہیں تین جماعتیں ہیں، اور تیسری جماعت مسلم لیگ
ہے۔ اس کے دو سال بعد یعنی سنہ ۱۹۴۰ میں مسلم لیگ نے
مسلمانوں کےلئے علیحدہ وطن اور تقسیم ہند کا مطالبہ کیا۔

تحریک و تخلیق پاکستان

اس امر کی طرف مختصراً اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۳۰ سے
۱۹۳۵ تک مسلم لیگ افتراق کا شکار رہی اور نسبتاً عملی میدان
میں کمزور۔ بہرحال راونڈ ٹیبل کانفرنس میں مختلف الخیال مسلم
رہنماؤں کی موجودگی اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور اس
سلسلہ میں ان کے مطالبات کے باعث ان کے خیالات میں بڑی حد تک
ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ہزہائی نس آغاخان کی لیڈر شپ اور
قائداعظم، علامہ اقبال اور محمد علی جیسے بزرگ اور بااثر رہنماوں
کا یکجا ہوکر مسلمانوں کی نمایندگی نے قوم کی کوششوں اور

امنگوں میں ایک نئی روح پھونک دی' نوجوان نسل کی قومی مسائل
سے دلچسپی تیزی سے بڑھنے لگی۔ چنانچہ اس کا احساس پیدا ہوگیا
کہ لیگ کو فعال اور جان دار ادارہ بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں
پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ محمد علی جناح کو لندن سے جہاں انہوں
نے پریکٹس شروع کردی تھی ہندوستان واپس آجانے کے لئے تیار
کرلیا' اور ان کی واپسی پر لیگ کی تنظیم نو کا کام بھی ان ہی کو
سپرد کردیا گیا' چنانچہ ۱۹۳۴ سے انہوں نے اس کی کوشش شروع
کردی۔ مارچ و اپریل ۱۹۳۴ میں مسلم لیگ کونسل کی دو میٹنگیں
ہوئیں' ان میں مسٹر جناح کو لیگ کا صدر منتخب کیا گیا اور
انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ اس میں کوئی شک نہیں اور
مستقبل کی تاریخ نے ثابت کردیا کہ مسلمانان برصغیر کی یہ بڑی
خوش قسمتی تھی کہ مسٹر جناح نے لیگ کی یہ پیشکش قبول کرلی
اور دو سال کے اندر وہ اپنی پریکٹس اور قیام لندن کی مدت کو
ختم کرکے اپنے وطن واپس آگئے اور اپنی زندگی اور صلاحیتوں کو
مسلمانوں کی خدمت کے لئے کلیتہً وقف کردیا۔ اللہ تعالےٰ نے ان
کے اس ایثار کو قبول فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کی معجزانہ انداز
میں رہنمائی کی' مسلم لیگ کے رہنماؤں اور کارکنوں میں آپس کے
افتراق کو دور کیا' اور بالاخر لیگ کو مسلمانوں کا واحد سیاسی
ادارہ بنا کر مخالفین سے اس کی اس حیثیت کو منوالیا۔ مسلمانوں
نے مسٹر جناح کو قائداعظم تسلیم کرلیا اور اب ان کا ذکر اسی
نام سے کیا جاتا ہے۔

قائداعظم کا عظیم ترین کارنامہ حصول پاکستان ہے' ان ہی
کی قیادت میں سید احمد خان کے بتلائے ہوئے نظریے نے کہ مسلمان

ایک علیحدہ قوم ہیں' عام مقبولیت حاصل کی۔ اور اسی تصور کی
بنیاد پر جس کا ذکر تاریخ کے صفحات میں دو قومی نظریے کے نام
سے کیا جاتا ہے' مسلم لیگ نے مسلم قوم کے لئے علیحدہ وطن کا
مطالبہ کیا' یعنی ان علاقوں کو جن میں مسلمان اکثریت میں تھے'
ایک علیحدہ اور خود مختار ریاست تسلیم کرلیا جائے۔ گویا برصغیر
کو دو ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے' ابتداءً میں برصغیر کی تقسیم
کا تصور ناممکن العمل سمجھا جاتا تھا' لیکن قائد اعظم کی رہنمائی
میں مسلمانوں نے اس کو زندگی اور موت کا سوال بنا کر' پاکستان
(یعنی مسلمانوں کا خود مختار وطن) ہر قیمت پر حاصل کرنے کا
فیصلہ کرلیا۔ مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ میں اپنے لاہور کے اجلاس
میں اس فیصلہ کو ایک رزولیوشن کی شکل میں منظور کیا' اور اس
کے اصول کے لئے ایک زبردست تحریک چلائی جو ایثار اور خلوص
کے لحاظ سے جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔

تحریک پاکستان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ تھی
کہ اگرچہ ابتدائی دور میں یہ بعض ان علاقوں میں مقبول ہوئی
جہاں مسلمان اقلیت میں تھے[5]' لیکن رفتہ رفتہ برصغیر کے ہر صوبے
اور ہر دیسی ریاست کے مسلمانوں کی اکثریت اس سے منسلک
ہوگئی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۳ تک نو اجلاس
ہوئے جن میں چھ اقلیتی علاقوں میں اور تین اکثریتی علاقوں میں
منعقد ہوئے۔ تاریخ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں اس کی اہمیت
یہ ہے کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمان یہ جانتے اور سمجھنے کے باوجود
کہ پاکستان میں وہی علاقے شامل ہوں گے جن میں مسلمانوں
کی اکثریت ہے اور ان کو بہرحال ہندو اکثریت والے علاقوں

میں بحیثیت اقلیت کے رهنا هوگا، اس تحریک میں انتہائی خلوص
اور دل و جان سے حصہ لیا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ ذکر موجود
هے کہ قائد اعظم نے علیگڈھ میں جہاں تعلیمیافتہ مسلم نوجوان
انتہائی خلوص اور جوش کے ساتھ تحریک پاکستان میں کام کرنے
کے لئے خود کو پیش کرتے تھے، صاف صاف الفاظ میں یہ کہا کہ
اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کو جو حصول پاکستان کے لئے اپنی
جانیں پیش کررهے هیں اچھی طرح سمجھ لینا چاهئے کہ پاکستان
کی تخلیق کے بعد اس سے ان کو کوئی مادی اور دنیوی فائدہ نہیں
پہنچیگا۔ خود مختار ریاست قائم هونے کے نتیجہ میں مادی فوائد
ان هی لوگوں کے حصے میں آئیں گے جو اس ریاست کے باشندے
هوں گے، اس سوال کے جواب میں اسلام کے یہ جان نثار بھی
جواب دیتے تھے کہ وہ یہ اچھی طرح سمجھتے هیں لیکن وہ حصول
پاکستان اور برصغیر کی زمین پر مسلمانوں کا ایک وطن خود مختار
ریاست کی شکل میں قائم کرنے کی تحریک میں اس مقصد سے کام
کر رهے هیں کہ وہ جانتے هیں کہ اس نئی مملکت میں اسلام کا
بول بالا هوگا اور اسلامی نظریات کی بنیاد پر معاشرہ قائم هوگا۔
اسلامی عقائد اور بنیادی تصورات کی رو سے یہ کارخیر هے، اور ان
کے ایثار اور قربانیوں کا ثواب ان کو اس دنیا میں نہیں تو آخرت
میں ضرور ملے گا۔

یہ ظاهر هے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر مسلم
اقلیتی علاقوں کے مسلمان تحریک پاکستان میں شروع سے آخر تک
بھرپور حصہ نہ لیتے اور انتخابات میں جن کو حکومت برطانیہ
بنیادی حیثیت دیتی تھی، مسلم لیگ کو قومی اسمبلی میں سوفی صد

اور صوبائی اسمبلیوں میں بھاری اکثریت حاصل نہ هوتی تو وہ
(حکومت برطانیہ) تقسیم هند کے لئے تیار نہ هوتی اور پاکستان ایک
خود مختار مملکت کی شکل میں دنیا کے نقشہ پر نمودار نہ هوتا۔
تقسیم کے وقت اور اس سے کچھ قبل، بہار، گڈھ مکتیسر (یوپی)
اور بعض دیگر مقامات پر هندوؤں نے اور بالخصوص ان کی تنظیم
راشٹریہ سیوک سنگھ کے کارکنوں نے جس بےدردی اور سفاکی سے
مسلمانوں کو قتل کیا اور دهلی، مشرقی پنجاب میں جن مظالم کے
ساتھ ان کو تہ تیغ کیا اور ان کو گھروں سے نکالا، اس کی مثالیں تاریخ
میں کم هی ملیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلم اکثریتی علاقوں
میں بھی ان مظالم کے نتیجہ میں جذبہ انتقام بھڑک اٹھا اور
شمالی برصغیر میں بنگال سے سرحد تک اکثر علاقوں کو خانہ جنگی
اور قتل و غارت کے جنون نے اپنی گرفت میں لےلیا، لاکھوں آدمی
هلاک اور بے گھر هوئے، اور هندوستان میں برطانوی اقتدار کا
آخری باب ایک سیاہ داغ کی شکل میں تاریخ کے صفحات پر همیشہ
کے لئے نمایاں طور پر باقی رہ گیا، یہ سب کچھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن
کی گورنر جنرلی اور پنڈت نہرو کی وزارت کے زمانہ میں واقع هوا۔
اس عظیم سانحہ کے منصوبہ میں بھارت کے متعدد هندو لیڈروں کا
هاتھ تھا جن میں سے بعض کے بیانات شایع بھی هوچکے هیں۔[6]
ایک قابل افسوس پہلو اس قتل و غارت گری کا یہ تھا کہ سکھوں
نے اور خاص طور پر سکھ ریاستوں نے مسلمانوں کے قتل اور لوٹ مار
میں هندوؤں کو خوش کرنے کی غرض سے بڑے پیمانے پر اور انتہائی
وحشیانہ انداز میں حصہ لیا۔ ان کے لیڈروں میں اتنی دور اندیشی
نہ تھی کہ وہ یہ سوچ سکتے کہ مستقبل ایسے حالات بھی پیدا

هوسکتے هیں جب ان کے خون سے بھی بھارت میں اسی طرح هولی
کھیلی جائے گی جس طرح وہ بے گناہ اور معصوم عورتوں اور بچوں کے
خون سے کھیل رہے تھے۔ همیں معلوم ہے کہ ۱۹۸۴ میں مسز
اندرا گاندھی کی حکومت نے امرتسر کے سنہری مندر پر حملہ کیا
اور سکھوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ انتقام کے طور پر ان کے سکھ
اردلیوں نے وزیراعظم کو قتل کیا۔ بہرحال ۱۹۴۷ میں سکھوں نے
ناقبل بیان مظالم کئے، لاتعداد مسلمانوں کو قتل کیا اور قیدی بنایا۔
بھارتی پنجاب اور قرب جوار کے علاقوں میں مسلمان مجبور ہو گئے
کہ وطن چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں، انتقاماً پاکستان میں سکھوں
اور هندوؤں کو بھی قتل کیا گیا اور لوٹا گیا، چنانچہ وہ بڑی تعداد
میں وطن چھوڑ کر هندوستان چلے گئے قتل و غارت اور ترک وطن
کے اس دوھرے سلسلہ نے پاکستان اور هندوستان کے تعلقات پر
بہت گہرا اور خراب اثر ڈالا۔ غرضیکہ پاکستان تو معرض وجود
میں آ گیا لیکن اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کو اتنی عظیم قربانیاں
دینی پڑیں کہ ان کی مثال ۱۸۵۷ کے انقلاب اور جنگ آزادی کے
علاوہ برصغیر کی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ ان شہداء
کی بقائے دوام کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

هرگز نه میرد آن که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریده عالم دوام ما

سر راس مسعود علیگڈہ سے جانے کے بعد ریاست بھوپال میں
وزیر تعلیم ہوگئے اور آخر عمر تک وهیں رہے، علیگڈہ میں نواب
محمد اسماعیل خان کو جو اعزازی خازن تھے، وائس چانسلری کے

ذمہ داریاں سپرد کردی گئیں۔ ۱۹۳۵ میں جب عہدہ وائس چانسلری
کے لئے انتخاب کا زمانہ آیا تو سیاسی ماحول بدل چکا تھا۔ قوم
کے رهنماؤں میں سے بعض نے سیاسی میدان میں نمایاں حیثیت حاصل
کرلی تھی، نواب اسماعیل خان کا شمار بھی ان هی بزرگوں میں
تھا، چنانچہ حکومت کو خیال پیدا هوا کہ ان کی سربراهی میں
مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ کے طلبہ اس کے لئے سنہ ۱۹۲۰ء
کی طرح خطرے کا باعث هوسکتے هیں، لہذا اس نے طے کیا کہ
ڈاکٹر ضیاء الدین کو جو سات سال تک یونیورسٹی سے بے تعلق رہے
تھے، اب دوبارہ اس درس گاہ کا سربراہ هونا چاهئے۔ خود وائسرائے
نے ان کو بلاکر کہا کہ وہ وائس چانسلری کا انتخاب لڑیں، یہ
ظاهر تھا کہ نواب حمیداللہ خان آف بھوپال جن کی کوشش سے
ایسے حالات پیدا کئے گئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی
چھوڑنا پڑی تھی یہ پسند نہ کریں گے کہ اب وہ وائس چانسلری
کے عہدے پر آئیں، اس میں ان کی کھلی توهین تھی، لیکن حکومت
نے اس کی پرواہ نہیں کی، اور جب انہوں نے انتخاب سے ایک روز
قبل استعفیٰ دیا تو وائسرائے نے اس کو منظور کرلیا اور نظام
حیدرآباد کو چانسلری کا عہدہ قبول کرنے کے لئے تیار کرلیا۔[7]

ڈاکٹر صاحب نے تین سال تک (۱۹۳۵ تا ۱۹۳۸) وائس
چانسلری کے عہدے پر کام کیا، ۱۹۳۸ میں دوبارہ انتخاب کا زمانہ
آیا، تو مسلمان رهنماؤں نے یہ مناسب خیال کیا کہ انتخاب کی
بجائے مشاورت اور مصالحت سے کام لیا جائے، کیونکہ دونوں امیدوار
یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین اور نواب محمد اسماعیل خان مسلم لیگ
کے سربرآوردہ کارکنوں میں تھے اور انتخاب کی صورت میں اراکین

لیگ میں افتراق کا خطرہ تھا' بعض احباب نے کوشش کر کے اس پر ہر دو امیدواروں کو تیار کرلیا کہ وہ اپنے اپنے نام واپس لے لیں' اور اتفاق رائے سے' فیڈرل کورٹ کے جج سر شاہ محمد سلیمان کو منتخب کرلیا گیا۔

۱۹۴۰ میں شاہ محمد سلیمان کی وفات سے انتخاب کا مسئلہ پھر سامنے آیا۔ اس مرتبہ نواب محمد اسماعیل خان نے انتخاب میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین کے بلا مقابلہ منتخب ہونے میں اس لئے دقت پیش آئی کہ سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد اور سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب' ان کے سخت مخالف تھے' انہوں نے بے حد کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ہنگامہ خیز جلسہ کورٹ میں بہت بحث ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالف اراکین جو اقلیت میں تھے' ہال چھوڑ کر چلے گئے۔ مخالفین کی جماعت میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ بہرحال بقیہ ممبران نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو بلا مقابلہ منتخب کرلیا۔[8] تین سال بعد سنہ ۱۹۴۴ میں تیسری مرتبہ بھی ڈاکٹر ضیاء الدین بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کا استعفیٰ (۱۹۴۶): وفات (۱۹۴۷)

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری سال میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا' جس کے نتیجہ میں ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی طویل اور انتہائی مصروف زندگی کا ایک عظیم سانحہ تھا۔ اس زمانہ میں تحریک پاکستان اور لیگ کی کارکردگی

اپنے نقطۂ عروج پر تھی' اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے اکثر طلبہ اور اساتذہ اس تحریک سے منسلک ہوگئے تھے' قائد اعظم کو بھی علیگڈھ کے طلبہ پر بہت اعتماد تھا اور تقریباً ہر سال بلکہ بعض دفعہ سال میں ایک سے زائد مرتبہ وہ علیگڈھ آتے اور دو دو' تین تین دن قیام فرماتے' یونین میں طلبہ سے خطاب فرماتے اور ان کو موقع دیتے کہ لیگ کی پالیسیوں اور مسلمانوں کے مطالبات جیسے اہم موضوعات پر ان سے سوال کریں۔ دوسرے مسلم رہنماء بھی آتے اور طلبہ سے خطاب کرتے چنانچہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں مسلم لیگ کی مقبولیت بہت زیادہ بڑھ گئی اور ۱۹۴۵-۴۶ کے کلیدی انتخابات میں یہاں کے طلبہ نے کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ بعد اساتذہ نے بھی جن میں راقم الحروف شامل تھا' اس انتخاب میں ملک کے مختلف حصوں میں جا کر انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ دوسری درسگاہوں کے طلبہ نے بھی اس انتخاب میں بہت کام کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کی بے مثال کامیابی (یعنی مرکزی اسمبلی میں سو فی صد سیٹیں حاصل کرنے میں) طلبہ کا بڑا حصہ تھا' اور ان میں سرفہرست علیگڈھ کے طلبہ ہی تھے۔

مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سیاسی زندگی کی لہروں میں تموج کی کیفیت نے طلبہ کے اندر ایسا جوش پیدا کردیا تھا کہ بعض موقعوں پر وہ غلط قدم اٹھاتے اور بہ ضد اس پر قائم رہتے' اسی قسم کا ایک واقعہ دسمبر ۱۹۴۶ میں پیش آیا' علیگڈھ مگیزین میں بہار کے مسلم کش فسادات کے سلسلہ میں حکومت پر سخت اور اس کے نزدیک ناقابل برداشت الفاظ میں تنقید کی گئی

تھی، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وائس چانسلر کو نیم سرکاری طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔ یونیورسٹی کے مفاد کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے اس کی تمام کاپیاں اپنے قبضے میں لے کر، اشاعت روک دینے کا ارادہ کیا۔ اس پر بعض طلبہ کی طرف سے یہ پروپاگنڈہ کیا گیا کہ وائس چانسلر مقالہ نویس کو پولس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ طلبہ میں ایک ہنگامہ مچ گیا اور طلبہ کی ایک جماعت نے ڈاکٹر صاحب کے ان کے دفتر میں گھراؤ کیا اور مجبور کر کے ان سے استعفیٰ لے لیا۔ اکزیکیٹو کونسل نے استعفیٰ منظور نہیں کیا بلکہ یہ طے کیا کہ کورٹ کا خصوصی اجلاس بلایا جائے۔ ادھر طلبہ میں جب یہ خبر پھیلی تو انھوں نے یونین میں جلسہ کر کے معافی مانگی' جو طلبہ اس مذموم حرکت کے مرتکب تھے ان سے بیزاری کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صاحب سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی۔ لیکن انھوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا۔ ۲ مارچ کو کورٹ کا اجلاس ہوا۔ کورٹ نے ڈاکٹر صاحب پر مکمل اعتماد کیا اور کہا کہ وہ اس کو باقاعدہ استعفیٰ متصور نہیں کرتی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس پر اصرار کیا اور اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیا۔ مجبوراً اپنے اپریل کے اجلاس میں کورٹ نے مسٹر زاہد حسین کو وائس چانسلر منتخب کرلیا اور ایک رزولیوشن کے ذریعہ لارڈ ریکٹر (وائیسرائے) کو سفارش کی کہ ڈاکٹر صاحب کی طویل خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو ریکٹر بنادیا جائے۔ تین ماہ بعد زاہد حسین صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور نواب محمد اسماعیل خان صاحب کو وائس چانسلر منتخب کرلیا گیا' لیکن بھارت کی ہندو نواز کانگریس حکومت قائداعظم کے بعد مسلم لیگ کے سب سے بڑے رہنماء کو اس

کلیدی عہدے پر برداشت نہیں کرسکتی تھی' نواب صاحب ایک بااصول اور ہردلعزیز لیڈر تھے' لیکن یونیورسٹی کے مفاد میں انھوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۸ میں وہ مستعفی ہوگئے' اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو وائس چانسلر منتخب کرلیا گیا۔ وہ کانگریس کے ایک معتمد اور وفادار رکن تھے۔

راقم الحرف کی لیگ سے وابستگی

مسلم لیگ کی تنظیم نو کا سلسلہ قائد اعظم کی سرکردگی میں سنہ ۱۹۳۶ میں شروع ہوا اس سال پہلا عمومی اجلاس بمبئی میں ہوا، اگلے سال دوسرا اجلاس لکھنؤ میں۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت اور رکن سازی میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا۔ ادارے کی تنظیم و استحکام کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تقسیم اور اس کی زمین پر مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ بھی زور پکڑتا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ میں یہ مطالبہ لیگ کے پلیٹ فارم سے لاہور کے تاریخی اجلاس میں باقاعدہ ایک رزولیوشن کی شکل میں پیش کیا گیا۔ چار سال کی اس مدت میں لیگ کی مقبولیت ہر گوشہ میں بہت بڑھ گئی، اس کی شاخیں ہر ضلع اور شہر میں قائم ہو گئیں' اور علیگڈھ میں تو دو کی بجائے تین شاخیں تھیں کیونکہ قائد اعظم کی منظوری سے یونیورسٹی میں اپنی علیحدہ شاخ تھی جس کو شہری لیگ سے علیحدہ تصور کیا جاتا تھا۔ شہری لیگ کے صدر بھی یونیورسٹی ہی کے ایک لکچرار ہی تھے' یعنی مولوی حفیظ الرحمٰن[9] جو شعبہ قانون میں لکچرار تھے، بعد میں وہ پروفیسر ہو گئے تھے۔

راقم الحروف کے ان سے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات تھے، ان روابط کے باعث میں نے بھی شہری لیگ سے ہی وابستگی قائم کی۔ ہماری وجہ سے ہمارے چند اور دوست بھی جن میں مسٹر عنایت علی خان لکچرار شعبہ حیوانیات (Zoology) اور ڈاکٹر امیر حسن صدیقی لکچرار شعبۂ اسلامی تاریخ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد افضال قادری مرکزی لیگ میں زیادہ کام کرتے تھے اور اسی باعث راجہ صاحب محمودآباد سے جو لیگ کے سرگرم کارکن اور خازن تھے، ان کے تعلقات کافی گہرے تھے، میری ملاقات بھی راجہ صاحب سے قیصر باغ کے علاوہ جہاں ہم صوبائی لیگ کے جلسوں کے موقعوں پر قیام کرتے تھے، ڈاکٹر افضال کے مکان پر ہی ہوئی تھی۔

حفیظ صاحب کی انتہائی محنت اور تندہی کے باعث علیگڈھ کی شہری لیگ نے خصوصی شہرت حاصل کرلی تھی اور اکثر اس کی دعوت پر دوسرے صوبوں کے رہنماء بھی علیگڈھ آئے تھے۔ ایک مرتبہ یو۔پی۔ کی صوبائی لیگ کونسل کا اجلاس علیگڈھ میں ہوا۔ قائداعظم نے اس موقع پر ممبران کونسل اور علیگڈھ کے نمایاں کارکنان لیگ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ کا انتظام ہم لوگوں نے حفیظ صاحب کے مکان (حفیظ منزل۔ میرس روڈ) پر ہی کیا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس جلسہ میں قائداعظم کا شکریہ پروفیسر اے بی اے حلیم نے ادا کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ پرووائس چانسلری کا عہدہ ختم ہوجانے کے بعد حلیم صاحب شعبہ تاریخ کے چیرمین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، ان دنوں میں کارکنان لیگ کے حلقوں میں ان کی مقبولیت کم ہوتی جارہی تھی، اس کا

خاص سبب یہ تھا کہ پرو وائس چانسلری کے دوران انہوں نے خود کو مسلم لیگ سے نسبتاً علیحدہ ہی رکھا اور یونیورسٹی لیگ کے کارکنوں کو ان کا یہ طریقہ کار ناپسند تھا، برخلاف اس کے تین اہم شخصیتوں نے (یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ظفرالحسن پروفیسر فلاسفی اور ڈاکٹر باہر مرزا) طلبہ اور اساتذہ میں سے کارکنان یونیورسٹی لیگ کے کام میں شریک کار تھے، چنانچہ پروفیسر حلیم کے خلاف یہ پروپاگنڈہ عام تھا کہ وہ لیگ سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں انہوں نے نواب اسماعیل خان کو بھی ناراض کردیا تھا اور ان کی اس ہمدردی کو فراموش کردیا تھا، کہ نواب صاحب نے ہی اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں ان کو پروائس چانسلر مقرر کیا تھا، ان حالات میں وہ لیگ سے کچھ علیحدہ ہوگئے تھے، اب اس موقع پر جب کہ قائد کے خطاب سلسلہ میں ہونے والا جلسہ حفیظ منزل میں ہورہا تھا، میں نے حفیظ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ نواب صاحب کو اس پر تیار کرلیں کہ قائداعظم کا شکریہ شہری لیگ کی طرف سے پروفیسر حلیم ادا کریں، چنانچہ ہم لوگوں کی اس تجویز کو نواب صاحب نے جو شرافت اور کشادہ نظری کے لئے مشہور تھے منظور کرلیا، اگرچہ کارکنان یونیورسٹی لیگ کو ہمارا یہ اقدام ناپسند تھا، لیکن ہماری کوشش اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ حلیم صاحب کو لیگ کی تحریک سے منسلک ہونے اور قائداعظم سے قریب تر ہوجانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے عمدہ تقریر کی جو قائداعظم کے علاوہ اور لوگوں کو بھی پسند آئی۔ اس طرح پروفیسر حلیم مسلم لیگ سے منسلک ہوگئے اور جلد ہی ان کی حیثیت اتنی نمایاں ہوگئی کے آنے والے انتخابات

میں صوبائی لیگ کا ٹکٹ ان کو مل گیا اور وہ ممبر منتخب ہوگئے۔

اس سے پہلے کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ۱۹۴۲ کے موسم بہار میں لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا، اس موقع پر لیگ کے متعدد رہنماء دہلی آنے والے تھے، ہم لوگوں کو خیال آیا کہ شہری لیگ کی طرف سے ایک "لیگ کانفرنس" منعقد کی جائے اور اس میں قائداعظم اور دیگر رہنماؤں کو مدعو کیا جائے۔ یہ طے کیا گیا کہ قائداعظم کو مدعو کرنے کے لئے ایک وفد صدر شہری لیگ مولوی حفیظ الرحمٰن کی سربراہی میں بمبئی بھیجا جائے۔ اس میں میں بھی شامل تھا۔ قائداعظم نے ہمیں اپنے مکان پر چائے پر مدعو کیا، اور کم و بیش تین گھنٹہ تک ہم ان کی خدمت میں رہے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے متعدد موضوعات، واقعات اور شخصیات پر انتہائی دلچسپ اور پر از معلومات گفتگو کی۔ ان کے انداز گفتگو اور بعض تفصیلات سے جو دوران گفتگو میں انہوں نے بیان کیں ہم کو اندازہ ہوگیا کہ علیگڈھ پر ان کو کس قدر اعتماد تھا۔ لیگ کانفرنس کی ہم لوگوں نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کیں اور اصولاً یہ طے کیا کہ یہ شہرھی میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک وسیع شامیانہ اس مقصد کے لئے لگایا گیا، کانفرنس کی صدارت کے لئے ہمارے وفد نے قائداعظم سے مشورہ کیا تھا، اور اپنی طرف سے اس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ ہمارے کارکن چاہتے ہیں کہ بنگال کے کسی لیڈر کو صدارت کے لئے مدعو کریں۔ قائداعظم نے نہایت دلچسپ انداز میں جواب دیا۔ ٹھیک ہے، اگر عمدہ آدمی چاہتے ہو تو خواجہ ناظم الدین کو بلاؤ اور اگر عمدہ ایڈریس (صدارتی خطبہ)

چاہتے ہو تو مسٹر سہروردی کو بلاؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ علیگڈھ کانفرنس میں شرکاء کی بہت بڑی تعداد یونیورسٹی طلبہ کی ہوگی اور اس لئے خطبہ صدارت بہت اچھا ہونا چاہئے۔ چنانچہ سہروردی کو مدعو کیا گیا، اور انہوں نے خاصا دلچسپ خطبہ پڑھا۔ استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے جو خطبہ پیش کیا گیا، اس میں زور تقسیم ہند کے اصول پر تھا، اس لئے کہ اس وقت برصغیر کی سیاست میں یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ لیگ کی کوشش اس کو منوانے اور کانگریس کی مخالفت بہت زوروں پر تھی، کانفرنس کے آخری اجلاس میں قائداعظم نے نہایت پروقار انداز میں جلسہ سے خطاب کیا، اس تقریر میں انھوں نے طلبہ یونیورسٹی کو خاص طور پر مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ آپ لوگ انتہائی جوش اور خلوص کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے آپ اپنی جانیں تک قربان کردیں گے، یہ جذبہ ایثار یقیناً نہایت اعلیٰ کردار کی خصوصیت ہے اور سب لوگ اس کی قدر اور تعریف کرتے ہیں اور اس سے بے حد متاثر ہیں، لیکن میں آپ سے اس جلسہ عام میں یہ معلوم کرنا چاہتاہوں کہ کیا آپ کو یہ اندازہ ہے کہ پاکستان میں وہ علاقے ہونگے جن میں آپ کے وطن شامل نہیں، اور اس کی تخلیق کے بعد آپ کو کوئی مادی فائدہ اس سے نہیں حاصل ہوگا، مادی فوائد ان ہی لوگوں کو حاصل ہوں گے جو وہاں کے باشندے ہیں۔ اس پر بہ یک آواز حاضرین جلسہ نے کہا کہ وہ یہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کو بہرحال اقلیتی حیثیت میں یہاں رہنا ہوگا، تاریخی نقطہ نظر سے قائداعظم کا یہ سوال اور اس کا جواب نہایت اہم ہیں کیونکہ ان سے قطعی طور پر

یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد مادی طور پر ایک خطہ زمین پر حکمرانی حاصل کرنا نہیں تھی، بلکہ اصل مقصد حصول اقتدار کا یہ تھا کہ اس علاقے میں اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں آئے۔ بے محل نہ ہوگا، اگر ہم یہاں اسلامی اقدار کے اس بنیادی تصور کی طرف مختصر الفاظ میں اشارہ کریں کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے دائرے میں مادی اور روحانی زندگیوں کے جملہ پہلو شامل ہیں۔ وہ سیکولر بھی ہے اور اسپریچوئل بھی۔ زندگی کے یہ دونوں پہلو، اس طرح سے ملحق اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں کہ ان کو علیحدہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے روشن مثال جہاد کی ہے، جس کا شمار، عبادات میں ہے، بشرطیکہ وہ ان مقاصد کے لئے ہو اور ان پابندیوں کے ساتھ لڑا جائے جو شریعت نے بتلائی ہیں۔ اس تصور کی روشنی میں تحریک پاکستان کا تجزیہ کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ حصول پاکستان کی کوشش ایک 'کارخیر' تھا جو اسلامی معاشرے کی تشکیل اور قیام کے لئے وہ لوگ بھی کررہے تھے جن کو تخلیق پاکستان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو بہ آسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان علاقوں کے مسلمان جہاں وہ اقلیتوں میں تھے اس تحریک میں اس قدر سرگرم کیوں تھے کہ اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان کا یہ جوش حقیقتاً دین کی خاطر تھا، دنیوی مفاد کے لئے نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اسلامی نظریات (Islamic ideology) میں عقیدت نہیں رکھتے، وہ اس تجزیہ کی حقیقت کو بہ آسانی نہیں سمجھ سکتے۔

دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا بحیثیت ایک خود مختار مملکت نمودار ہونا
اگست ۱۹۴۷

متعدد نشیب و فراز سے گذرنے کے بعد آخرکار کامیابی کی منزل پر آپہنچی اور ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند عمل میں آئی جس کی رو سے مسلم اکثریت والے علاقوں کو مملکت پاکستان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا، اور برصغیر کا باقی علاقہ بھارت قرار دیا گیا[15]۔ تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں کو دو محاذوں پر جنگ لڑنا پڑی برصغیر کی آزادی کے لئے برطانوی استعمار کے خلاف اور حصول پاکستان کے لئے ہندو اور انگریزوں، دونوں کے خلاف، آخرالذکر کی ساری ہمدردیاں، ہندوؤں کے ساتھ رہیں، اس کی سب سے نمایاں شہادت، بنگال اور پنجاب کی تقسیم تھی، جس کا کوئی جواز نہیں تھا، لیکن وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن نے کانگریس کی تجویز زبردستی ایک ضروری شرط کے طور پر مسلمانوں سے منوائی۔ اگر لیگ یہ شرط قبول نہ کرتی تو تخلیق پاکستان ممکن نہ ہوتی۔ یہ قائداعظم کی بصیرت کا نمایاں ثبوت ہے کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم قبول کرلی، حالانکہ برصغیر کا عظیم ترین شہر اس کے نتیجہ میں بجائے پاکستان کے بھارت میں شامل کردیا حقیقت یہ ہے کہ لارڈ کلایو سے ماؤنٹ بیٹن تک کم و بیش دوسو سال (۱۷۵۷-۱۹۴۷) کے زمانہ اقتدار میں برطانوی استعمار کے نمائندوں نے متعدد سازشوں کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا، ان میں آخری سازش یہ تھی جس کے نتیجہ میں

پاکستان کو مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے علاقوں سے محروم ہونا پڑا۔

اگرچہ پاکستان کی تخلیق کو کانگریس نے باضابطہ طریقہ پر منظور کرلیا تھا، لیکن اس کے وجود میں آنے کے بعد بھارت نے ایسے اقدامات کا سلسلہ جاری رکھا جس سے دونوں مملکتوں کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ریاست حیدرآباد پر فوج کشی، کشمیر پر بلا جواز قبضہ جس کے باعث سنہ ۱۹۶۵ میں جنگ ہوئی اور مشرقی پاکستان پر سنہ ۱۹۷۱ء میں باقاعدہ حملہ اور نتیجہ میں اس کی مغربی پاکستان سے علیحدگی، مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

نئی مملکتوں کو انتقال اقتدار ایک عظیم سانحہ ثابت ہوا

باب ششم

ہجرت کا فیصلہ اور تباہی

اکثریت اور اہل اقتدار کے مظالم اور زیادتیوں کے باعث اپنے وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم سنت ہے، مطالبہ و تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے اپنی جانیں قربان کر کے شہداء میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی، ان سے کہیں زیادہ تعداد ان خاندانوں کی ہے جنہوں نے بہ حالت مجبوری یا تخلیق پاکستان کے بعد اس کو اپنا وطن بنانے کی خاطر بھارت سے ہجرت کی، ان مہاجرین کو یا کم از کم ان میں سے اکثر کو لازمی

طور پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان میں سے بعض یہ سوچنے لگے کہ انہوں نے غلطی کی جو ترک وطن کر کے یہاں آئے۔ لیکن ان کو یہ سوچنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد، باوجود اس کے کہ کعبہ قبلہ قرار دیا جا چکا تھا، مدینہ ہی جانا پسند فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ کیفیت باقی نہیں اور جو لوگ ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں، وہ پاکستان کو اب مستقل طور پر اپنا وطن بنا چکے ہیں اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی اور خدمت کے لئے تیار ہیں۔ اور جذبۂ حب الوطنی میں کسی سے پیچھے نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ برصغیر میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اس کا یقینی طور پر اندازہ تھا کہ پاکستان جس کے حصول کے لئے وہ دل و جان سے کوشاں تھے، مسلمانان برصغیر کا وطن ہوگا اور وہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوگا، لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ سب پاکستان کے محدود علاقے میں آکر آباد نہیں ہوسکیں گے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ قائداعظم نے متعدد موقعوں پر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے اس نکتہ کو صاف الفاظ میں بیان کردیا تھا کہ جہاں تک مادی فوائد اور وسائل کا تعلق ہے ان سے وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھائیں گے جو وہاں پہلے سے بسے ہوئے ہیں۔ علیگڈھ کے ایک جلسے میں بھی انہوں نے یہ نکتہ صاف الفاظ میں بیان کیا اور سامعین سے دریافت کیا کہ آیا وہ اس کو سمجھتے ہوئے بھی حصول پاکستان کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں، سامعین نے جن میں بہت بڑی تعداد یونیورسٹی کے طلبہ کی تھی،

کئی، اور بالآخر سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان برصغیر کے نقشے پر
قائم ہوکر رہا۔ ہندوؤں کے لئے جو متحدہ قومیت کے نظریہ پر
اصرار کر رہے تھے، یہ یقیناً سیاسی شکست تھی، چنانچہ ان کی
جانب سے اس کا ردعمل بھی نہایت شدید ہوا اور قتل و غارت
اور انتقال آبادی کا زبردست سلسلہ شروع ہوگیا۔ ماؤنٹ بیٹن کی
جگہ اگر کوئی زیادہ سمجھ دار اور منصف مزاج شخص وائسرائے
ہوتا تو شاید کشت و خون اتنے وسیع پیمانے پر نہ ہوتا جیسا کہ
ہوا۔

ستمبر سنہ ۱۹۴۷ میں ہمارے اعزہ یعنی خان بہادر مولوی
ظفر حسن ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ اور مولوی اشفاق علی
صاحب کیوریٹر عجائب خانہ لال قلعہ کو جو رٹائر ہونے کے بعد
دہلی ہی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، مع اہل وعیال ترک وطن
کرنا پڑا، ہر دو بزرگوں نے دہلی میں مکان تعمیر کرالئے تھے، لیکن
ہندو اور سکھ غنڈوں نے مسلمانوں کو اس بڑے پیمانے پر قتل
کرنا اور ان کے گھروں کو لوٹنا شروع کردیا کہ کثیر تعداد میں
ان کو جان بچاکر کیمپوں میں جانا پڑا، اور وہاں سے یہ لوگ
پاکستان آگئے۔ اس کے بعد علیگڈھ میں بھی ہم لوگ پریشان
ہوگئے اور باوجود یکہ اس وقت تک ہجرت کا ارادہ نہیں تھا یہ
سوچنے لگے کہ شاید ہمارے لئے بھی پاکستان جانا ہی مناسب
ہوگا۔ اس سلسلہ میں جلد فیصلہ کرنا آسان نہ تھا، کیونکہ مسلم
یونیورسٹی کی خاص اور دلکش فضاء میں بائیس سال رہنے کے بعد
وہاں کے درودیوار تک سے اتنا لگاؤ ہوگیا تھا کہ چھوڑنے کو دل نہیں
چاہتا تھا، کافی عرصہ گذر جانے کے بعد بھی قتل و غارت کا

سلسلہ جاری تھا، بھارت میں ہندوؤں کے علاوہ سکھوں نے بھی
مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم شروع کردئیے تھے دہلی سے مسلم
مہاجرین کی ٹرینیں مشرقی پنجاب سے گذرکر لاہور آتی تھیں۔
ان میں دہلی کے علاوہ اس علاقے کے بھی بہت لوگ ہوتے تھے،
سکھوں کے خونخوار جتھے ان پر حملے کرتے اور ہزاروں کی تعداد
میں جوان عورتوں کو پکڑ لے جاتے۔ اس کا ردعمل ظاہر ہے کہ یہی
ہوا کہ پاکستانی علاقوں سے بھارت جانےوالی ٹرینوں پر حملے
مسلمانوں نے شروع کردئیے۔ سنہ ۱۹۴۷ کے آخری مہینوں اور
سنہ ۴۸ء کے شروع میں ان تکلیف دہ واقعات نے انتہائی دردناک
حالات پیدا کردئیے تھے، مشرقی پنجاب اور سکھ ریاستوں کی تو
تقریباً کل مسلمان آبادی اور دہلی اور اس کے قرب وجوار کے
شہروں سے کثیر تعداد میں مسلمان پاکستان جارہے تھے، اس کا
ایک سبب یہ بھی تھا سرکاری ملازمین کو یہ اختیار دیا گیا تھا
کہ وہ اگر چاہیں تو پاکستان جاسکتے ہیں۔ چنانچہ سرکاری
ملازمین مع اپنے خاندان منتقل ہو رہے تھے۔

بہرحال میں نے ابھی پاکستان آنے کا مستقل فیصلہ نہیں
کیا تھا، اگرچہ اہل وعیال کی خواہش بہت زیادہ تھی اور ہر روز
یہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ اس زمانے میں بھارت کی
حکومت نے مسلم لیگ کے کارکنوں کے ساتھ جو وہیں رہ گئے تھے
اپنا رویہ تبدیل کرنا شروع کردیا تھا، آخرکار میں نے بھی ارادہ
کرلیا کہ مسلمانوں کے نئے وطن کو اپنا وطن بنایا جائے، میرے لئے
پاکستان آنے کی کشش کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں نئے
معاشرے کی تشکیل ان نظریات کی بنیاد پر ہوگی جن کا تحریک

پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ کی طرف سے وسیع پیمانے پر پرچار کیا جارہا تھا اور جو حقیقتاً مسلمانوں کے تصور حیات کے بنیادی اصول ہیں۔ یعنی اسلامک آئیڈیالوجی اور سیاسی سطح پر دو قومی نظریہ۔ بے محل نہ ہوگا اگر آخرالذکر کا تاریخی پس منظر کے ساتھ چند الفاظ میں ذکر کیا جائے اس لئے کہ آج اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے جتنی کہ تقسیم سے قبل تھی' پاکستان کے نوجوانوں کو جو تقسیم سے قبل کی تاریخ سے واقف نہیں اس دور کے حالات سے آگاہ کرنا ہے اور یہ بتلانا ہے کہ وہ سیاسی ماحول کیا تھا جس میں مسلمانوں کو دو قومی نظریہ کی بنیاد پر علیحدہ اور خود مختار وطن کا مطالبہ کرنا پڑا۔ جب تک ہماری نوجوان نسل کو پاکستان کی نظریاتی بنیاد اور اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوگا اور اس کا اس تصور پر ایمان پختہ نہیں ہوگا' اس وقت تک استحکام پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی۔

اب ہم دو قومی نظریہ کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں: برصغیر کی قدیم تاریخ کا ایک اہم باب آریائی نسل کے قافلوں کا ورود ہے' یہ لوگ پہلے اس علاقے میں آباد ہوئے جس کو اب پنجاب اور شمالی مغربی صوبہ کہا جاتا ہے۔ بعد میں یہ لوگ مشرقی جانب سے آگے بڑھے اور موجودہ یو۔پی۔ اور اودھ کے علاقوں میں بس گئے۔ انھوں نے مقامی باشندوں کو شکست دے کر مکمل طور پر اپنی سیاسی بالادستی قائم کرلی۔ آریائی تہذیب برصغیر کے شمالی حصہ میں پھیل گئی اور یہی سبب ہے کہ ہمالیہ کے جنوب اور وندھیاچل پہاڑ کے شمال میں واقع وسیع علاقہ کو آریہ ورت

کہاجانے لگا۔ آریائی تہذیب کی معاشری بنیاد ذاتوں کی تقسیم تھی۔ ابتداً میں چار ذاتیں تھیں یعنی برھمن (مذہبی پیشوا) کھتری (حکمران طبقہ)' ویش (پیشہ ور طبقہ) اور شدر (یعنی غلاموں اور خدمت گاروں کا طبقہ)۔ آخرالذکر طبقہ کی حالت جو آج تک اچھوت کہلاتے ہیں ناگفتہ بہ تھی' زمانہ گذرنے کے ساتھ ذاتوں کی تعداد بڑھتی گئی' اور مذہبی زندگی میں بھی اختلافات پیدا ہوتے گئے' جن کے نتیجہ میں دیوتاؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ بعد میں دوسری اقوام اور نسلوں کے لوگ یہاں آئے اور آباد ہوگئے' مثلاً سیتھین' شاک' یونانی اور ھن وغیرہ۔ ان لوگوں نے اپنی حکومتیں بھی قائم کیں۔ لیکن زمانہ گذرنے کے بعد یہاں کے رہنے والوں میں ضم ہوگئے اور ان کا علیحدہ تشخص تو کیا' بعض کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس طرح ہندو قوم میں اضافہ ہوتا رہا۔ اب آبادی کی تقسیم مذہبی بنیاد پر ہوگئی تھی اور اس خطے کے لوگ دو بڑے مذہبوں کے پیروؤں میں تقسیم ہوگئے تھے یعنی ہندو اور بدھ' ہندوؤں اور بدھوں میں سخت رقابت اور کشمکش تھی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی اور شمالی برصغیر کے بڑے علاقے پر وہ غالب تھے' بدھ مذہب کے پیرو مقابلتہً تھوڑی تعداد میں سندھ اور مشرقی بنگال کے علاقوں میں تھے' ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمان یہاں آنا شروع ہوئے تو یہ صورت حال تھی۔

جیسا کہ تاریخ کے طلبہ جانتے ہیں مسلمانوں نے پہلے سندھ اور ملتان کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی اور زمانہ گذرنے کے ساتھ دوسرے علاقے بھی ان کے زیر حکومت

آگئے۔ علاء الدین خلجی (ف۔ سنہ ۱۳۱۶ء) کے عہد میں کم و بیش سارے برصغیر پر اسلام کی حکمرانی یا براہ راست یا بہ ذریعہ باج گذاران قائم ہوگئی اس وقت سے سنہ ۱۸۵۸ء تک مسلمانوں کی حکومت رہی، اگرچہ آخر سو سال (۱۷۵۷ تا ۱۸۵۸) ان کا اقتدار برائے نام تھا۔ اس طویل مدت میں یعنی سات سو برس تک، ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات بڑی حد تک خوشگوار رہے۔ اس کا بڑا سبب تو مسلم حکمرانوں کی رواداری تھی، محکوم قوم یعنی ہندوؤں کی نجی زندگی اور خاص طور پر ان کے مذہبی اور سماجی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ اس سلسلے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ ہندو اپنے سواء دوسری اقوام کو ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے تھے، ان میں مسلمان بھی تھے، جن سے وہ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے اور ان کی چھوئی ہوئی چیز کو ناپاک خیال کرتے اور نہ کھاتے۔ اس طرح برصغیر کی معاشری اور معاشرتی زندگی مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی سب سے بڑا طبقہ ذات والے ہندؤں کا تھا، ان کے علاوہ اچھوت تھے جو ان میں شامل تو نہ تھے لیکن غلاموں اور خدمت گاروں کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے، تیسرا طبقہ مسلمانوں کا تھا، جن کی مذہبی اور معاشری زندگی کی بنیادیں اسلام کی تعلیمات (یعنی قوانین و احکامات شریعت) پر قائم تھیں۔

مذہبی اور معاشری بنیادوں پر آبادی کی یہ تقسیم طبقاتی تقسیم نہ تھی، بلکہ وہ ایسی بنیادی تقسیم تھی جس نے ہندو اور مسلمانوں کو دو علیحدہ قومیں بنا دیا تھا، جو ایک نظم حکومت اور ایک اقتصادی نظام کے تحت ایک مشترکہ وطن میں صدیوں

تک امن و امان کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ اس طویل مدت میں ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد سے تعیر شدہ معاشرہ چند مخصوص کوائف کا حامل تھا، سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ برصغیر دونوں کا مشترک وطن تھا اور اقتصادی زندگی میں دونوں شریک تھے، اور دونوں حکومت کی ایک ہی مشنری کو تسلیم کرتے تھے، مذہب و معاشرت کے لحاظ سے دونوں علیحدہ قومیں تھیں اور صدیوں تک اس علیحدگی کی کیفیت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہیں اور یہی علیحدگی کی کیفیت ہے جس کو اب دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔

سید احمد خان

برطانوی دور حکمرانی میں اس علیحدگی کو مزید استحکام حاصل ہوا کیونکہ بیرونی حکمرانوں کو اپنے اقتدار و استعمار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے ان دونوں قوموں کے اختلافات کو زیادہ بڑھانے میں ہی فائدہ تھا۔ برطانوی استعمار کی اس حکمت عملی کا آغاز تو انیسویں صدی کے ربع اول ہی میں ہوگیا تھا، لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ طریقہ کار زیادہ نمایاں ہوگیا۔ مسلم رہنماؤں میں سب سے پہلے ان حالات کا بہ غور مطالعہ اور تجزیہ، سید احمد خان کی ذہانت نے کیا اور اس اس کا اندازہ بھی انہوں نے ہی لگایا کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے باعث مسلمان ایک عجیب مایوسی کی حالت سے گذر رہے تھے، اور مزید براں انگریز افسروں کے انتقام اور مظالم کے نتیجہ میں ان کی سیاسی حیثیت اور اقتصادی حالت بے حد پست ہوچکی تھی، بچپن میں وہ

مغلیه حکومت کے انحطاط کا منظر به چشم خود دیکھ چکے تھے' اس کے بعد کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں ان کو برطانوی حکومت کے روز افزوں اقتدار کا بھی اندازہ ھوگیا تھا' ان ھی دنوں میں چند برطانوی افسروں سے تعلقات ان کے ذاتی بھی استوار ھوچکے تھے' انقلاب سنه ۵۷ء کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور انقلابی دور کے واقعات و حالات نے ان کو وسیع تجربه حاصل کرنے کا موقع دیا تھا' فطری صلاحیت اور وسیع تجربات کے علاوہ ان وحشیانه مظالم کے مناظر نے جو مسلمانوں پر توڑے جارہے تھے' ان کے دل کو دردمند اور حساس بنادیا تھا، وہ انقلاب اور حکومت کے خلاف جہاد کے خلاف تھے اس لئے که ان کو یقین تھا که حکومت کے خلاف "بغاوت" کامیاب نہیں ھوگی اور اس کے نتیجه میں مسلمانوں کو تباھی و بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کی جانی و مالی قربانیاں بے نتیجه ثابت ھوں گی اپنے اس موقف کے باعث جو انہوں نے انقلاب سنه ۵۷ کے سلسلے میں اختیار کیا' سید احمد خان پر مورخین اور سیاست دان سخت الفاظ میں تنقید کرتے رھے ھیں' لیکن بعد کے واقعات اور ان کی شاندار تعلیمی اور سیاسی خدمات و اصلاحات کی روشنی میں ان پر یه الزام لگانا غلط ھے که ان کی عظیم تحریک کی بنیاد اور اس کا سبب "جذبه وفاداری" تھا اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ برطانوی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا۔ حقیقت یه ھے که ان کا واحد مقصد یه تھا که مسلمانوں کو مایوسی اور پستیوں کی گہرائیوں سے نکال کر ایک ایسے راستے در چلایا جائے جو زمانه کے بدلتے ہوئے حالات میں ان کے لئے مفید ھی نہیں

بلکه لازمی اور ضروری تھا' یہاں اس مسئله پر تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی لیکن' اس میں ذرہ برابر شک نہیں اور اب غیر متعصب مورخین پر یه بات ظاھر ھوگئی ھے که حکومت کے ساتھ ان کا گہرا تعاون' مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن ھونے کی اھلیت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا اور یه ان کی ھمت اور بے خوفی تھی که ھر قسم کی مخالفت اور گوناگوں مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنی وفات (سنه ۱۸۹۸ء) سے پہلے ان کو ترقی کی راہ پر چلنے کے قابل کردیا۔

سید احمد خان کے اصلاحی تدبیر اور حکمت عملی کے دو نمایاں پہلو ھیں : تعلیمی اور سیاسی۔ ھم مؤخرالذکر سے متعلق چند امور کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ھیں۔ سنه ۱۸۸۰ میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں چند نمایاں ھندو لیڈروں کے علاوہ ایک انگریز (رٹائرڈ) سول سرونٹ' آکٹوین ھیوم (Octavian Hume) کا نام بھی قابل ذکر ھے۔ کانگریس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تھا که برصغیر کی پوری آبادی ایک قوم ھے اور کانگریس اس کی واحد نمایندہ جماعت ھے۔ یه ظاھر تھا که کانگریس میں مسلمان برائے نام ھوں گے' اور جہاں تک مسلمانوں کے مفاد کا تعلق ھے کانگریس اس کی نگہداشت نہیں کرسکے گی۔ سید احمد خان نے مستقبل کی تاریخ کے اس عمل کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اپنی قوم یعنی مسلمانوں کو صاف الفاظ میں بتلایا که مسلمان ایک علیحدہ قوم ھیں اور اپنے مفادات کی حفاظت انہیں خود کرنا ھے اور اس کے لئے انہیں خود اپنا راسته اختیار کرنا ھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے

نہایت زبردست تقریریں کیں اور بتلایا کہ مسلمانوں کا کانگریس سے تعاون ان کے مفادات کے خلاف ہوگا۔ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں، ان کو نہایت مستحکم انداز سے اس موقف پر قائم رہنا چاہئے۔ برصغیر کی سیاسی زندگی کے اس پہلو پر انہوں نے بہت زور دیا کہ یہاں ایک نہیں دو قومیں ہیں (یعنی ہندو اور مسلمان) اور ان کے مفادات علیحدہ ہیں۔ اس تصور کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ سید احمد خان کی وفات کے چند سال ہی بعد ۱۹۰۶ میں مسلمانوں نے اس لئے ایک علیحدہ قومی ادارے کی آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے بنیاد رکھی اور جیسا کہ ہم سب نے دیکھا اسی لیگ نے ۴۱ سال بعد، قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تقسیم ہند کا مطالبہ کیا اور بالاخر ان کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا۔ پاکستان اب ایک خود مختار ریاست ہے جہاں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کی بنیادیں اسلامی تعلیمات و تصورات پر قائم کی جائیں۔

کراچی میں قیام : ابتدائی دور

اوپر بیان کئے گئے خیالات اور واقعات سے ذہن مکمل طور پر متاثر ہوچکا تھا کہ میں نے پاکستان کو نیا وطن بنانے کا مصمم ارادہ کرلیا، اور مسلم یونیورسٹی کے ہاتھ اپنا بنایا ہوا مکان فروخت کرنے کی کوشش کی اس میں زیادہ دقت پیش نہ آئی، اس کا سبب یہ تھا کہ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب وائس چانسلر تھے، جب میں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا تو وہ مسکرائے اور مکان کی خریداری کے لئے زبانی وعدہ فرمالیا، یونیورسٹی انجینیر

نے وائس چانسلر کے حکم پر مکان کی قیمت کا تخمینہ صرف اٹھارہ ہزار لگایا، حالانکہ اس سے چند ماہ پیشتر ایک خریدار نے اس سے تین گنا قیمت لگائی تھی اور بہت اصرار کیا تھا لیکن اس وقت ہم نے ہجرت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور فروخت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ بہرحال اٹھارہ ہزار میں مکان فروخت کرکے یہ رقم امپیرل بنک کی علیگڈھ شاخ میں داخل کردی اور دوسرے ہی روز پندرہ ہزار روپیہ سے اپنا اکاؤنٹ اسی بنک کی کراچی شاخ میں کھلواکر بذریعہ تار منتقل کرادی، اس کے فوراً ہی بعد کچھ سامان نہایت کم قیمت پر فروخت کردیا، فرنیچر کی کچھ چیزیں بعض احباب کو دے دیں اور چونکہ افواہیں گرم تھیں کہ پاکستان میں مہاجرین کو اشیائے ضرورت فراہم کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں، اس لئے ایک ہندو شاگرد کے مشورے سے جو ریلوے میں تھے اور مجھ سے عقیدت رکھتے تھے، ٹامس کک اینڈ کو کے ذریعہ سے کراچی روانہ کردیا۔ ناشکرگذاری ہوگی اگر میں اپنے عزیز ہندو شاگرد کا ذکر تشکر آمیز جذبات اور الفاظ کے ساتھ نہ کروں۔ انہوں نے خود سامان علیگڈھ اسٹیشن سے بمبئی کے لئے سمندری جہاز پہنچادیا۔ راستہ کی شکست ریخت سے قدرے نقصان ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ کتابیں کم سے کم بھیجی تھیں، پھر بھی دو بوریاں بھری ہوئی تھیں جو بخیریت پہنچ گئیں۔

یکم اپریل سنہ ۴۸، کو دوپہر کے قریب ایک ٹرک میں سوار ہوکر ہم لوگ آگرہ پہنچے اور وہاں سے "چھوٹی" لائن کی ایک ٹرین میں حیدرآباد سندھ کے لئے روانہ ہوگئے۔ سفر محفوظ رہا، راستے میں ایک اسٹیشن پر ایک سکھ مسافر جس کے کوٹ

کی جیب میں شراب کی بوتل تھی (ہمارے ڈبہ میں داخل ہوگیا) اگرچہ ہمارا ڈبہ پورا رزرو تھا اور یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس سے نہ الجھیں۔ بلوے کم ہوگئے تھے اور ریل گاڑیوں پر حملے بھی تقریباً ختم ہوگئے تھے لیکن پھر بھی فساد کا خوف دلوں میں ضرور تھا، سکھ مسافر جوکہ "بلا ٹکٹ" سفر کررہا تھا' اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ کر اپنا سفر جاری رکھے۔ دن بھر سفر جاری رہا اور نصف شب گذرنے کے بعد گاڑی کھوکراپار پر پہنچی جہاں ہندوستان کی حد ختم ہوتی ہے۔ یہاں سامان کی بہت سخت اور تفصیلی چیکنگ ہوتی تھی۔ چنانچہ سب مسافر اتر کر کھڑے ہوگئے تھے اور ان کو حکم دیا جارہا تھا کہ اپنے اپنے صندوق کھولیں سامان کو چیک کرنے والے ریلوے ملازمین نہایت لاپرواہی سے سامان کو ادھر اُدھر پھینک دیتے تھے اور مسافروں کو دوبارہ زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔ اس منظر کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہمارے سامان کا پہلا بکس کھولا گیا تو وہ اتفاق سے میرا بکس تھا کپڑوں کے ساتھ چند کتابیں بھی رکھ دی گئیں۔ ریلوے کے ہندو ملازمین نے یہ کتابیں اٹھائیں تو ان کے ہاتھ میں میری کتاب "شارٹ ہسٹری آف دہلی سلطنت" اور پروفیسر حبیب مرحوم "کی محمود آف غزنین" آئیں۔ دونوں چیکرز نے انہیں غور سے دیکھا اور پوچھا آپ کا کیا نام ہے۔ میں نے نام بتلایا تو بولے' جائیے ہم آپ کا سامان چیک نہیں کریں گے۔ ان ہی کتابوں کو پڑھ کر تو ہمنے امتحان پاس کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا کرم تھا اور اس کے لئے ہم جس قدر بھی شکر گزار ہوں۔

کم۔ یہی نہیں کہ ہم زمین پر پھینکی ہوئی اشیاء اور کپڑوں کو صندوقوں میں ترتیب سے رکھنے کی زحمت سے بچ گئے' بلکہ اللہ نے ایک زبردست ممکنہ خطرے سے محفوظ رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ میرے مہربان کرمفرما مولوی محمد علی لطفی بھی ہمارے ساتھ تھے' وہ حافظ ہیں' معالم ہیں' خطیب ہیں' اور اب بھی عربی کی تعلیم دیتے ہیں۔ علیگڈھ میں ان ہی سے میں عربی پڑھتا تھا' ان کا کیس تو چھوٹا ہی تھا لیکن مولانا نے اس میں ایک خطرناک چیز کپڑوں کی تہ میں رکھ لی تھی۔ ہندوستان میں اس زمانہ میں چار انچ سے زیادہ لمبا پھلکے والا چاقو رکھنا جرم قرار دے دیا گیا تھا' مولانا کو اس کا علم تو تھا لیکن انھوں نے ایک بڑا چاقو جس کا پھلکا تقریباً آٹھ انچ تھا' اپنے بکس میں رکھ لیا تھا۔ اگر ہمارا سامان بھی دوسرے لوگوں کے احباب کی طرح چیک کیا جاتا اور مولانا کا یہ چاقو پکڑا جاتا تو معلوم نہیں ہمیں اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

کراچی پہنچکر ہم مولوی اشفاق علی صاحب مرحوم کے کوارٹر میں مقیم ہوئے۔ ہمارے اس قافلہ میں سولہ سترہ افراد تھے'[3] ان کے علاوہ دو دوست یمنی مولوی محمد علی اور ایم ایچ صدیقی بھی تھے جو بعد میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اب رٹائر ہونے کے بعد یونیورسٹی میں مسلم لیگ کی دستاویزات کے ڈائریکٹر ہیں۔ یہ کوارٹر جس میں ہم قیام پزیر ہوئے صدر میں جیکب لائنز میں واقع تھے۔ ان میں مہاجروں کی بڑی تعداد آباد ہوچکی تھی۔ کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے' چنانچہ تین چار افراد کے علاوہ سب زمین پر سوتے تھے۔ سب سے اہم مسئلہ کراچی میں مکان تلاش کرنے کا تھا' بڑی تعداد مہاجرین

کی اسی کوشش میں تنگ و دوکرتی نظر آتی تھی، ابھی دو تین دن ہی گذرے تھے کہ بازار میں علیگڈھ کے ایک شاگرد ملے جو یہاں ملازم اور آباد ہوچکے تھے۔ خیر وعافیت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے پوچھا کہ رہائش گاہ کا کیا انتظام ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی توکچھ نہیں۔ وہ فوراً بولے، آپ کل صدر میں وکٹوریہ روڈ (اب عبداللہ ہارون روڈ) میں اس عمارت میں آجائیں جو وکٹوریہ مینشن کے نام سے مشہور ہے۔ میں اسی میں مقیم ہوں اور اس میں ایک فلیٹ خالی ہے۔ بس اسی میں آپ آباد ہوجائیں۔ چنانچہ دوسرے روز میں اور بیگم صاحبہ (مرحومہ) مع دیگر اعزہ کے ہمراہ گئے۔ ہمارے شاگرد موجود تھے، انہوں نے اپنا فلیٹ دکھلایا جس میں چار وسیع کمرے اور ایک برآمدے کے علاوہ ملحقہ باورچی خانہ اور آؤٹ ہاؤس تھے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت کراچی میں یہ فلیٹ بہترین فلیٹوں میں سے ایک تھا۔ برابر کا فلیٹ خالی تھا اور اس کے تالے کی کنجی میرے ان شاگرد کے پاس تھی۔ وہ بولے بس آج ہی رات یا زیادہ سے زیادہ کل آپ آجائیں۔ اگر دیر ہوئی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔ سب کو پسند تھا لیکن کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ کراچی میں مکان حاصل کرنا کسقدر مشکل ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ یہ تیسری منزل پر ہے، شاید غلام علی تالپور کی مدد سے جو اس وقت صوبائی وزیر تھے، علیگڈھ جیسا کوٹھی نما مکان مل ہی جائے گا۔[۹] لیکن یہ امید موہوم ثابت ہوئی۔ بہرحال وکٹوریہ مینشن کے فلیٹ کا خیال چھوڑ دیا۔ بعد میں پیش آنے والی مشکلات اور ناکامیوں کے پیش نظر خیال ہوا کہ یہ عظیم غلطی تھی۔

چند روز بعد علیگڈھ یونیورسٹی فزکس کے لیکچرار مسٹر طفیل احمد بھی آئے۔ وہ اس غرض سے کراچی آئے تھے کہ بزنس (کاروبار) کرنے کے امکانات کا اندازہ لگالیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ان کی ملاقات سکھوں کے ایک ٹرسٹ کے مینیجر سے ہوئی، جو گرومندر کے قریب ست گرو نامی ایک عمارت میں رہتا تھا اور اپنی شخصیات کو چھپانے کے لئے داڑھی اور مونچھیں منڈاتا تھا، ست گرو کے چودہ فلیٹوں میں سے ایک میں وہ رہتا تھا اور ایک خالی تھا، بقیہ فلیٹ پولس افسروں کے پاس تھے، اس نے خالی فلیٹ طفیل صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا اور ہم نے طے کر کے اس میں سکونت اختیار کرلی۔ بعد میں یہ فلیٹ میرے برادر محمد سید عرفان الحق مرحوم کے نام الاٹ ہوگیا۔ اسی فلیٹ میں ہم سب رہنے لگے اور مکان کی تلاش جاری رہی اور ناکامیابی کا سامنا کرتے رہے۔

دستور ساز اسمبلی کی ملازمت

چند روز بعد میں اپنے دوست اور دستورساز اسمبلی کے سکریٹری مسٹر ایم بی احمد، آئی سی ایس، کے پاس ملنے گیا۔ وہ علیگڈھ میں ایم اے اور ایل ایل بی میں میرے ہم جماعت تھے اور ہوسٹل میں سر سید کورٹ میں میرے کمرے (نمبر ۳۶) کے قریب ہی ۲۹ نمبر کمرے میں رہتے تھے۔ عقائد و خیالات اور مزاجی کیفیت میں ہم آہنگی کے باعث تعلقات میں بہت جلد گہرائی پیدا ہوگئی۔ تاریخ و لیکچرز کے علاوہ بھی ہم زیادہ تر ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ نہایت شریف النفس اور خوش اخلاق انسان تھے۔ اکثر امور میں ہم دونوں

کی رائے ایک ہی ہوتی تھی۔ صرف ایک بنیادی فرق تھا۔ وہ شروع ہی سے آئی سی ایس کے لئے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہونے کا ارادہ کرچکے تھے، اور مجھے تعلیم و تدریس سے دلچسپی تھی، وہ مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوئے اور فوراً ہی لندن چلے گئے اور وہاں بھی اسی امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ علیگڈھ میں ڈسٹرکٹ جج ہوکر آئے۔ اس زمانہ میں ہمارے روابط اور زیادہ بڑھ گئے ان کی صلاحیت اور ایمانداری کے باعث قائداعظم جن سے ان کو نیاز حاصل تھا، ان کو پسند فرماتے تھے، چنانچہ تقسیم کا فیصلہ ہوجانے کے بعد قائداعظم نے ان کو پاکستان آپٹ (opt) کرنے کا مشورہ دیا۔ ایم بی احمد صاحب نے مجھ سے خود کہا کہ جب وہ یو۔ پی کے چیف منسٹر سے ملنے گئے اور پاکستان جانے سے متعلق کہا تو اس نے انہیں روکنا چاہا اور کہا کہ وہ بہت جلد ان کا تقرر الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی پر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ پاکستان آنے کا فیصلہ کرچکے تھے۔

میں اپنے اس تاثر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو کراچی میں ان سے پہلی ملاقات میں میرے دل پر ہوا۔ اس وقت وہ کلفٹن کے پل سے اترکر بائیں جانب ایک کوٹھی میں مقیم تھے، شام کو عصر اور مغرب کے درمیان میں ان کے مکان پر گیا۔ بے حد خوش ہوئے اور قطعئی طور پر اسی طریقے سے ملے اور گفتگو کی جیسے علیگڈھ میں ملتے تھے۔ کافی دیر تک ہر موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ رات ہوگئی تھی، کھانے پر روکتے رہے، لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ بہت دیر ہوجائے گی۔ چلتے وقت مجھے روک کر بولے چلو میں تم کو پہنچادوں۔ چونکہ ڈرائیور نہیں تھا خود گاڑی

چلا کر جیکب لائنز تک پہنچانے آئے۔ گاڑی نہایت آہستہ چلاتے تھے۔ رخصت کرنے سے پہلے کہنے لگے، اسمبلی میں ریسرچ آفسر کی جگہ خالی ہے۔ کل یا پرسوں آ کر ملازمت کے لئے درخواست دیدینا۔ چنانچہ چند روز ہی میں مجھے تقرری کا خط مل گیا اور میں نے چارج لے لیا۔ افسرشاہی تنظیم کو میں شروع ہی سے نا پسند کرتا تھا، اور علیگڈھ کے بائیس سالہ دور ملازمت میں یہ جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، لیکن ایم بی احمد (مرحوم) کی ماتحتی میں تقریباً دو سال گذارے اور اس عرصے میں کبھی کوئی بات ایسی نہیں کی جو زرا بھی ناگوار گذری ہو، وہ مجھے زیادہ تر Basic Principles کمیٹی کے سلسلے میں مواد جمع کرنے کی ذمہ داری دیتے تھے۔ کراچی کے ذرائع آمدورفت قابل اطمینان نہ تھے۔ مگر یہ ایسی تکلیف تھی جس کا سامنا سب ہی شہروں کو کرنا پڑتا تھا۔ اس کے انتظار میں کافی وقت ضایع ہوتا تھا۔

اس ملازمت کے تقریباً دوسالہ دور میں تاریخ کے مطالعہ سے تعلق قطع نہیں کیا، چنانچہ اردو اکیڈمی سندھ کی خواہش پر، برصغیر کی تاریخ کے اسلامی دور پر ایک مختصر کتاب "عہد زرین" تصنیف کی۔ اسکول کے طلبہ کے لئے یہ نہایت مفید ثابت ہوئی۔ اور اس کے کئی ایڈیشن شائیع ہوئے۔ لیکن جلد ہی ایک اہم منصوبہ کے سلسلے میں کام کیا۔ اس زمانہ میں مسٹر فضل الرحمٰن وزیر تعلیم تھے، وہ ایک ذہین اور دردمند مسلمان تھے، خوش عقیدت صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور اسلام کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے، اپنے وطن ڈھاکہ میں مسلمانوں کے معاملات میں بے حد

دلچسپی سے کام کرتے تھے، بالخصوص تعلیمی امور میں۔ ڈاکٹر
محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی نائب وزیر تھے۔
ایم بی احمد صاحب بھی مورخ تھے۔ ہم سب کو اس کا شدید
احساس تھا کہ برصغیر کی تاریخ پر ایک کتاب تیار کرنا چاہئے۔
فضل الرحمٰن صاحب سے درخواست کی گئی' وہ تیار ہوگئے اور محکمہ،
تعلیم کی طرف سے ایک بورڈ تشکیل کیا گیا' جس کے صدر ڈاکٹر
محمود حسین مقرر ہوئے اور سکریٹری مسٹر ایم بی احمد' مجھے
جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا، اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی
ذمہ داری جناب ایم بی احمد صاحب نے کلیتہً میرے سپرد کی۔
اسی زمانہ مین موقع پا کر میں نے ان حضرات کو توجہ دلائی کہ
پاکستان مین ایک ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہونا چاہئے اس لئے
کہ انڈین ہسٹری کانگریس اور اس کے کارکن ہندوستان مین رہ گئے
تھے۔ فضل الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا گیا تو وہ فوراً تیار ہوگئے۔
سوسائٹی کے قیام اور اس کی ضروری تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔

اردو کالج

اگرچہ اسمبلی کا ماحول میرے لئے ناخوشگوار نہ تھا'
مجھے مستقل طور پر سرکاری ملازمت پسند نہ تھی اور اسی کا انتظار
تھا کہ یونیورسٹی یا کسی اچھے کالج میں ملازمت مل جائے تو
بہتر ہے۔ چنانچہ اردو کالج میں جو اسی زمانہ مین قائم ہوا تھا'
وائس پرنسپل اور پروفیسر تاریخ کی جگہ نکلی۔ میں نے فوراً
درخواست بھیج دی۔ ممبران بورڈ کو تعجب ہوا اور یہی سوال
کیا کہ آپ سرکاری ملازمت مین ہوتے ہوئے یہاں کیوں آنا چاہتے

ہین۔ میں نے جو حقیقت تھی بیان کی کہ میں تدریسی ادارے سے
منسلک ہونا چاہتا ہوں۔ اس پر سب کو کچھ حیرت ہوئی'
چنانچہ مولوی عبدالحق (مرحوم) نے جو بورڈ کے صدر تھے' صاف
الفاظ میں کہا کہ اگر ہم آپ کا تقرر کردیں تو کیا واقعی آپ
اسمبلی کی ملازمت چھوڑ کر یہاں آجائیں گے۔ مین نے کہا ضرور
آجاؤں گا، اگر یہ ادارہ پختہ نہ ہوتا تو میں ہرگز درخواست نہ
بھیجتا۔ جب مشاہرہ کے متعلق دریافت کیا تو میں نے جواب دیا
کہ اس سے کچھ زیادہ ہونا چاہئے جو اسمبلی میں ملتا ہے۔ چنانچہ
یہ درخواست منظور کر کے بورڈ نے میرا تقرر کردیا اور میں نے
وائس پرنسپل کا چارج لے لیا۔

اردو کالج کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، حقیقتہً
وہ دو کالج تھے' ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا شام کو رات
کے نو ساڑھے نو بجے تک تقسیم کے بعد سے کراچی کی آبادی
میں تیزی سے اضافہ ہورہا تھا اور تعلیمی درسگاہیں کم تھیں۔
اس کے علاوہ مہاجرین کے اکثر خاندانوں کی اقتصادی حالت ایسی
تھی کہ ان کے نوجوان افراد دن میں ملازمت کرتے تھے اور کو
شام کو کالجوں اور اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ شام
کے وقت میں صبح کے مقابلہ میں تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اتنی
مدت گذر جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور اب بھی شام کے
وقت بعض کالجوں میں پڑھائی ہوتی ہے۔ آج بھی شرح خواندگی
۲۶ فی صد ہے' جو قابل افسوس بھی ہے اور شرمناک بھی۔
تدریسی اوقات اور طلبہ کی تعداد کے علاوہ اردو کالج کو بعض
اور مسائل کا بھی سامنا تھا' کالج' انجمن ترقی اردو کا ذیلی ادارہ

تھا اور انجمن کے سکریٹری اور روح رواں یعنی مولوی عبدالحق کالج کی انتظامیہ کے بھی صدر تھے۔ حیدرآباد دکن کے ایک سابق اعلیٰ افسر مولوی تقی الدین اس کے اعزازی سکریٹری تھے۔ وہ انجمن ہی کی عمارت میں قیام پذیر تھے ان کو کالج سے بے حد دلچسپی تھی اور اس کی بہبود کے لئے ہمہ وقت کوشاں اور فکر مند رہتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنی ضعیفی کے باعث عملی طور پر زیادہ کام نہیں کرسکتے تھے، چنانچہ کالج کے جملہ امور سید تقی الدین صاحب کے اختیار میں تھے، ان کے بڑے بھائی جو کافی ضعیف تھے کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے صبح کے وقت تشریف لاتے تھے اور ضروری کاغذات پر دستخط کردیتے تھے، وائس پرنسپل کا چارج لینے کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے وہ جملہ فرائض عملی طور پر سنبھالنے ہونگے جن کا بالعموم ذمہ دار پرنسپل ہوتا ہے۔ تقی الدین صاحب ایک دیسی ریاست میں افسر رہ چکے تھے، اور یہ پسند کرتے تھے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی کافی وقت ان کے پاس گذاریں۔ دن میں وہ خود ملازمت کرتے تھے، لیکن شام کو کالج آتے رہتے تھے۔ شروع میں، میں بھی تقریباً روزانہ ان کے پاس جاتا تھا۔ بعد میں کام کی زیاتی کے باعث میرا جانا ان کے پاس کم ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ردعمل ان کی طبیعت پر یہ ہوا کہ میں دانستہ ان کے پاس جانا نہیں چاہتا، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، بلکہ اکثر دفتری کام اور کلاس پڑھانے میں رات کے ساڑھے نو اور دس بج جاتے اور میں ان سے ملے بغیر چلا آتا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بعض اساتذہ نے شکایت کر کے ان کی اس بدگمانی میں اضافہ کردیا اور ہم دونوں کے تعلقات کی خوشگواری

کشیدگی میں تبدیل ہونے لگی۔ کالج کی ملازمت چھوڑنے کا واقعہ دلچسپ ہے۔ چونکہ پرنسپلی کے فرائض عملی طور پر میں ہی انجام دیتا تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ مستقل طور پر پرنسپلی پر میرا ہی تقرر ہوگا، لیکن جب میں نے اس کا ذکر جناب عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) سے کیا تو انھوں نے اس خواہش سے اتفاق ہی نہیں کیا بلکہ اس کو کالج کے مفاد میں ضروری بھی کہا، چنانچہ انھوں نے مولوی عبدالحق سے تذکرہ کیا اور سختی سے اپنی رائے کا اظہار اس اقدام کے حق میں کیا، لیکن ان کو حیرت ہوئی جب مولوی صاحب نے ان کو جواب دیا کہ یہ ممکن نہیں اس لئے کہ ہم نے طے کرلیا ہے کہ ہم پرنسپلی پر تقرر میجر آفتاب حسن کا کریں گے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کسی قسم کی کوشش بے کار تھی، میں خاموش ہوگیا ''صبر جمیل'' کا راستہ اختیار کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں یہ دوسری ناکامی تھی، اس سے قبل سندھ مدرسہ کالج (سندھ مسلم کالج) میں تاریخ کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ پروفیسر عبدالرحمٰن جو مدرسہ بورڈ کے سکریٹری تھے یہ چاہتے تھے کہ اس جگہ پر میرا تقرر ہو، لیکن پروفیسر اے بی اے حلیم نے مجھ سے ٹیلی فون پر کہا کہ میں بورڈ کے سامنے انٹرویو میں نہ جاؤں۔ مجھے اس سے صدمہ ہوا کیونکہ اس وقت میں اسمبلی میں ریسرچ افسر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انٹرویو کے دوران پروفیسر عبدالرحمٰن نے دو مرتبہ مجھے ٹیلی فون کیا کہ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن میں حلیم صاحب کی ہدایت کے خلاف قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس جگہ پر ڈاکٹر محمد سلیم

کا تقرر ہوا، اسی زمانہ میں گورنمنٹ کالج سکھر میں جگہ خالی ہوئی اور اس پر میرا تقرر کیا گیا لیکن میں نے اس پیش کش کو منظور نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ کراچی یونیورسٹی کی پروفیسری سے محروم رہنے سے ہوا۔ جب اس جگہ کا اشتہار شایع ہوا میں نے درخواست دی اور مجھے یقین تھا کہ میرا تقرر ہوجائے گا۔ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق قریشی جو تقسیم سے قبل علی الترتیب ڈھاکہ اور دہلی یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہ چکے تھے، اب وزیر ہوگئے تھے اور ظاہر ہے پروفیسری کے لئے وزارت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم جو مسلم یونیورسٹی میں لیڈر رہ چکے تھے، اب ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے تھے، وہ اپنا وطن (ڈھاکہ) چھوڑ کر کراچی آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ مجھ سے یہ کہہ چکے تھے کہ اگرچہ میں نے حلیم صاحب کے کہنے سے عرضی بھیج دی ہے لیکن میں نے ان سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں ڈھاکہ چھوڑ کر کراچی ہرگز نہیں آؤں گا۔ ان حالات میں بجا طور مجھے پورا یقین تھا کہ یونیورسٹی کی پروفیسری پر میرا تقرر ہوجائے گا۔ انٹرویو بورڈ میں وائس چانسلر (پروفیسر حلیم) کے علاوہ ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر قریشی اور پروفیسر غلام مصطفٰے شاہ بھی تھے، یہ سب حضرات تاریخ کے استاد اور ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے میری شہرت سے واقف تھے، دوران انٹرویو ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر قریشی نے تاریخ سے متعلق چند سوالات کئے اور بظاہر جوابات سے مطمئن تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم انٹرویو میں نہیں آئے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ میرا تقرر نہیں ہوا۔

بورڈ کے ایک ممبر سے مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر اے بی اے حلیم نے میری سخت مخالفت کی۔ ان کے علاوہ باقی سب ممبران میری تقرری کے حق میں تھے، لیکن وہ یہی اصرار کرتے رہے کہ ڈاکٹر عبدالحلیم کا تقرر کیا جائے۔ ممبران نے ان سے یہ کہا بھی کہ وہ انٹرویو میں نہیں آئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے وطن سے پروفیسری چھوڑ کر کیوں آئیں گے، لیکن وائس چانسلر صاحب بہ ضد اس پر اصرار کرتے رہے کہ انہیں کا تقرر کیا جائے اور کوشش کر کے ان کو بلایا جائے گا۔ ابتدائی دور میں میرے لئے یہ ایک عظیم صدمہ تھا، پروفیسر حلیم میرے استاد رہ چکے تھے اور ان کی مخالفت کا میں گمان بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال دو تین روز اس کا دل پر بہت گہرا اثر رہا اور اس وقت اطمینان ہوا جب فضل الرحمٰن صاحب سے میری تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر تھے اور اس سلسلہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد جب میں ان کے پاس گیا تو پہلا سوال انہوں نے یہی دریافت کیا کہ یونیورسٹی میں تقرری کا کیا ہوا۔ میں نے مایوسانہ انداز میں کہا کہ میرا تقرر نہیں ہوا بلکہ سنا ہے کہ ڈھاکہ کے ڈاکٹر عبدالحلیم کا تقرر ہوا ہے۔ انہوں نے کہا وہ ہرگز نہیں آئیں گے وہ مجھے یہ بات بتلا گئے ہیں۔ اس کے بعد قدرے سخت لہجہ میں کہا کہ پروفیسر حلیم (وائس چانسلر) عجیب آدمی ہیں، وہ میرے پاس آئے تھے اور کہتے تھے کہ کراچی یونیورسٹی کی پروفسری پر ڈاکٹر عبدالحلیم کا تقرر کرنا چاہتے ہیں۔ فضل الرحمٰن صاحب بہت ذہین انسان تھے، کہنے لگے کہ وائس چانسلر شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ

یہ سن کر مجھے خوشی ہوگی کہ ایک اس اہم جگہہ پر وہ ایک بنگالی کا تقرر کر رہے ہیں۔ لیکن فوراً میں نے جواب دیا کہ پروفیسر صاحب، تعلیمی و تدریسی اداروں میں تقررات صرف اور صرف اہلیت (merit) کی بنیاد پر ہونے چاہیئں۔ ان میں علاقایت یا سفارش وغیرہ کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ میں بنگال سے منتخب ہوا ہوں اور بنگالیوں کے حقوق کے لئے کیبنٹ مناسب ادارہ ہے اور وہیں اس کے لئے میں کوشش کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس کے علاوہ جہاں تک ڈاکٹر عبدالحلیم کا تعلق ہے، وہ مجھے خود یہ بتلا گئے ہیں کہ میں ڈھاکہ چھوڑ کر یہاں نہیں آؤں گا۔ وہ میرا وطن ہے اور میں نے اپنا ذاتی مکان بھی بنالیا ہے' اس کے بعد انہوں نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ گھبراؤ نہیں اپنا کام (یعنی سوسائٹی کو مستحکم کرنے سے متعلق) محنت سے کئے جاؤ۔

تین چار سال کی مدت میں جن تلخ تجربات اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا اور مناسب رہائش گاہ اور حسب منشاء ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں جن تکلیف دہ مشکلات اور حالات سے گذرنا پڑا' ان کی بدولت ایک عظیم فائدہ بھی ہوا۔ یوں تو مشیت ایزدی کی قدرت میں شروع ہی سے عقیدہ تھا' لیکن عملی زندگی میں اس مختصر مدت کے دوران' ان حضرات کی عدم توجہی' جن کی امداد اور تعاون پر کامل بھروسا تھا اور افسران اور کارکنان حکومت میں سے اکثر کے غیر ہمدرد دانہ رویے نے یہ ثابت کردیا کہ دنیوی اسباب اور کوشش کے باوجود ''ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے''

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام

میرے نزدیک اور مجھ سے متعلق ابتدائی دور کا سب سے اہم واقعہ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام تھا! یہاں آنے کے بعد دستورساز اسمبلی سے منسلک ہوتے ہی مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ انڈین ہسٹری کانگریس اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کے طرز پر یہاں بھی تاریخی تحقیق و مطالعہ کی ترویج و ترقی کے لئے ایک ادارہ قائم ہونا چاہئے۔ چنانچہ متعدد موقعوں پر ایم بی احمد صاحب اور ڈاکٹر قریشی و ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے بھی اس کا ذکر کیا۔ چونکہ یہ حضرات تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے سب نے اس خیال کو پسند کیا' چنانچہ اس زمانہ کے وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تاریخی تحقیق کے لئے ایک ادارے کا قیام بے حد ضروری ہے۔ وہ بھی اس کے لئے تیار ہوگئے اور انھوں نے (کہا) کہ معین الحق سے کہو کہ کراچی میں موجود اسکالرز کا ایک جلسہ ان کے مکان پر بلالیں۔ اس جلسہ میں باقاعدہ رزولیوشن کے ذریعہ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ طے کرلیا گیا کہ اس کا دستور تیار کیا جائے اور اس وقت تک ایک اڈ ہاک کمیٹی انتظام کرے۔ اس کمیٹی کے یہ عہدہ دار مقرر ہوئے : مسٹر فضل الرحمٰن' صدر۔ پروفیسر اے بی اے حلیم' جنرل سکریٹری۔ ڈاکٹر محمود حسین' خازن۔ راقم الحروف' جوائنٹ سکریٹری' یہ ۱۹۵۰ میں منعقد ہوا تھا' اس میں یہ بھی طے ہوا کہ ۱۹۵۱ میں ایک پاکستان ہسٹری کانفرنس بلائی جائے۔ اس زمانہ میں' ایک سرکاری کوارٹر مجھے الاٹ ہوگیا تھا' اسی سے ملحق ٹین کی چادرین کھڑی

کر کے ایک دفتر قائم کرلیا' اور دستور ساز اسمبلی کے ایک کارکن مسٹر ہنگش کو جزوقتی ٹائپسٹ کی حیثیت سے منسلک کرلیا، چنانچہ دفتری اوقات کے بعد شام کو سوسائٹی کا کام ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۳ تک اسی طرح چلتا رہا۔ اس سال میں نے اپنے مکان کی پہلی منزل بنائی اور وہاں منتقل ہوا تو دفتر بھی ساتھ لے گیا۔

ہسٹری آف فریڈم مومنٹ

کراچی کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی، تعمیرات کا سلسلہ بھی تیز رفتاری سے جاری تھا' لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث رہائش گاہوں اور دفتری عمارات کی کمی بہت زیادہ تھی اور آج بھی اس شہر کے لئے یہ عظیم مسئلہ ہے' سنہ ۱۹۰۲ میں حکومت پاکستان نے فضل الرحمٰن صاحب کی تجویز اور کوشش کے نتیجہ میں تحریک آزادی میں مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں کی تاریخ پر ایک مبسوط کتاب شائع کرنے کا منصوبہ منظور کیا اور اس کے لئے ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی صدارت میں ایک بورڈ قائم کیا' جس کے صدر کے علاوہ دیگر اراکین مندرجہ ذیل حضرات تھے :

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' مسٹر ایم بی احمد' سید سلیمان ندوی، پروفیسر اے بی اے حلیم' ڈاکٹر محمد عبدالحلیم، بورڈ کو اپنے منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں مکمل اختیار تھا جس میں کل وقتی سکریٹری کا تقرر بھی تھا' اس جگہ کا مشاہرہ اور گریڈ وہی تھا جو یونیورسٹی پروفیسروں کا تھا (یعنی ۹۰۰ تا ۱۰۰۰'

ماہانہ)۔ بورڈ چونکہ فضل الرحمٰن صاحب کی (بحیثیت وزیر تعلیم) تخلیق کردہ تھا اور ذاتی طور پر ان کو اس موضوع سے گہری دلچسپی تھی' وہ اس معاملے میں مشورہ دیتے رہتے تھے۔

بورڈ نے اپنی پہلی نشست میں مجھے سکریٹری کے عہدے کے لئے منتخب کرلیا، لیکن اس کا گریڈ پروفیسر سے گھٹا کر ریڈر کا کردیا' جس کا انتہائی مشاہرہ نوسو روپیہ تھا' انٹرویو میں جب مجھ سے دریافت کیا گیا کہ اگر گریڈ پروفیسر سے گھٹا کر ریڈر کا کردیا جائے تو بھی یہ جگہ قبول کرلوں گا میرے پاس "ہاں" کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ جب میں نے یہ واقعہ فضل الرحمٰن صاحب کو سنایا تو ان کو بے حد غصہ آیا۔ میری مایوسی کو دیکھ کر حیرت ہی نہیں بلکہ صدمہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کے سلسلے میں بعض مسودات اور ورکنگ پیپرز جو میں نے تیار کئے تھے ان کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئے تھے اور ان کو یقین ہوگیا تھا کہ اہلیت کی بنیاد پر پروفیسری کے گریڈ کا مستحق ہوں۔ اتفاق سے میری موجودگی ہی میں محکمہ تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری' جناب ڈاکٹر اختر رائے پوری ان سے ملنے آئے تو انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار ان سے بھی کیا اور ان کو چاہئے تھا کہ وزارت کا نقطہ نظر بورڈ کو سمجھائیں۔ بہرحال اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس واقعہ کو اب چونتیس سال گذرچکے اور اس مدت میں ممبران بورڈ سے جو اب مرحوم ہوچکے ہیں' میرے تعلقات بہت گہرے اور خوشگوار ہوگئے تھے' لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی وجہ دریافت کرتا اور نہ آج تک میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ کس جذبے کے تحت

اور کس بنیاد پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا' تعجب کی بات یہ ہے کہ ممبران بورڈ کو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ سکریٹری کا گریڈ گھٹا کر انہوں نے بورڈ کی حیثیت (status) کم کردیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں نے خود کو اس نظریے کے پیش نظر مطمئن کرلیا کہ خدا کی مرضی یہی تھی' یہ مشاہرہ مقرر ہوجانے پر میں نے بخوشی فضل الرحمٰن صاحب سے کہہ دیا کہ سوسائٹی میں' میں بحیثیت اعزازی ڈائرکٹر آف ریسرچ کام کروں۔ جب یہ طے ہوا کہ سوسائٹی کو ایک تحقیقی سہ ماہی ریسرچ جنرل نکالنا چاہئے اور اس کا ایڈیٹر مجھے مقرر کیا گیا' تو ان کی تجویز پر اس کے لئے مجھے ڈھائی سو روپیہ ماہانہ اعزازیہ دیا گیا' کچھ عرصہ بعد یہ اعزازیہ بڑھا کر پانچ سو روپیہ ماہانہ کردیا گیا' اور آج تک یہی ہے۔

خدا کے فضل سے بورڈ اور سوسائٹی' دونوں کے کام میں ترقی ہوتی رہی اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ دفتر کے کرایہ کی عمارت کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس وقت فضل الرحمٰن صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے مکان کی بالائی منزل تعمیر کرالوں اور سوسائٹی کے لئے اسی کو کرایہ پر لے لیا جائے گا۔ میرے پاس روپیہ نہیں تھا' لیکن ان کا اصرار تھا کہ قرض لے کر ضرور دوسری منزل بنواؤں۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ خود ان کا مکان میرے مکان کے قریب تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ دفتر بالائی منزل پر ہونے سے میں لازمی طور پر دفتری اوقات کے علاوہ بھی کام کرسکوں گا۔ چنانچہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ

لیا اور کچھ اعزہ سے' اور بہ ہزار دقت اقساط میں اوپر کی منزل بنالی۔ پانچ سو پچیس روپیہ ماہانہ کرایہ مقرر ہوا۔

بورڈ پہلے چار سال کے لئے تشکیل کی گئی تھی' یہ مدت ختم ہونے پر چار سال کے لئے اس میں توسیع کردی گئی' سنہ ۱۹۶۰ میں جب یہ مدت ختم ہوئی تو ملک مارشل لا کے تحت آچکا تھا' اور سول اور فوجی افسروں کا دور دورہ تھا' فضل الرحمٰن صاحب کا اثر بہت کم ہوگیا تھا اور یوں بھی ان کو یہ سلسلہ معاش اپنی توجہ اور وقت کاروبار کی طرف مبذول کرنا ضروری تھا۔ ان وجوہ کی بناء پر سوسائٹی کی آمدنی بہت کم ہوگئی' اس میں شک نہیں کہ اس کی کچھ کتابیں شایع ہوگئی تھیں اور وہ فروخت ہوجاتی تھیں۔ خاص طور پر فریڈم موومنٹ کی پہلی دو جلدیں خاصی تعداد میں فروخت ہوتی تھیں۔ حکومت نے بورڈ کی لائبریری اور کتاب کا کاپی رائٹ سوسائٹی کو دے دیا تھا۔ لیکن علمی اور تحقیقی کتابیں بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔ ان واقعات اور بعض مسائل کا تذکرہ سوسائٹی کے ذکر میں کیا جائے گا۔ فریڈم موومنٹ کی آخری یعنی چوتھی جلد کا ایک حصہ ابھی شایع نہیں ہوسکا ہے۔ انشاءاللہ اس کو بھی شایع کیا جائے گا۔

سوسائٹی کی طرف سے شارٹ ہسٹری آف ہند پاکستان شایع ہونے کے بعد سے اس کی شہرت اور مقبولیت میں خاصہ اضافہ ہوگیا تھا' اگرچہ شروع میں یہ خیال تھا کہ کتاب ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہوگی' لیکن عملی طور پر اپنے بلند معیار کے باعث وہ زیادہ تر انٹر میڈیٹ اور بعض کالجوں میں بی اے کے طلبہ کے لئے

بھی کارآمد ثابت ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن شایع کئے گئے۔ جب ۱۹۵۷ سے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ کی جلدیں شایع ہونا شروع ہوئیں تو یونیورسٹی/سوسائٹی کی شہرت اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ پاکستانی لٹریچر میں ایک عظیم مقام رکھتی ہے۔ وہ یقیناً ایک تخلیقی شاہکار ہے اور دور جدید یعنی عالمگیر کی وفات سے قیام پاکستان تک کے دور کے لئے سب سے زیادہ مستند اور مبسوط تاریخ ہے۔ اس کے ابواب کے مصنفین ملک کے عظیم ترین مورخین ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی تحریک پاکستان سے دلچسپی پیدا کرنے میں اس کتاب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بورڈ کی سکریٹری شپ پر تقرری کے بعد میری زندگی میں استقلال پیدا ہوگیا اور تحقیقی و تصنیفی کام میں دلچسپی زیادہ بڑھ گئی۔ اب صرف ہسٹری آف فریڈم مووومنٹ ہی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ دوسرے منصوبوں پر بھی تحقیق کا کام شروع ہوگیا تھا۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی:
عہدہ‌داران کا انتخاب

۱۹۵۳ میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا دستور مکمل ہوگیا اور اسی سال پہلا انتخاب عمل میں آیا۔ اس میں فضل الرحمٰن صاحب صدر منتخب ہوئے اور میں جنرل سکریٹری، اسی سال یعنی ۱۹۵۳ سے سہ ماہی تحقیقی رسالہ (جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی) شایع ہوا، اور اس کی ادارت کے

فرائض میری سپرد کئے گئے۔ خدا کا شکر ہے اور یہ بیان کرنے میں مجھے دلی مسرت ہوتی ہے کہ اس وقت سے یہ برابر شایع ہورہا ہے اور اس کے ۱۳۲ شمارے نکل چکے ہیں ۱۹۸۶ کا پہلا شمارہ پریس میں ہے۔ اس وقت (۱۹۵۳ء سے) انتخابات پابندی کے ساتھ ہر تین سال بعد ہوتے رہے ہیں۔ مارچ سنہ ۸۰ میں بارھویں انتخابات ہوئے۔ ہر انتخابات میں ممبران سوسائٹی نے بہ اتفاق رائے مجھے جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں، اس اعتماد سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ میں نے پہلے ہی انتخاب کے بعد یہ طے کرلیا تھا کہ اب میں اپنی ساری عمر سوسائٹی کے ہی کام کے لئے وقف کردوں گا۔ شکر ہے باری تعالیٰ کا کہ میں ثابت قدم ثابت ہوا۔ میری اس خواہش اور کوشش کی توثیق اور قدر افزائی سوسائٹی کی ایکزکیوٹو کمیٹی (انتظامیہ) نے گذشتہ سال اپنی میٹنگ میں اس رزولیوشن سے کی جس کے ذریعہ جناب حکیم محمد سعید صاحب (صدر سوسائٹی تا حیات) کی تجویز پر مجھے ڈائریکٹر آف ریسرچ امریطس (یعنی تا حیات) مقرر کیا۔ اس کے لئے میں حکیم صاحب محترم اور ممبران کمیٹی کا ممنون ہوں۔ اب بھی میری یہی خواہش اور ارادہ ہے کہ سوسائٹی کی خدمت اسی طرح اس وقت تک کرتا رہوں جب تک صحت اجازت دیتی ہے۔

انتخابات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے مختلف حضرات اور معروف مورخین حصہ لیتے رہے اور ان کے تعاون سے سوسائٹی کے تحقیقی کام کی رفتار قابل اطمینان رہی، ان سب کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ مناسب ہوگا کہ چند نمایاں شخصیات کے اسمائے گرامی تحریر کردئے جائیں۔ فضل الرحمٰن

صاحب، مسٹر ایم بی احمد، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، اب مرحوم ہوچکے ہیں، سوسائٹی کے قیام اور اس کے ابتدائی مرحلوں میں ان حضرات کا نمایاں رول رہا ہے۔ میری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

١٩٦٦ کے آخر میں فضل الرحمٰن صاحب کا ایک حادثہ (موٹر ایکسیڈنٹ) میں انتقال ہوگیا، سوسائٹی کے لئے یہ بہت عظیم سانحہ تھا، ان کو اس ادارے سے بے حد دلچسپی تھی اس کے قیام اور ابتدائی سال (١٩٥٣ تا ١٩٥٦) میں جب وہ وزیر تعلیم تھے، ان ہی کے تعاون اور دلچسپی کی بدولت اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور حکومت کی طرف سے گرانٹ مقرر ہوئی۔ سنہ ١٩٥٣ میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو گورنر جنرل غلام محمد نے برطرف کردیا، اسی سلسلہ میں فضل الرحمٰن صاحب کی وزارت بھی ختم ہوگئی اس میں شک نہیں کہ وزارت سے سبکدوشی کے بعد بھی اور خاص طور پر نئی اسمبلی میں منتخب ہونے کے بعد بھی سیاسی زندگی میں ان کا اثر قائم رہا اور بعد میں وہ مسلم لیگ کی مختصر المیعاد وزارت میں وزیر بھی رہے۔ لیکن ١٩٥٨ میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی سربراہی میں مارشل لاء کے قیام کے بعد سے ان کا اثر کم ہوتا گیا۔ اگرچہ کراچی میں انہوں نے اپنا مکان تعمیر کرالیا تھا اور اپنے اعلیٰ کردار کے باعث یہاں وہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن اب ان کو یہ سلسلہ معاش اپنا کافی وقت ڈھاکہ میں صرف کرنا پڑتا تھا، جہاں انہوں نے ایک جوٹ مل لگائی تھی۔ وہیں سے وہ واپس آرہے تھے کہ وہ حادثہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ دو اور رفقاء کار ذکر ضروری ہے جو ابتداء سے سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ مرزا علی اظہر برلاس صاحب اور پروفیسر شجاع احمد زیبا رٹائرڈ پرنسپل سراج الدولہ کالج، کراچی۔ ان دونوں حضرات کا خلوص اور تعاون سوسائٹی کے لئے، خاص طور پر ایسی مشکلات میں جب بعض لوگوں نے میری مخالفت کی کوشش کی، نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے، میں نے یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ جب تک صحت اجازت دے گی میں سوسائٹی ہی کا کام کرتا رہوں گا، چنانچہ ہر انتخاب میں جنرل سکریٹری کے عہدے کے لئے کھڑا ہوتا تھا اور ممبران سوسائٹی مجھے اتفاق رائے سے منتخب کر لیتے تھے، لیکن ایک دفعہ انتخاب کے موقع پر بعض ان حضرات نے جن کو میں اپنے احباب میں شمار کرتا تھا یہ منصوبہ بنایا کہ اس عہدے سے مجھے ہٹا کر ایک دوسرے صاحب کو منتخب کریں، چنانچہ غیر معمولی تعداد میں ممبر سازی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر زیبا نے بہت کوشش کی اور کافی تعداد میں نئے ممبر بنا کر انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر انتخاب میں کامیابی نہ ہوتی تو کیا صورت حال پیدا ہوتی۔

حکیم محمد سعید صاحب و دیگر موجودہ عہدہ‌داران و اراکین انتظامیہ

انتخابات میں تبدیلیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ سب سے نمایاں تبدیلی اس وقت ہوئی جب فضل الرحمٰن صاحب کے انتقال پر

ڈاکٹر اشتیاق حسین کو صدر منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو سوسائٹی سے گہری دلچسپی تھی لیکن عملی طور پر وہ بحیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی میں اپنی مصروفیات کے باعث اس کو کچھ زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے، اس کا خود ان کو بہت زیادہ احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ سوسائٹی کی صدارت کی ذمہ داریوں کے لئے کسی اور صاحب کا انتخاب ضروری ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ میری رائے میں ہمیں جناب حکیم محمد سعید صاحب سے درخواست کرنا چاہئے۔ انھوں نے اپنی زندگی پاکستان کی اور خاص طور پر علم ادب کی خدمت کے لئے وقف کردی ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں' لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ان سے درخواست کی جائے گی تو وہ تیار ہوجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس تجویز کو بہت پسند کیا' اور مجھ سے کہا آپ کوشش کرکے ان کو راضی کرلیں' چنانچہ میں نے ان سے درخواست کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ ہم دونوں کی مشترکہ اور متفقہ تجویز ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ملک میں آپ سے زیادہ موزوں آپ کے علاوہ اور کوئی شخصیت نہیں۔ حکیم صاحب محترم نے جو مجھ پر بہت کرم فرماتے ہیں اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں اپنی مصروفیات کے پیش نظر معذرت کی' لیکن جب میں نے اصرار کیا' اور یہ بتلایا کہ کارکنان سوسائٹی اور دیگر عہدے داران کی بہ شمولیت ڈاکٹر قریشی یہ خواہش ہے کہ آپ اس اہم اور مفید ادارے کی سربراہی قبول فرمالیں تو وہ راضی ہوگئے اور ممبران نے ان کا باضابطہ انتخاب کیا۔ بعد میں

ممبران کی متفقہ تجویز پر وہ صدر تا حیات منتخب ہوگئے۔ حکیم صاحب کی صدارت میں سوسائٹی کی مشکلات جن میں فنڈز کی کمی سرفہرست تھی کم ہوگئیں' انھوں نے ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے سوسائٹی کی سالانہ گرانٹ' پچیس ہزار روپیہ مقرر کرادی۔ گذشتہ سال سے ہمیں پھر فنڈز کی کمی کے باعث پریشانی کا سامنا تھا' جس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے ہماری درخواستوں کے باوجود کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا' ہمارے تحقیقی کام اور مطبوعات پر اس کا اثر ظاہر ہوتا جارہا تھا' انتظامیہ کی میٹنگ میں ممبران کی درخواست پر حکیم صاحب نے جرنل کی طباعت و اشاعت کی مکمل ذمہ داری ہمدرد فاؤنڈیشن کے سپرد کردی۔ یقیناً فاؤنڈیشن کی طرف سے اس امداد سے ہمارے دوسرے تحقیقی و تصنیفی منصوبوں کی تکمیل میں بہت سہولت ہوجائے گی۔

سوسائٹی کے نائب صدر مسٹر ایم اے ایچ قرنی (ریٹائرڈ آئی سی ایس) ہیں بر صغیر کی تقسیم سے پہلے آئی۔سی۔ایس کے مقابلہ کے امتحان میں کامیابی کا اعزاز حاصل کیا' تخلیق پاکستان پر بہ سلسلۂ ملازمت یہاں آئے اور اب کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ موصوف میں بہت سی خوبیاں ہیں' اخلاق و کردار کے لحاظ سے یہ کہنا کافی ہے کہ ان کا رویہ میرے اور اپنے دیگر اساتذہ کے ساتھ وہی ہے جو زمانہ سلف کے شاگردوں کا اپنے اساتذہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کا شمار مخیر حضرات میں ہے' ہماری سوسائٹی کی گاہ بہ گاہ اعانت کے علاوہ، معذور بچوں کی

نگہداشت کے ادارے سے منسلک ہیں بلکہ اس کے سرگرم کارکن ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ اس کی صدر ہیں۔

ڈاکٹر انصار زاہد خان، جوائنٹ سکریٹری، فطری ذہانت اور غیر معمولی صلاحیت کے علاوہ تاریخی تحقیق و تصنیف کا شوق رکھتے ہیں۔ ان اوصاف کی شہادت اور ان کا عملی اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ کالج کی تدریس اور دیگر مصروفیات کے باوجود انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اب ان کا شمار ملک کے سربرآوردہ مورخین و محققین میں ہوتا ہے۔ سندھ کی تاریخ پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ شایع ہوچکا ہے اور اس کے علاوہ البیرونی پر حکیم سعید صاحب کے ساتھ ان کی مشترکہ تصنیف بھی شایع ہوگئی ہے۔ سوسائٹی کے تحقیقی کام کے علاوہ تنظیمی امور میں بھی وہ میرے حقیقی رفیق کار ہیں۔ بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر جنرل کی تیاری اور طباعت اور اس کے سلسلہ میں مراحلت کا بہت کچھ کام وہی انجام دیتے ہیں۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا، سوسائٹی کے خازن ہیں۔ اردو کے مشہور صحافی اور شاعر ہیں۔ ایک مدت تک انجمن ترقی اردو کے رسالہ قومی زبان کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے اور صحافت کی دنیا میں ایک مقام پیدا کرلیا، ایصار قرنی کی طرح وہ بھی میرے شاگرد رشید ہیں اور ان دونوں کی شاگردی پر ہر استاد فخر کرسکتا ہے۔

متذکرہ بالا عہدے داران کے علاوہ اکزکیوٹو (انتظامیہ) کمیٹی کے سات منتخب اور تین نامزد (co-opted) ممبران ہیں۔

ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، صدر مقتدرہ اردو (Language authority) ملک میں اردو کے عظیم اور مشہور مصنفین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ موجودہ عہدے پر فائز ہونے سے پہلے پنجاب یونیورسٹی میں ڈین اور پروفیسر تھے۔ بحیثیت مصنف و پروفیسر ڈاکٹر صاحب موصوف اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے اوصاف کی تفصیل غیر ضروری ہے، باوجود اپنی کثیر مصروفیات کے سوسائٹی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے تعاون سے ہمیں بڑی مدد ملتی ہے۔

پروفیسر شریف المجاہد، ڈائرکٹر قائداعظم اکیڈمی کراچی، موجودہ عہدہ سنبھالنے سے قبل کراچی یونیورسٹی میں شعبہ صحافت کے پروفیسر و صدر شعبہ تھے، صحافت کے علاوہ برصغیر کی تاریخ کے دور جدید کے مطالعہ اور تحقیق میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے، خاص طور پر تحریک پاکستان کے موضوع پر حال ہی میں حیات قائداعظم پر ایک مستند ضخیم کتاب شایع کی ہے، جو بابائے قوم کی جدوجہد اور کارناموں پر ایک بیش بہا خزینہ معلومات ہے۔ ایک مدت سے سوسائٹی سے منسلک ہیں۔ ان کی رفاقت اور تعاون میرے لئے ہمت و حوصلہ افزائی ایک بڑا ذریعہ رہا ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ اپنی مصروفیات کے باوجود سوسائٹی کے علمی و تحقیقی کام کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔

پروفیسر ممتاز معین (رٹائرڈ پروفیسر تاریخ و پرانسپل گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج برائے خواتین) مدراس یونیورسٹی (بھارت) سے

اسلامی تاریخ وتمدن میں ایم اے پاس کیا' پاکستان میں کراچی یونیورسٹی سے جنرل ہسٹری میں ایم اے کیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔ پچیس سال سے زیادہ تعلیم و تدریس سے منسلک رہنے کے بعد ۱۹۸۴ میں بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئیں۔ تحقیق و تصنیف سے گہری دلچسپی ہے' کانفرنسوں میں مقالات پیش کرنے کے علاوہ جو شایع ہوچکے ہیں' دو مفید اور مستند کتابوں کی مصنف ہیں۔ (۱) دی علیگڑھ موومنٹ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ (انگریزی) میں حال ہی میں روڈ ٹو پاکستان کے لئے دو باب لکھے ہیں ایک ٹیپو سلطان پر دوسرا علیگڑھ موومنٹ پر۔

پروفیسر عظیمہ' صلاح الدین' اسسٹنٹ پروفیسر' کراچی یونیورسٹی' اس سے پہلے سینٹ جوزف کالج برائے طالبات میں تاریخ کی پروفیسر تھیں۔ تحقیق و تالیف سے گہری دلچسپی ہے۔ کانفرنسوں میں مقالات پیش کئے ہیں جو شایع ہوچکے ہیں روڈ ٹو پاکستان کے لئے قائداعظم کے چودہ نکات پر مقالہ لکھا ہے۔

پروفیسر ظفر حسین' گورنمنٹ کالج برائے تعلیم کراچی میں پروفیسر ہیں' تحقیق و تصنیف سے گہری دلچسپی ہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں' جن میں سے ایک' ایجوکیشن ان پاکستان ہے۔ سوسائٹی کی اکزکیوٹیو کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اور اس کے علمی و انتظامی امور میں عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کا خلوص اور تعاون' سوسائٹی کی کارکردگی کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جناب مختار زمن' صحافتی اور علمی حلقوں کی مشہور شخصیات میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تقسیم سے قبل مسلم

اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں میں تھے اور اس موضوع پر ان کی ایک کتاب قائداعظم اکیڈمی نے شایع کی ہے۔ روڈ ٹو پاکستان کے لئے بھی اس موضوع پر مقالہ لکھا ہے۔ پاکستان میں ایجوکیشنل اینڈ پریس آف پاکستان سے ایک مدت تک منسلک رہے ہیں۔ تحریک پاکستان کی تاریخ پر تحقیقی کام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک عرصہ سے سوسائٹی سے بحیثیت ممبر اکزکیوٹیو کمیٹی منسلک ہیں اور اس کی کارکردگی میں ان کا تعاون دلچسپی نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر' ملک کے مشہور محقق و مصنف ہیں' بلوچستان کے شعبہ تعلیم پرنسپل' پروفیسر اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایک طویل مدت سے سوسائٹی کے کام میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیف لائف اینڈ ورکس آف فغانی (Life and Works of Fughani.) سوسائٹی نے ہی شایع کی ہے۔

ان سات منتخب اراکین کے علاوہ انتظامیہ کمیٹی نے تین مقتدر حضرات کو نامزد (co-opt) کیا ہے' سوسائٹی سے دلچسپی کے علاوہ ان حضرات نے علمی و تحقیقی میدان میں ملک کی بہت خدمت کی ہے:

ڈاکٹر محمد الیاس' انتہائی مخلص اور متقی بزرگ ہیں۔ منکسرالمزاج اور خاموش طبع ہونے کے باوجود جو لوگ ان سے واسطہ رکھتے ہیں ان کی عظمت اور خلوص سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ اپنی مصروفیات کے باوجود انہوں نے ہماری انتظامیہ کی رکنیت منظور فرمائی ہے۔

جناب رضوان احمد، مسلم لیگ کے کارکن ہیں۔ تقسیم سے قبل ہی وہ اپنی خدمات کے باعث شہرت حاصل کرچکے تھے، پاکستان میں ان کی خدمات اور شہرت میں مزید اضافہ ہے۔ سیاست کے علاوہ علمی اور تحقیقی کام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ حیات قائداعظم اور تحریک پاکستان پر ان کی تصانیف اور مقالہ جات، مستند مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخی دستاویزات بالخصوص قائداعظم کے خطوط بڑی تعداد میں ان کے ذاتی مجموعے میں موجود ہیں۔ ان سے متعلق ان کے متعدد مضامین اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان ہی موضوعات پر اب بھی تحقیق اور مواد جمع کرنے اور اس کو شائع کرنے میں مصروف ہیں۔ کتابیں اور تحقیقی مقالے، انگریزی اور اردو، ہر دو زبانوں میں لکھتے ہیں۔

پروفیسر مکرم علی خان، گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں میرے ایک عزیز دوست جناب ارشاد علی خان صاحب مرحوم کے بھتیجے ہیں، وہ اپنے خلوص اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ صفات کے باعث حلقہ احباب میں انتہائی محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مکرم علی خان بھی ایک مخلص انسان ہیں۔ علمی معاملات کے علاوہ اسپورٹس میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں، سوسائٹی کے ساتھ ہر معاملے میں تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کافی عرصہ سے انتظامیہ کمیٹی کے رکن ہیں۔

پینتیس (۳۰) سال (۱۹۵۶ تا ۱۹۸۶) کی مدت میں جو کتابیں اور مقالے شائع کئے اور ان کے علاوہ تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے دوسرے اقدامات کئے (مثلاً ہسٹری کانفرنسیں منعقد

کیں) ان کا ایک خاکہ اس مقالے میں موجود ہے جو میں نے اسلام آباد ہسٹری کانفرنس منعقدہ میں پیش کیا تھا، یہ مقالہ کتاب کی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ مطبوعات کی فہرست بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس وقت تک انگریزی، اردو اور فارسی میں پچھتر (۷۵) کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جرنل کی چونتیسویں جلد شائع ہو رہی ہے، یعنی ۱۳۲ شمارے شائع ہوچکے ہیں۔ فی الحال ہم شاراہ پاکستان کی پہلی جلد شائع کرنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ یہ جلد تاریخی پس منظر پر ہے اور اس میں بیس باب ہوں گے۔ یہ مسلمانان برصغیر کی تاریخ (۱۷۱۱ء تا ۱۸۰۷ء) پر مشتمل ہوگی، دوسری جلد، ۱۸۰۸ سے ۱۹۴۷ تک کے عہد کی تاریخ ہوگی۔

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تحقیق و مطالعہ، تاریخ کے سلسلہ میں، مورخین و مصنفین سے قوم کو کیا امیدیں وابستہ تھیں اور کس حد تک وہ پوری ہوئیں۔ اس کا ایک جائزہ لیا جائے برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں مصنفین و اساتذہ تاریخ میں اکثر جو غیر مسلم تھے، یہاں سے بھارت چلے گئے اور وہاں سے چند مسلم اساتذہ یہاں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے قبل بھی ان مورخین اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کی تعداد، جو اپنی تالیفات اور تحقیقی کام کی بدولت شہرت حاصل کرچکے تھے بہت کم تھی۔ ان کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا تھا، ان میں سے بھی پروفیسر حبیب اور شیخ عبدالرشید علیگڈھ ہی میں رہے، پروفیسر ہارون خان شیروانی، حیدرآباد دکن میں اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ میں رہے۔ اسی

طرح ڈاکٹر مہدی حسین اور ڈاکٹر محب الحسن خان بھارت ہی میں رہے۔ علیگڈھ سے ترک وطن کر کے آنے والوں میں راقم الحرف اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صدیقی مرحوم تھے۔ آخرالذکر اور پروفیسر اے بی اے حلیم تقسیم سے قبل ہی آ گئے تھے۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے' اور ڈاکٹر عبدالحلیم مرحوم جو تقسیم کے وقت علیگڈھ میں یونیورسٹی میں پروفیسر تھے' کچھ عرصہ بعد وہاں سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر آ گئے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے' یہاں صرف ڈاکٹر داؤد پوتہ ایک پروفیسر تھے' جو ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ تھے جو اب ملک کے عظیم محققین و مورخین میں شمار کئے جاتے ہیں اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی جنہوں نے آثار قدیمہ میں اپنی تحقیق و تصنیفات کے باعث شہرت حاصل کی ہے' اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھے' ڈاکٹر رضی واسطی آف لاہور جو اب بحیثیت محقق و مصنف شہرت حاصل کر چکے ہیں اس وقت جوان العمر پروفیسر تھے' پروفیسر شریف المجاہد کا ذکر جو کہ ترک وطن کر کے آئے ہیں اور اپنی تخلیقی و تحقیقی تصنیفات کے باعث بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں' پہلے کیا جا چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض حضرات نے تاریخی تحقیقات کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہاں ان تحقیقات کا تفصیلی یا مختصر الفاظ میں ذکر ممکن نہیں۔ لیکن جہاں تک پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا تعلق' اسکی مطبوعات میں سے اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ کا چند الفاظ میں ذکر ضروری ہے'

تخلیق پاکستان کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ صرف یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ ہی کو نہیں بلکہ ان سب لوگوں کو جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سے تاریخی عوامل اور محرکات تھے اور ہمارے آباء و اجداد کی کوششیں اور قربانیاں تھیں جن کے باعث مغلیہ سلطنت کے زوال سے پیدا ہونے والی زبوں حالی سے مسلمانوں نے خود کو بچایا اور بالآخر ڈھائی سوسال کی جد وجہد کے بعد دوسرے ہموطنوں کی رفاقت میں ایک بیرونی قوم کی حکمرانی سے آزادی حاصل کی بلکہ برصغیر کے ان خطوں پر مشتمل ایک خود مختار مملکت کی شکل میں اپنے لئے نیا وطن حاصل کیا۔ تخلیق پاکستان اور دنیا کے نقشہ پر اس کا نمودار ہونا' تاریخ کا ایک عظیم معجزہ ہے۔ اس کے مطالبہ کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا' جس کا مطلب یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد وطن یا زبان نہیں بلکہ دین ہے' یہ تصور قومیت کے مغربی تصور سے بالکل مختلف ہے۔

صرف حکومت برطانیہ کے ارباب اقتدار ہی نہیں بلکہ عام طور پر مغربی مفکرین و مدبرین' اس تصور کی حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے' لیکن قائداعظم کی سربراہی میں مسلمانان برصغیر نے جس جوش و خروش اور خلوص و استقلال کے ساتھ تحریک پاکستان کو چلایا' بالآخر لوگوں کو اسے تسلیم کرنا ہی پڑا۔ اس کی قوت اور پختگی کو تسلیم کرلیا گیا' لیکن پاکستان کے قیام کے بعد یہ ضروری تھا کہ اس تصور کی حقیقت و ماہیت کو منطقی اور تاریخی دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی طرف سے دو قومی نظریئے اسلامک آئیڈیالوجی

کی اہمیت پر زور تو دیا جارہا تھا' لیکن نہ انہوں نے اور نہ ہی دانشوروں نے تاریخی شواہد اور نظریاتی دلائل کی روشنی میں ان تصورات کو وسیع پیمانے پر پیش کرنے کی اس انداز سے کوشش کی کہ اس کی حقیقت قوم کے افراد اور خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں پختگی کے ساتھ جاں گزیں ہوجاتی۔ اس کمی کو بڑی حد تک ہسٹری آف فریڈم موومنٹ کی جلدوں نے پورا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک بلند پایہ معیاری تحقیقی کتاب میں پیش کئے گئے مواد اور اندراجات کی اپیل یونیورسٹیوں کے طلبہ اور تاریخی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں ہی تک محدود رہ سکتی تھی' بہرحال اس کے ذریعہ سے بہت سی شخصیات اور اکثر واقعات جن سے لوگ زیادہ واقف نہ تھے' علمی حلقوں میں دلچسپی کا مرکز بن گئے۔ بیرون ملک بھی' امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک کی یونیورسٹیوں میں پروفیسروں اور طلبہ نے اس سے فائدہ اٹھایا' ان میں سے چند فضلاء نے سوسائٹی کو اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اس کا نیا ایڈیشن شایع ہونا چاہئے۔ اور ہماری خود بھی یہ خواہش رہی ہے کہ اس کا نیا ایڈیشن کیا جائے' لیکن اس کے لئے فنڈز درکار ہیں جو دستیاب نہیں ہوپاتے۔

ایک اور موضوع جس کی طرف ہمارے علمی اداروں اور انفرادی سطح پر مورخین و محققین نے بہت کم توجہ دی برصغیر میں قرون وسطیٰ کی یا بہ الفاظ دیگر جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ چند کتابیں ضرور شایع ہوئیں' لیکن یہ تعداد تقریباً نہ ہونے کی برابر ہے۔ دہلی سلطنت' علاقائی خود مختار اور نیم خود مختار ریاستیں اور سب سے بعد میں لیکن سب سے بلند سطح پر مغلیہ حکومت' قرون وسطیٰ کی تاریخ کے اہم ترین ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عہد جدید میں ان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر خاص تعداد میں کتابیں لکھی گئیں لیکن اس کوشش میں خود مسلم مورخین کا حصہ بہت کم ہے۔ اور آج بھی ہمارے اساتذہ کا زیادہ تر انحصار بیرونی ممالک کے مصنفین کی تالیفات پر ہے' اور ان ہی کے پیش کردہ نظریات اور اندراجات کی اشاعت و تحفظ کر رہے ہیں۔ تخلیق پاکستان کے بعد جلد ہی یہاں کے مورخین و محققین کو اس کام کی اہمیت کا اندازہ لگالینا چاہئے تھا اور اس کی طرف متفقہ طور پر کوشش کرنا تھی۔ اس عظیم مہم کی تکمیل کے لئے عملی اقدام کی بہترین شکل یہ ہوسکتی تھی کہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے ساتھ وسیع پیمانہ پر علمی و مالی تعاون کیا جاتا اور ہمارے نوجوان اساتذہ اور محققین کو اس کے منصوبوں میں شریک کرکے ان کو ضروری تربیت دی جاتی اور ان میں ریسرچ کا ذوق پیدا کیا جاتا۔ لیکن افسوس ہے ہم یہ نہ کرسکے۔ محدود وسائل اور محدود تعاون کے باعث سوسائٹی کا دائرہ کار بھی محدود رہا اور تا حال محدود ہے۔ سینئر مورخین اور اساتذہ تاریخ' نیز ارباب حکومت کی اس کوتاہی کے نتائج اب نظر آنے لگے ہیں' رفتہ رفتہ برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور اقتدار اور تمدنی و ثقافتی کارناموں کی تاریخ سے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کی دلچسپی تیزی کے ساتھ کم ہورہی ہے' اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اس دور سے متعلق موضوعات پر تحقیقی

کام بہت کم ہوا ہے، اور اب بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں۔ نصاب میں بھی مختلف سطحوں پر اس کی اہمیت برابر کم ہورہی ہے۔ اگر ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ تاریخ اور شعبہائے تاریخ کے سربراہان اور ان مورخین و محققین نے جو تحقیقی و علمی اداروں سے منسلک ہیں یا بطور خود تاریخی موضوعات پر کام کر رہے ہیں جلد اس مسئلہ پر توجہ نہ دی تو ایسے حالات رونما ہونے لگیں گے جن میں مسلمانان برصغیر کی تاریخ کے یہ شاندار ابواب اور ان کے مایہ ناز تہذیبی و تمدنی کارنامے تاریخ کے صفحات سے غائب ہوجائیں گے۔ آج تو ہم بعض ہندو مورخوں کے ان دعوؤں کو کہ تاج محل (آگرہ) اور قطب مینار دہلی، مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی تعمیر کردہ یادگاریں ہیں، لغو بیانی پر مبنی تحریرات کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس دور میں جب مسلمانوں کی تاریخ ہمارے سامنے صرف مسخ شدہ شکل میں پیش کی جائے گی، اس قسم کی لغو بیانیوں کو مسلمانوں کا تعلیمیافتہ طبقہ بھی حقیقت اور صحیح تاریخی واقعات سمجھنے لگے گا۔ ان ہی خطرات کے پیش نظر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے تخلیق پاکستان کے چند سال بعد ہی، اے شارٹ ہسٹری آف ہند پاکستان کے نام سے ایک کتاب شایع کی۔ اس کا معیار جان کر ایسا رکھا گیا تھا کہ ہائی اسکولز اور کالجوں کے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہو، لیکن سنہ ۸۰۵ میں مارشل لا کے قیام کے بعد سے لوگوں میں جذبہ حب الوطنی کمزور ہونے لگا اور اس کے نتیجہ میں اس انداز پر تصنیف مثلاً کتابوں کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی۔ بہرحال تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق کو معاشرے کے استحکام کے لئے لازمی اور ضروری سمجھتے ہوئے،

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اب بھی اپنا یہ فرض سمجھتی ہے کہ اسلام کی تاریخ و تمدن پر بنیادی اہمیت کے ادب میں برابر اضافہ ہوتا رہنا چاہئے۔ چنانچہ اب بھی اس سلسلے میں سوسائٹی کے دو منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ (۱) تحریک پاکستان کی مبسوط تاریخ بہ عنوان شاہراہ پاکستان، (۲) جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی حکمرانی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ معاشرے کے بنیادی استحکام کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

سوسائٹی کا کتب خانہ

اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے نتیجہ میں جن علاقوں پر مشتمل ہمارا قومی وطن یعنی پاکستان قائم ہوا، ان میں کتب خانے بہت کم تھے، لاہور اور ڈھاکہ میں یونیورسٹی لائبریریاں تھیں۔ ان کے علاوہ لاہور کی پبلک لائبریری اور اسلامیہ کالج کی پیشاور کی لائیبریریاں بھی قابل ذکر ہیں۔ تخلیق پاکستان کے مختلف شہروں میں متعدد کتب خانے وجود میں آئے ہیں، حالات کے پیش نظر، ان میں کتابوں کی تعداد بھی محدود ہے اور جن موضوعات پر کتابیں جمع کی گئی ہیں وہ بھی محدود ہیں۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے بھی تحقیقی اور تصنیفی ضروریات کے پیش نظر ایک خصوصی کتب خانہ قائم کیا جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ کتابوں کی تعداد تو زیادہ نہ ہوسکی کیونکہ اس کے مالی وسائل بہت محدود رہے۔ لیکن اس لحاظ سے اس کی اہمیت قابل ذکر ہے کہ اسی میں بعض مخطوطات و مطبوعات محققین کے لئے بہت ضروری اور مفید ہیں۔ ان میں سے

تین چار مخطوطوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے:

(۱) بحرالاسرار مؤلفہ محمود بن امیرولی بلخی - چھ جلدوں پر مشتمل عظیم تصنیف جو اپنی ضخامت کے باعث دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے اب تقریباً مفقود ہے - چھ میں سے صرف ایک جلد کا مخطوطہ تاشقند لائبریری میں محفوظ ہے - پروفیسر عبدالغفور وو اس کی ایک فوٹو کاپی سوسائٹی کو ہدیتہ پیش کرنے کے لئے اس وقت لائے تھے جب انہوں نے ہماری کانفرنس میں روس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شرکت کی - اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ترکی کے مشہور محقق پروفیسر ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان مرحوم دو مرتبہ کراچی بقول خود اس غرض سے تشریف لائے کہ اس مخطوطے کا مطالعہ کریں - سوسائٹی نے اس کی پہلی جلد کا ایک حصہ شایع کردیا ہے -

(۲) سرورالصدور - ملفوظات حضرت سلطان التارکین شیخ حمیدالدین ناگوری اس کے صرف چند نسخے دستیاب ہیں -

(۳) ذخیرۃ الخوانین مؤلفہ شیخ فرید بھکری - اس کے علاوہ صرف ایک اور مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی لائبریری میں شیروانی کلکشن میں موجود ہے - اس کو بھی سوسائٹی نے تین جلدوں میں شایع کردیا ہے - مرجان ایلیٹ نے لکھا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے اس کو اس کا کوئی نسخہ نہ مل سکا -

(۴) ڈائری - سید مبارک کوتوال دہلی بہ زمانہ انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء - سوسائٹی کے کتب خانے سے متعدد محققین نے فائدہ اٹھایا ہے ان میں ان مصنفین کے علاوہ وہ جنہوں نے سوسائٹی کے منصوبوں پر کام کیا ہے، بعض وہ لوگ بھی ہیں جو بطور خود مختلف موضوعات پر کام کرتے رہے ہیں -

چند سال سے اس کتب خانے کو ہمدرد سینٹر میں منتقل کردیا گیا، جہاں ہمدرد لائبریری سے ملحق ایک وسیع ہال میں حکیم محمد سعید صاحب نے محققین کے لئے مطالعہ کا معقول انتظام فرما دیا ہے - جلد ہی یہ دونوں کتب خانے، مدینتہ الحکمت میں ایک عظیم الشان عمارت میں مستقلاً منتقل کردئے جائیں گے - مدینتہ الحکمت حقیقت میں ایک شہر علم و حکمت ہوگا اور مکمل ہونے پر وہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جس کی بدولت اس کے بانی حکیم محمد سعید صاحب کا نام تاریخ کے صفحات میں دائم و قایم رہے گا - حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم الشان منصوبے کی تشکیل و تکمیل کے لئے حکیم صاحب نے اپنی زندگی وقف کردی ہے - اس سلسلے میں ان کی ہمت، خلوص اور جانفشانی کو دیکھ کر دل سے دعاء نکلتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ" ان کی صحت کو قائم رکھے اور ان کو طویل عمر عطا فرمائے -

مہاجرین

دور جدید کی تاریخ میں پاکستان کا قیام ایک عظیم اور بعض حیثیتوں سے معجزانہ انقلاب تھا، اس کے نتیجے میں جن اہم مسائل کے رونما ہونے کا امکان بلکہ یقین تھا ان میں سے ایک

آبادیوں کی منتقلی تھی۔ لیکن اس کا شاید کسی کو بھی تصور نہ تھا کہ یہ اتنے وسیع پیمانے پر ہوگی اور اس کے نتیجے مین خون کی ندیاں بہیں گی اور قتل و غارت کا بازار مہینوں گرم رہے گا۔ تاریخ کا طالب علم اس المیہ کے اسباب ان واقعات مین تلاش کرے گا جو کہ مسلمانوں کی جدو جہد پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دور کے اخبارات اور بعد مین شایع ہونے والی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں' لیکن بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر اس کی ذمہ داری متعلقہ ارباب اقتدار پر ہے جن میں نمایاں طور پر قابل ذکر برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی' ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن اور بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو اور نایب وزیر پٹیل ہیں۔ ان میں قدر مشترک ان کی اسلام دشمنی تھی' جس کے باعث سیاسی تجربہ رکھنے کے باوجود وہ مسلمانوں کے مطالبات بالخصوص ایک خود مختار اور علیحدہ وطن کے مطالبہ کی اہمیت اور اس سلسلہ میں ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ لگانے سے آخری وقت تک قاصر رہے' اگرچہ مجبوراً ان کو مطالبہء پاکستان منظور کرنا پڑا' لیکن انہوں نے تقسیم کے ساتھ ایسے حالات پیدا کرے اور ان کی حوصلہ افزائی کی کہ خونریزی اور قتل و غارت کا وسیع پیمانہ پر بازار گرم ہوا' اور بہت بڑی تعداد میں اقلیتوں کے لاکھوں خاندان ترک وطن پر مجبور ہوئے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ بہت کثیر تعداد میں غیر منقسم پنجاب کے مشرقی اضلاع اور دہلی سے آئے۔ کافی تعداد میں یو-پی- اور دوآب کے اضلاع سے بھی آئے۔ بہار سے بڑی تعداد

میں بنگال کی طرف گئے' ان کے علاوہ چیدہ چیدہ خاندان بھارت کے سب علاقوں سے آئے۔ اس طرح مہاجرین کی تعداد پاکستان میں بہت زیادہ ہوگئی۔ ابتدائی دور میں یہاں کے مقامی باشندوں اور حکومتوں نے ان کو خوش آمدید کہا اور ان کے قیام وغیرہ کے سلسلے میں سہولیتیں بہم پہنچائیں۔

———:o:———

چند ماہ بعد وہ سبزوار واپس چلے گئے اور اگلے سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے' حج کی سعادت سے مشرف ہوکر مدینہ کا رخ کیا' حضور سرور کائنات ؐ خلاصہ موجودات' رحمت اللعالمین' شفیع المذنبین' امام المرسلین کے روضہ اطہر پر بصد عجز و انکسار معتکف ہوئے اور ذیل کے شعر کا عملی مترقع بن گئے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ بستہ می آید جنید رح و شبلی رح ہابزید رح ایں جا

مدینہ منورہ میں ایک شب وصول مقبول ؐ کی عالم رویاء میں زیارت بھی نصیب ہوئی' سبحان اللہ' وطن واپس آتے ہوئے بغداد شریف میں صحابہ اور متعدد صالحین کے مزارات پر بھی حاضری دی اور روحانی فیوضات سے مستفیض ہوئے۔

عہد شاہجہانی (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۷ء) ہندوستان کا ایک زریں دور تھا جس میں ملک ہر لحاظ سے بام عروج پر تھا۔ سبزوار واپس آکر شاہ ابراھیم رح نے کچھ عرصہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ گذارا اور امور خانہ داری کی اصلاح میں منہمک ہوگئے' ان فرائیض کی تکمیل کے بعد وہ دوبارہ مستقل طور سے ہندوستان کی طرف مراجعت کے قصد سے سوات تشریف لے گئے اور آخرکار پشاور میں ورود کیا۔

اس مرتبہ شاہ محمد ابراھیم صاحب رح نے اپنے وقت کے ایک مشہور عالم و درویش حضرت شیخ ملا اخوند درویزہ رح کی مہمانی قبول فرمائی' ملا اخوند درویزہ رح حضرت محمد صادق گنگوہی رح کے بھتیجے حضرت ابو سعید ترمزی رح کے مرید و خلیفہ تھے' ملا

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمان الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

خانوادہ ابراھیمی اور محترم معین بھائی صاحب (مرحوم)

ہم لوگوں کے مورث اعلیٰ اور خانوادۂ ابراھیمی کے سرخیل سیدالسادات' سراج السالکین' حضرت شاہ محمد ابراھیم قدس اللہ سرالعزیز کا تعلق سبزوار کے ایک خوشحال اور علم دوست گھرانے سے تھا۔ آنکے اسلاف چند پشت پہلے مدینہ منورہ سے نقل مکانی کرکے سبزوار میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نووارد مدنی قبیلہ کو بیکراں انعام و اکرام سے نوازا۔ عالم طفولیت ہی میں شاہ ابراھیم رح نے قران شریف حفظ کرلیا۔ ازاں بعد فارسی اور علوم دینی کی متداول کتب کی تعلیم اپنے والد گرامی حضرت شاہ سید علی رحمتہ اللہ علیہ سے جو ایک جید عالم اور فقیہہ تھے حاصل کی اور خاندانی املاک خصوصاً باغات کے انتظامات میں ان کی اعانت بھی کرتے تھے۔ حضرت شاہ ابراھیم رح صاحب کو سیروسیاحت سے بھی شغف تھا چنانچہ وہ ایک مرتبہ سوات کے راستہ سے پشاور تشریف لائے۔ اس سفر کے دوران کچھ عرصہ سوات کے شہر اسلام نگر میں بھی ٹھہرے' پشاور میں اکثر علماء اور مشائخ سے بھی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال ہوتا رہا لیکن

اخوند درویزہ رح کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے سرحدی علاقہ کے ایک مفسد اور گمراہ شخص بایزید "پیر روشن ضمیر" کی غلط اور غیر اسلامی تعلیمات پر مبنی "روشنیہ تحریک" کے خلاف برملا اور عظیم جہاد کیا اور اس کا مکمل طور سے قلع قمع کردیا - ملا اخوند درویزہ رح کی اس مہم میں شاہ ابراہیم صاحب نے بھی حتی الوسع اعانت کی ' اس ہی اثناء میں حضرت آدم بنوری رح جو حضرت مجدد الف ثانی رح کے پوتے حضرت شاہ معصوم رح کے خلیفہ تھے ملا اخوند درویزہ رح کی خانقاہ میں مقیم ہوئے اور یہاں شاہ سید محمد ابراہیم صاحب رح سے ان کی ملاقات ہوئی' دونوں بزرگ ایکدوسرے کے بہت گرویدہ ہوگئے - شاہ ابراہیم صاحب نے ملا اخوند درویزہ رح اور حضرت آدم بنوری رح دونوں بزرگوں سے اکتساب کیا - دریں اثناء شاہ ابراہیم صاحب رح کو خواب میں حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی رح کی زیارت ہوئی جنہوں نے عالم رویاء میں ان کو گنگوہ تشریف لانے کی دعوت دی چنانچہ ملا اخوند درویزہ رح کے وصال کے بعد شاہ ابراہیم صاحب رح اوالذکر کے صاحبزادے کے اصرار کے باوجود گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں اپنے قیام کے زمانہ میں ہمہ تن عبادت' ریاضت و مجاہدے میں مشغول رہے - بالاخر وہ بندگی حضرت محمد صادق رح سے بیعت ہوگئے اور ان کی تعلیمات سے پورا فائدہ اٹھایا حتی کہ شیخ محمد صادق رح نے ان کو خلافت سے ممتاز فرمایا - اپنے مرشد کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد داؤد سے رخصت کی اجازت مانگی - حضرت شیخ محمد داؤد رح نے بادل نا خواستہ شاہ ابراہیم صاحب کو رخصت فرمایا -

گنگوہ شریف کے قیام کے زمانہ میں حضرت شاہ ابراہیم صاحب رح نے خواب میں اس مقام کا محل وقوع ملاحظہ کیا تھا جہاں انھیں گنگوہ سے ہجرت کر کے جانا تھا اور اس خطہ کے ماحول کی تفصیلات بھی نظر سے گذری تھیں لہذا بہ منشائے الٰہی وہ سنبھل سے تقریباً سولہ میل مغرب کی جانب دریائے رام گنگا کے کنارے ایک باغ مسمیٰ "لعل باغ" میں جو اس جگہ واقع تھا (اور اب بھی ہے) جہاں پر شاہ جہاں کے منصبدار اور سردار اعلیٰ رستم خان دکنی نے قلعہ تعمیر کرایا تھا' مقیم ہوگئے - یہ علاقہ اس وقت "چوپالا" کہلاتا تھا اور چار بستیوں پر مشتمل تھا جو بہداور' سان پور' دیندار پورہ اور دھری کے ناموں سے معروف تھیں - لعل باغ کی عمارت دریائے رام گنگا پر اس قلعہ کی فصیل سے متصل واقع ہے جس میں رستم خان بہ مع خاندان فروکش تھا - اس کے محل میں ہر ماہ کی نوچندی جمعرات کو محفل میلاد شریف لعل باغ کی سمت کے میدان میں منعقد ہوتی تھی' ایک مرتبہ حضرت شاہ محمد ابراہیم رح عشاء کا وضو دریائے رام گنگا کے رواں پانی سے کر رہے تھے کہ میلاد شریف کی آواز سنائی دی اس وقت نعت شریف کی ایک فارسی غزل پڑھی جارہی تھی' اس غزل کو سن کر ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور محویت و وارفتگی کی حالت میں وہ دریا میں گرگئے مگر بہ استعانت الٰہی معجزانہ طور پر غرق ہونے سے بچ گئے اور وضوء مکمل کر کے اپنے مصلے پر جاکر نماز و عبادت میں مصروف ہوگئے -

اس دوران میں رستم خان کو شاہ ابراہیم صاحب رح کی موجودگی کی اطلاع ملی اور وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا -

شاہ ابراھیم صاحب رح سے اپنی ھی ملاقات میں وہ ان کی گفتگو اور پیچیدہ مسائل کی تصریح سے بیحد متاثر ھوا اور ان کا عقیدت کیش ھو گیا - دریا میں گرنے کے حادثے کے بعد سے شاہ ابراھیم صاحب رح نے کسی دوسری جگہ منتقل ھوجانےکا ارادہ کرلیا تھا - رستم خان نے ان سے قلعہ میں سکونت پذیر ھوجانے کی پیش کش کی لیکن انھوں نے اس کو مسترد کردیا اور وھاں سے تقریباً دو میل جنوب کی جانب ایک پر سکون مقام پر املی کے ایک درخت کے نیچے فروکش ھو گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی - جس جگہ شاہ ابراھیم صاحب رھنے لگے تھے وھاں آبادی بڑھتی چلی گئی - کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنے اھل و عیال کو سبزوار سے وھاں بلالیا اور اس ھی نواح میں سب نے بود باش کرلی اور یہ جگہ ایک مدت بعد شہر بس جانے پر محلہ پیرزادگان کے نام سے منسوب ھوگئی اور عرصہ دراز تک خانوادۂ ابراھیمی کی رھائش گاہ رھی' وقت گذرنے کے ساتھ رستم خان کی شاہ ابراھیم صاحب رح سے عقیدت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور وہ ھر مشکل اور مہم کے لئے ان سے رجوع کرتا تھا اور ھر موقع پر دعا کا طلبگار ھوتا تھا - اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے شاہ ابراھیم صاحب رح کو مجیب الدعوات کردیا تھا اور ان کی دعائیں درگاہ الٰہی میں اکثر و بیشتر درجہ قبولیت حاصل کرتی تھیں اس عنایت کردگار کی وجہ سے رستم خان شاہ ابراھیم صاحب رح کی خوشنودی میں بہت سرگرم عمل رھنے لگا۔

- اس نے حضرت شاہ ابراھیم کی رائے پر عمل کرتے ھوئے چوپالا کی چار بستیوں کو ملا کر ایک شہر کی داغ بیل ڈالی - یہ علاقہ بڑا

زرخیز اور شاداب تھا - اس کے گردونواح میں ایک بڑا دریا رام گنگا موجودہ رامپور کی سمت میں اور دو متوسط دریا کانگن اور کرولا سنبھل کی سمت میں بہتے ھیں - ایک اور برساتی دریا ڈھیلا رام گنگا میں مرادآباد کے موجودہ شہر کے قریب ھی شامل ھوتا ھے - مختصراً یہ کہ شہر بسانے کا فیصلہ کر کے رستم خان شاھجہاں کی خدمت میں حاضر ھوا اور ساری تفصیل بتائی - شہنشاہ کے استفسار پر رستم خان نے بتایا کہ وہ جہاں پناہ کی اجازت سے شہر کا نام شہزادہ مراد کے اسم گرامی پر منسوب کر کے مرادآباد رکھنا چاھتا ھے - شاھجہاں نے رستم خان کی درخواست پر اس نام کو قبول کرلیا - اسطرح مرادآباد کا شہر معرض وجود میں آیا - یہاں اوسطاً سالانہ ۴۷ انچ بارش ھوتی ھے اور جب مطلع صاف ھو تو بلند مقامات سے نینی تال کا پہاڑی سلسلہ بہ جانب شمال دکھائی دیتا ھے - یہ بڑا خوش نما منظر ھوتا ھے بالخصوص موسم برسات میں مرادآباد کا حدود اربعہ یہ ھے - شمال میں ضلع نینی تال' جنوب کی حد پر ضلع میرٹھ' مشرق کی حد پر دریائے رام گنگا' رامپور اور بریلی اور مغرب کی سمت میں ضلع بجنور واقع ھیں -

رستم خان نے شاہ ابراھیم صاحب کے حکم کی تعمیل میں مرادآباد کی وسیع اور شاندار جامع مسجد لب دریا ایک بلند مقام پر تعمیر کرائی یہ اس بلند وقوع کی وجہ سے مرادآباد بریلی شاہراہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے سے نظر آنے لگتی ھے - اس مسجد کی بلند پیشانی کے وسط میں "اللہ جل جلالہ" کے پاکیزہ الفاظ نگاہ میں آرپار منور دکھائی دیتے ھیں اور دور سے بیحد جاذب نظر محسوس ھوتے ھیں -

رستم خانی قلعہ کے شمالی کونے پر یعنی لعل باغ سے متصل اور فصیل سے ملحق ایک بڑا گول کنواں باولی کے طرز پر بنا ہوا ہے۔ اس باولی نما کنویں میں سطح زمین یا مینڈہ سے تقریباً دس فٹ نیچے دو دروازے ہیں ان میں سے ایک دریا کی طرف اور دیگر شہر کی آبادی کی جانب ہے۔ ان دونوں دروازوں کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں لیکن قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دوران جنگ قلعہ پر دشمن کی یورش کی صورت میں ایک دروازے سے دریائی راستہ سے اور دوسرے سے بذریعہ سواری راہ فرار اختیار کی جاسکے۔ ایسی تدابیر اس زمانہ میں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی تھیں۔

شاہجہاں کے دربار میں جب رستم خان مرادآباد کے شہر کے نام کی منظوری کے لئے حاضر ہوا تھا تو اسنے شاہ ابراھیم صاحب کے صفات و مناقب اور اعلیٰ روحانی مراتب کا بھی ذکر کیا تھا جن سے متاثر ہوکر شہنشاہ نے بذریعہ فرمان شاہی دو گاؤں اور ایک بڑاہ قطعہ زمین محلہ پیرزادگان میں اور شہری املاک شاہ ابراھیم صاحب کی اولاد امجاد اور ان کی خانقاہ کے لئے وقف کردیں تھیں۔ یہ تا حال ان کے ورثاء اور زاویہ کے تصرف میں رھیں۔

مرادآباد شہر میں جو قطعہ زمین شاہجہاں نے نذر کیا تھا بعد وصال[1] حضرت شاہ ابراھیم اس ھی میں سپرد خاک کئے گئے اور رستم خان نے ازراہ عقیدت ان کے مزار پر مغلیہ طرز تعمیر کا بہت شاندار روضہ تعمیر کرایا۔ اس روضہ کی کرسی تقریباً تین فٹ اونچی ہے اور اس پر مزار کے اردگرد غلام گردش ہے اور ایک وسیع

احاطہ کے چاروں طرف تقریباً چھ فٹ اونچی دیوار ہے۔ مزار مبارک کے درو دیوار، فرش، چھت، اندرونی گنبد اور جالیوں پر کوڑی کے مصالحہ کا پلاسٹر ہے جو ایسا چکنا اور دیدہ زیب ہے کہ انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اسکا کچھ اندازہ ضمیمہ کی تصویر سے جو مزار شریف کے سامنے کے رخ سے متعلق ہے ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید معین الحق مرحوم کے اجداد اور ہمارے خاندان کے دیگر بزرگوں کی قبور بھی اس درگاہ کے صحن میں ہوں درمیان کی قبر ہم لوگوں کے پر دادا "زینت گلشن نون والصاد" ملقب بہ محب اللہ حضرت سیدنا شاہ عبدالحق قدس اللہ سرہ العزیز کی ہے۔ ان کے بائیں طرف "نازش عارفاں" قبلہ والد ماجد سیدنا و مولانا شاہ مجیب الحق رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور دائیں طرف ہمارے بڑے "تایا متوکل باللہ" حضرت سیدنا شاہ شمس الحق رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ روضہ اطہر کے جنوب میں سماع کے لئے ایک وسیع میدان مخصوص کردیا گیا ہے اور یہاں ہر سال بہت ادب و احترام سے سید حضرت شاہ ابراھیم صاحب رح کا عرس منعقد ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ معین بھائی صاحب مرحوم پر ہمارے جدامجد "سلطان الاصفیا" سیدنا شاہ ظہورالحق قدس اللہ سرہ العزیز کے مجاھدات، رشد و ھدایات اور تعلیمات کا بڑا گہرا اور مستقل اثر تھا اور ان کی حیات طیبہ گویا مشعل راہ تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قبلہ دادا صاحب کو جو عالم طفولیت ھی سے پابند صوم و صلواۃ تھے اور عہد شباب میں بھی قائم اللیل اور صائم الدھر تھے عالم رویا میں شہنشاہ

ولایت سرہول قلندراں حضرت شاہ شرف الدین بو علی شاہ قلندر قدس اللہ سرہ العزیز کی زیارت ہوئی اور انہوں نے قبلہ دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ "تمہارا حصہ ہمارے یہاں ہے لہذا کرنال حاضر ہوجاؤ" یہ ارشاد خواب میں تین مرتبہ ہونے پر وہ مستقلاً ہجرت کر کے بو علی شاہ قلندرؒ کے مزار پر حاضر ہوگئے اور بقیہ عمر کے بتیس سال کرنال، کنجپورہ اور بڈھے کھیڑے میں جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہے اور جہاں حضرت بو علی شاہ قلندرؒ زیادہ تر عبادت و اعتکاف کیا کرتے تھے گذاردی۔ اور اس کی قطعی پروا نہیں کی کہ ان کی غیر موجودگی میں معافی کے گاؤں اور دیگر املاک کی خاطرخواہ نگرانی یا انتظام نہیں ہوسکیگا۔ وہ ان بتیس سال میں صرف دو مرتبہ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کی عالم رویاء میں اجازت سے ایک ماہ کے لئے وطن تشریف لائے اور تب بھی شہر سے باہر خاندانی باغ کے ڈیرے میں جو بطور ریسٹ ہاؤس کے تھا قیام فرمایا۔ قبلہ دادا صاحب رؒ کا مزار نواب صاحب کنجپورہ کے بڑے باغ میں ہے اور نواب صاحب کا خاندان انکے مزار کی بہت خدمت کرتا ہے اور اسکی دیکھ بھال کیلئے قابل ستایش انتظام کر رکھا ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا خاندان قبلہ دادا صاحبؒ کے ورود کے وقت ہی سے ان کی سایہ گستری اور فیوض سے استفاضہ اور برکتیں حاصل کرتا رہا۔

سیدنا شاہ ابراہیم صاحبؒ کے مناقب، خاندانی اور تاریخی حالات سترہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے کتب تیرہ فارسی میں ہیں اور چار اردو میں۔ ان کتب کی فہرست ضمیمہ میں شامل ہے۔ ان میں سے بعض کتابوں میں "تصوف" کی اہمیت اور

تعلیمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ محترم معین بھائی صاحب مرحوم اور ہم سب میں بڑے بھائی اور برادر معظم سیدنا شاہ احسان الحق رحمۃ اللہ علیہ کو تصوف سے بیحد لگاؤ تھا اور یہ ایک قدرتی امر تھا کیونکہ خانوادۂ ابراہیمی مشائخ کے چار سلسلوں سے منسلک ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔ قادریہ، چشتیہ صابریہ، سہروردیہ اور مجددیہ۔ لیکن ایک حد تک چشتیہ صابریہ مسلک کا بھی غلو ہے۔ تصوف دراصل "تفقہہ فی الدین" کے ایک اہم پہلو اور اصول کا حامل ہے اور فقہہ اسلامی کا جزو لاینفک اور پانچواں ستون ہے۔ اس کا اصل مقصد تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تزئین اخلاق ظاہرہ و باطنہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مکمل پابندی اور سنت رسول اور کتاب الہٰی کا پلا چول و چرا اتباع ہے۔ تصوف پر بہت سی معرکتہ الارا کتب عربی، فارسی، اردو اور علاقائی زبانوں میں دستیاب ہیں جن میں شیخ اکبرؒ کی "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف المعارف" حضرت شیخ علی ہجویری ملقب بہ داتاگنج بخشؒ کی "کشف المحجوب" ڈاکٹر میر ولی الدین کی "قرآن اور تصوف" نیز مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کی حال میں شایع شدہ تصنیف خاص معیاری مقام اور شہرت رکھتی ہیں۔

نسبی لحاظ سے محترم معین بھائی صاحب اور ہم لوگ حسینی سید ہیں۔ خانوادۂ ابراہیمی کا نسب نامہ دو حصوں میں ضمیمہ میں منسلک ہے۔ پہلا حصہ ابوالبشر نبیناہ حضرت آدم علیہ السلام سے سرور دو عالم خاتم النبیئین، رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم تک اور دوسرا امام الانبیاء سرکار مدینہؐ

سے ہم چہار برادران شاہ سید احسان الحق مرحوم، ڈاکٹر سید معین الحق مرحوم' شاہ سید عرفان الحق مرحوم اور راقم الحروف سید رشید الحق تک متصدقہ ہے۔ ان میں سے اول الذکر شجر کی شکل میں اور دوسرا مروجہ طریقہ پر ہے یہ دونوں ضمیمہ میں شامل ہیں۔ خانوادۂ ابراہیمی کے افراد ہمیشہ سے علم دوست اور علم پرور نظر آتے ہیں اور نادر و مفید کتب و فرامین جمع کرنیکا ان میں مشغلہ بھی جاری و ساری رہا ہے۔ اس تناظر میں قرآن مجید کے قلمی نسخے اور عربی و فارسی کے مخطوطات و فرامین کا معتدبہ ذخیرہ جمع ہوتا گیا اور یہ سلسلہ بیسویں صدی میں بھی جاری رہا۔ آخری دور میں میرے خسر خان بہادر مولوی ظفر حسن' او،بی'ای ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ ہند' نے بڑی تعداد میں قلمی و دیگر مفید کتب، قلمی قرآن کریم کے نسخے و فرامین فراہم کرلئے تھے جن میں قرآن مجید کے دیگر قلمی جواہر پاروں کے علاوہ مشہور زمانہ خطاط یاقوت المستعصمی کا بیش بہا ساتویں صدی ہجری کا تحریر کردہ قرآن پاک بھی تھا۔ یہ سب انہوں نے قومی عجائب خانہ کراچی کے نذر کردی تھیں اور بحمداللہ وہاں بہ حفاظت محفوظ و موجود ہیں۔ اسطرح محترم معین بھائی صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں بھی بہت سی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں جن میں ہمارے سرخیل مخدوم حضرت جہانیاں جہاں گشت قدس اللہ سرہ العزیز کا بقلم خود نقل کیا ہوا قلمی قرآن شریف کا نسخہ بھی شامل ہے۔

سراج الاولیاء حضرت شاہ ابراہیم رح کے زمانہ ہی سے ہمارے خاندان میں قدیم تبرکات بھی محفوظ ہیں جنکی حیثیت ایک خزینہ'

رحمت کی ہے۔ ان میں رسول مقبول صلعم کا قدم مبارک' غوث الاعظم محی الدین' سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کے موئے مبارک، حضرت خواجہ' خواجگان سیدنا معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز' بابا فریدالدین گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز' شاہ ابوالمعالی قدس اللہ سرہ العزیز اور دیگر اولیائے کبار و صالحین کے ملبوسات' تسبیحین' مسواکیں اور اوراد و ظائف کی کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایک "تابوت سکینہ" کی حیثیت سے برادر معظم شاہ سید احسان الحق رح کے خلف اکبر عزیزم سید سبحان الحق طولعمرہ' کی تحویل میں بصد احترام محفوظ ہیں۔ علاوہ بریں خاندان کے مختلف سلاسل کے شجرے اور مناجات جو مسلک احناف کے مطابق شانہ بشانہ متداول رہے ہیں اور اسلاف میں مقبول تھے حرز جان بناکر محفوظ کرلئے ہیں۔

حصول پاکستان کی تحریک کے سلسلے میں علیگڈہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہء کی جدو جہد اور خدمات مسلم لیگ کا ایک زریں باب ہیں۔ محترم معین بھائی صاحب مرحوم نے بھی اس تحریک میں بہت گرم جوشی سے حصہ لیا اور قائدعظم رح اور قائد ملت رح جب بھی یونیورسٹی میں تشریف لاتے تھے تو معین بھائی صاحب مرحوم انکے دوش بدوش تمام مصروفیات میں صرف شامل ہی نہ ہوتے بلکہ انکی تقریر اور جلسوں وغیرہ کا بندوبست بھی کرتے تھے۔ اس ہی کیوجہ تھی کہ وہ ان دونوں زعماء کے بہت قریب ہوگئے تھے۔ علیگڈہ کے علاوہ بھی معین بھائی صاحب مرحوم نے ملک کے دوسرے شہروں یں بھی جاکر تقریر کیں حتیٰ کہ آسام کا بھی دورہ کیا۔

اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں راقم الحروف سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک لندن میں تھا۔ معین بھائی صاحب مرحوم سے میری برابر خط و کتابت تھی مگر یکایک دو ماہ تک انکا کوئی خط نہیں موصول ہوا۔ یہ امر میرے لئے بہت تشویش کا باعث ہوا۔ بالآخر کراچی سے انہوں نے تفصیلی خط ارسال کیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ عجات اور سراسیمگی میں علیگڈھ کی اپنی کوٹھی فروخت کر کے اور یونیورسٹی کو خیرباد کہکر پاکستان آ گئے۔ اس سلسلہ میں نواب محمد اسماعیل خان صاحب مرحوم نے جن سے میرٹھ میں قیام کے زمانہ میں معین بھائی صاحب کے کافی تعلقات ہوگئے تھے اور اس وقت علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کافی سہولت بہم پہنچائی اور انکی کوٹھی بھی یونیورسٹی کیلئے ہی خریدلی۔

محترم معین بھائی صاحب کی یہ کوٹھی ایک لحاظ سے خاندان کے لوگوں کے لئے اور بعض اعزاء و اقارب کے ہونہار اولاد کے لئے بھی دارالاقامہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی کیونکہ معین بھائی صاحب تعلیم کی برکات وسیع سے وسیع تر کرنے میں بہت منہمک رہتے تھے اور اس ضمن میں بعض موقعوں پر تو انہوں نے مربی کا رول بھی ادا کیا۔ اگرچہ کہ اپنے یہاں رشتہ داروں کو یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران مہمان رکھنے کیوجہ سے انکو خاصا زیربار ہونا پڑتا تھا مگر بیحد خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی اور کبھی کسی سے قدمے' دامے یا سخنے کسی معاوضے یا صلہ کی توقع بھی نہیں کی۔ ایسے طالب علموں میں سے بعض نے بہت ترقی کی اور نام بھی پیدا کیا۔ ان میں سے ایک

ہمارے پھوپھی زاد بھائی ابوالحسن مرحوم کے صاحبزادے پروفیسر ڈاکٹر مسعودالحسن ہیں جو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر کے استاد اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین بھی ہیں۔

علیگڈھ یونیورسٹی کے وہ طلباء جو مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کی تیاری کرتے تھے معین بھائی صاحب انکے ٹیوٹوریل کلاسیں بھی لیتے تھے بالخصوص نواب محمد اسماعیل خان صاحب کے تینوں صاحبزادے جو آئی سی ایس میں کامیاب ہوئے معین بھائی صاحب کے شاگرد رہے تھے۔ اسطرح میر غلام علی تالپور مرحوم (سابق وزیر)' مسٹر غلام علی اللہ علی نانا (مسٹر جسٹس فیروز نانا مرحوم کے برادر خورد) اور پیر محفوظ علی مرحوم (جنکا علیگڈھ میں نام محمد محفوظ قریشی تھا) یہ سب اصحاب معین بھائی صاحب مرحوم کے شاگرد رہے تھے۔ پیر محفوظ علی صاحب مرحوم راقم الحروف کے بہت عزیز دوست تھے اور سنہ ۱۹۳۷ء میں جب میں لندن میں تھا پیر محفوظ صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں کا وہاں بہت خوشگوار وقت گذرا۔ معین بھائی صاحب کی کتاب کا اخبار میں جو ریویو Ideological Basis of Pakistan کے شایع ہونے پر نکلا تھا وہ پیر صاحب کی نظر سے گذرا تھا اور انہوں نے اسکی ایک کاپی کے لئے مجھ سے کہا۔ میں نے جب معین بھائی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے اپنی کئی اور کتابیں بھی پیر محفوظ صاحب کے نام آٹوگراف کر کے دیں۔ انکے شکریہ کا جو خط پیر محفوظ صاحب نے لکھا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس غرض سے ضمیمہ میں منسلک ہے۔

معین بھائی صاحب کی زندگی کا معتدبہ حصہ علیگڈھ میں گذرا۔ ان ایام میں وہ بندوق کا شکار بھی کھیلتے تھے جس میں خاندان کے دوسرے لوگ بھی کافی دلچسپی لیتے تھے مگر کراچی آنے پر انکا یہ شوق کم ہوگیا۔ ایک مرد مومن کی تمام صفات عالیہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں اپنے علمی مشاغل، تحقیق و تصنیف اور دیگر ذمہ داریوں کے باوجود اور ہرچند کہ انکا حلقہ احباب بھی کافی وسیع تھا اور بلند پایہ مجلس مذاق کو بھی برقرار رکھتے ہوئے وہ صوم و صلوٰۃ کے مکمل طور سے پابند تھے اور تمام شعائر اسلامی کی خلوص دل سے پیروی کرتے تھے تواضع اور خوش خلقی انکے طرۂ امتیاز تھے۔ طبیعت بہت صلح کل تھی نیز بہت خوش عقیدہ تھے۔ نموتناً یہ اس قابل دلچسپی ہوگا کہ خوش عقیدہ ہونیکی بناء پر انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام مولانا راغب مدظلہ، العالی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے قطب عالم حضرت شیخ عبدالحق ردولوی قدس اللہ سرہ العزیز کے اسم مبارک کی مطابقت سے سید احمد عبدالحق طولعمرہٗ رکھا۔

ہمارے خاندانی سلسلہ طریقت میں تمام بزرگوں اور اسلاف کو سماع سے بہت رغبت رہی ہے خصوصاً عارفانہ کلام سے جس میں حمدوثناء نعت، منقبت، توحید الہٰی اور عشق حقیقی کے مضامین کی خاصی اہمیت ہے۔ معین بھائی صاحب کو بھی سماع سے بہت دلچسپی تھی اور قوالی کا شوق تھا اور یہ ہم سب لوگوں کی قدر مشترک ہے حتیٰ کہ نئی نسل کی بھی۔ قبلہ دادا صاحب سید شاہ ظہورالحق قدس اللہ سرہٗ العزیز کا سالانہ عرس ۲۷ ذالحج کو تقریباً ایک صدی سے مسلسل منعقد ہوتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ عرس کے

موقع پر سماع میں شاہجہانپور کے مشہور قوال کنہیانے مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس اللہ سرہ العزیز کی نعت جس کا مطلع ہے۔

توجان پاکی نئے آب و خاک اے نازنین ؐ
واللہ زجاں ہم پاک تر روحی فداک اے نازنین ؐ

سنائی۔ اس کے مندرجہ ذیل شعر پر قبلہ و کعبہ، نازش عارفاں، والد ماجد سیدنا حضرت شاہ مولوی محب الحق قدس اللہ سرہ العزیز کو وقت و کیفیت طاری ہوگئی۔

پاکاں ندیدہ روئے توجاں دادہ بر بوئے تو
اینک بہ گرد کوئے تو صد جان پاک اے نازنین ؐ

قوال موصوف نے اس شعر کی بہت تکرار کچھ اس وجہ سے بھی کی کہ کنہیا قبلہ والد صاحب کا بیحد معتقد تھا کیونکہ اسکے اولاد نہیں ہوتی تھی اور اس نے والد صاحب سے دعاء کی درخواست کی۔ قبلہ والد صاحب کی دعاء سے اللہ تعالیٰ نے اس کو لڑکا مرحمت فرمایا۔ محترم معین بھائی صاحب مرحوم پر بھی ایک گونہ وجدانی کیفیت طاری ہوئی اور آب دیدہ ہوگئے اور کنہیا قوال کو نذرانہ بھی پیش کیا۔ مندرجہ بالا شعر کے رقت آمیز اور موثر ہونیکی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں حضرت اویس قرنی رضؓ جو رسول اکرم ؐ کے نادیدہ غائبانہ صحابی اور عاشق تھے کاشانۂ رسالت پر مدینہ منورہ میں حاضری اور سرکار دوعالم ؐ کی غیر موجوگی میں مسجد نبوی ؐ کے ارگرد طواف کر کے واپسی، نیز رسول اللہ ؐ کی ہدایت و وصیت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرت اویس قرنی رحؒ کو رسول مقبول ؐ کا کرتہ پہنچانیکا اور دور ہی سے اسکی متبرک خوشبو

سونگھہ کر حضرت اویس قرنیؒ کا وجد کرنیکے واقعات کیطرف اشارہ ہے۔ مختصراً محترم معین بھائی صاحب کی پوری زندگی قولاً و فعلاً تمام اوصاف حمیدہ، اسلامی تہذیب و تمدن کا مرقع تھی اور اس میں تصوف کے فیضان سے بڑا خوش آیند اور دلکش امتزاج پیدا ہوگیا تھا' بمصداق ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشند خدائے بخشندہ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

فہرست کتب

مندرجہ ذیل کتابوں میں سیدنا حضرت شاہ ابراھیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات' مناقب' مشاغل اور معمولات کی تفصیل دی ہوئی ہے۔

فارسی

۱۔ انوار العارفین
- تذکرۃ الابرار
- نزہۃ الخواطر
- بحر زخار
- سیرت الاولیاء
- ملفوظات شریفی
- لطائف ابراھیمی
- ملفوظات ابراھیمی
- تذکرہ ابراھیمی
- وقائع ابراھیمی
- جذبات ابراھیمی
- مقامات عالیہ
- منازل اربعہ

اردو

- گلزار معانی حصہ اول
- گلزار معانی حصہ دوم
- گلزار معانی حصہ سوم
۱۷ ۔ گلزار معانی آخری حصہ

بسم الله الرحمٰن الرحیم

نسبنامه

سید احسان الحق، سید معین الحق، سید عرفان الحق، سید رشید الحق هر چار برادران ابن سید مجیب الحق ابن سید ظهور الحق ابن سید عبدالحق ابن سید اشرف الحق ملقب به سید محمد پیر اشرف ابن سید محمد نعیم شاه ابن سید محمد فاروق، ابن سید دوست محمد ابن سید محمد ابراهیم سراج الاولیاء ابن سید علی ابن سید شاه لعل ابن سید کمال ابن سید شاه جمال ابن سید شاه محمد ابن سید احمد ابن سید عبدالعزیز ابن سید عبدالکریم ابن سید جلال حضرت مخدوم جهانیان جهان گشت رح ابن سید احمد کبیر ابن سید جلال سرخ بخاری رح ابن سید علی مؤید ابن سید جعفر ابن سید محمد دین ابن سید احمد ابن سید عبدالله ابن سید اصغر ابن سید جعفر ثانی ابن سید علی هادی (نقی) ابن سید حضرت امام محمد تقی ابن سید حضرت امام موسیٰ علی رضا ابن سید حضرت امام موسیٰ کاظم ابن سید حضرت امام جعفر صادق ابن سید حضرت امام محمد باقر ابن سید حضرت امام زین العابدین ابن سید حضرت امام حسین ابن امیرالمومنین حضرت علی مرتضیٰ و سیده حضرت فاطمه زهرا رضی الله عنها بنت سرور کائنات، خلاصه موجودات، رحمت للعالمین، شفیع المذنبین، امام المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه واله وسلم۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

---

۲ جمادی الثانی ۱۴۱۰

قطعهٔ مادّه تاریخ

سروده: دکتر محمد حسین تسبیحی (رها)
۱۹۸۹/۱۲/۱ م = ۱۳۶۸/۱۰/۱۰ هـ ش

به مناسبت درگذشت مرحوم ادیب سخنور و هنرور و مؤرخ و محقق بزرگوار استاد دکتر معین الحق در تاریخ آبان ماه ۱۳۶۸ هـ ش برابر با ماه اکتبر ۱۹۸۹ م و مطابق با ربیع الاول ۱۴۱۰ هـ ق. در کراچی (پاکستان)

معین الحق ادیب نکته دانان — سوی جنت روان گردید شادان
معین الحق برفت از دار دنیا — به دار آخرت شد پیش جانان
معین الحق امین علم و تاریخ — خردمند و بزرگ مُلک پاکان
به تاریخ و ادب استاد دانا — به فرهنگ و هنر مهر درخشان
معین الحق امیر عشق و مستی — شراب بیخودی در جام عرفان
معین الحق کبی آثار نورا — نوشت و طبع نو کرد از دل و جان
کراچی را گزید از بهر تحقیق — مقالاتش به جا مانده فراوان
به اسلام و به قرآن دل سپرده — در این ره کوشش او بود شایان
چو از دنیا گذشت آن مرد تاریخ — وفاتش در جمل آمد نمایان:
«معین الحق بزرگ خلق» گردید (۱۳۶۸ هـ ش) — به خورشیدی بود تاریخ گویان
«معین الحق گرامی خلق» می بود (۱۴۱۰ هـ ق) — به هجری شد قلم جوینده اینسان
«معین الحق بحر فیض طاعت» (۱۹۹۰ م) — رقم زد هاتف از سوی سخندان
دعا و مغفرت بر روح او باد — که خوابیده کنار رود مهران
الهی رحمتت بارد به گورش — کبی گلها از آن گردد شکوفان
«رها» باشد به یاد او همیشه — محقق بود و دانای بزرگان

INSTITUTE OF CENTRAL AND WEST ASIAN STUDIES

109 Faculty of Arts
UNIVERSITY OF KARACHI
Karachi-32 (Pakistan)

R No. ________

Dated [illegible] 19

محترمہ بیگم ممتاز معین صاحبہ، سلام مسنون۔

دراصل صدمے کے بعد سے برابر آپ کو خط لکھنے کا خیال رہا، لیکن دل کی سنگینی کے باعث ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم میرے استاد تھے اور یہ بات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی، یعنی اب سے ۴۲ سال پہلے کی۔ لیکن آج بھی مجھے ان کا پیرایہ تدریس یاد ہے۔ جیسا کہ میں نے شعبہ تاریخ عام کے جلسہ تعزیت میں کہا تھا، میں نے ڈاکٹر صاحب سے نہ صرف تاریخ کا پہلا سبق سیکھا بلکہ میں نے ان سے پیرایہ تدریس بھی حاصل کیا۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب پاکستان کے ایک بہت بڑے فعال مؤرخ تھے۔ علم تاریخ سے انھیں فطری لگاؤ تھا، اور وسیع مطالعہ نے ان میں غیر معمولی بصیرت پیدا کر دی تھی۔ پھر خدا نے ان کی طبیعت میں خود اعتمادی اور استقامت کے اوصاف ودیعت کئے تھے، انھوں نے ان کی تمام خوبیوں کو جلا بخشی، چنانچہ چالیس پچاس سال کے تاریخی اور تحقیقی کام کے نتیجے میں انھوں نے جو علمی ذخیرہ چھوڑا وہ ایسا ہے کہ اس پر بڑے سے بڑا عالم رشک کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہم سب کے لئے [illegible]۔ مرحومین کی [illegible] کے لئے ایک مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ آخر وقت تک کام کرتے رہے اور قلم تو اسی وقت چھوڑا جب داعیٔ اجل نے دستک دی۔

خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ڈاکٹر [illegible] میری طرف سے تعزیت قبول کریں۔

والسلام

[illegible]

"ڈاکٹر معین الحق مرحوم جان بہشت"

۱۹۸۹ء

نامور مورخ تھے ڈاکٹر معین الحق
یوں شمیم نے لکھا آپ کا سنہ رحلت
ارض پاک میں آن سے اہل علم کم نکلے
ڈاکٹر معین الحق قاید ارم نکلے

۱۴۱۰ھ

ممتاز مورخ، سابق پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، اردو کالج کراچی کے سابق پرنسپل اور ہسٹاریکل سوسائٹی آف پاکستان کے سابق ڈائریکٹر ریسرچ، ڈاکٹر سید معین الحق نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ بروز جمعتہ المبارک بعمر ۸۸ سال کراچی میں رحلت فرمائی۔

از شمیم صبائی متھراوی
ماخوذ از
"ماہنامہ قومی زبان" اپریل سنہ ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

NATIONAL HIJRA COUNCIL

Dr. N. A. Baloch

~~Office Telephone~~ :

20-Masjid Road, F-6/4,

Islamabad 11. 11. 89

Dear Dr. Ansar Zahid Khan,

I am much grieved at the sad demise of Dr. Moinul Haq. His thoughts come to my mind again and again, when I recall my contacts with him when I was a student at Aligarh and then during the long years that he was with us in Pakistan. It was due to his initiative and effort that Pakistan Historical Society was founded in Karachi and it continued to progress despite difficult circumstances.

Please do convey to his near ones that I, like many others who knew Dr. Moinul Haq, will continue to think of him and remember him as I have done to this day.

Thanking you in anticipation

Sincerely

Baloch

P.S. A tribute to Dr. Moinul Haq should also materialise in the publication of 'Road to Pakistan'. When is it expected to appear?

B.

4, Rue de Tournon,
Paris-6 / France

بسمہ

۱۹۸۹/۱۱/۳۰

عزیز و محترم آپا جان اللہ آپ کو بعافیت رکھے

سلام مسنون۔ خیر و عافیت کا طالب۔

کچھ عرصہ قبل مولوی مظہر ممتاز قریشی صاحب نے ایک اردو اخبار کی خبر لکھی تھی کہ آپ کے عزیز و فاضل شوہر معین الحق صاحب اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ میں نے فوراً ایک تعزیتی خط لکھا۔ یقین نہ تھا کہ آپ پرانے مکان ہی میں ہیں اس عزیزہ محی الدین عبد الغفار صاحب (پیر الٰہی بخش کالونی) کے توسط سے لکھا تھا۔ آج کل ڈاک نا قابل اطمینان ہو گئی ہے۔ مولوی مظہر ممتاز صاحب سے آج معلوم ہوا کہ تا حال وہ خط آپ کو نہ ملا۔ افسوس بالائے افسوس۔ یہ قصور معاف فرما دیں۔ مکرر کچھ عرض کرتا ہوں۔

اولاً انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آج وہ تو کل ہماری باری ہے۔ لیکن جتنا صدمہ بیوی کو ہوتا ہے، کسی اور کو ہو نہیں سکتا۔ خدا آپ کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

اس اثنا میں اس ناچیز گنہگار نے قرآن مجید کا ایک ختم مکمل کیا اور ثواب مرحوم کے لئے گزرانا۔ اللہ ان کو جنت میں اعلیٰ علیین نصیب فرمائے۔ مرحوم نے علم کی بہت خدمت کی۔ وہ اب ختم ہو گئے لیکن جو مطبوعہ اور قلمی تالیفیں ہیں ان سے ان شاء اللہ لوگ سدا مستفید ہوتے رہیں گے۔

وہ ایک اچھے دوست بھی تھے۔ سوائے اس کے کہ مرحوم کے لئے دعا کرتے رہیں، کوئی چارہ، کوئی بدل نہیں۔

خدا کرے خود آپ اور رشتہ دار خیر و عافیت سے ہوں اور تادیر بخیر و عافیت رہیں۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

حواشی و تعلیقات

باب اول

1 ان ریاستوں کو جن میں حیدرآباد (دکن)، بنگال اور اودھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس لئے نیم خود مختار کہا گیا ہے کہ ان کے حکمرانوں نے خود کو بادشاہ نہیں بنایا، بلکہ برائے نام مغلیہ سلطنت کے ناظم یا نواب وزیر وغیرہ کا ہی لقب اختیار کیا۔ سب سے پہلا حکمران جس نے بادشاہ کی حیثیت اختیار کی اودھ کا نواب وزیر تھا۔ اس نے یہ اقدام برطانوی گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کے بھڑکانے پر کیا تھا، بہرحال یہ ریاستیں اپنے علاقوں میں کامل خود مختار تھیں۔

2 روہیلکھنڈ کی علمی و ادبی زندگی سے متعلق بعض تفصیلات کے لئے دیکھو، مقدمہ، اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند از محمد ایوب قادری مطبوعہ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی۔

3 تفصیل کے لئے دیکھو، اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، جلد اول باب۔ تیسری جنگ پانی پت۔

4 اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اودھ کے ساتھ انگریزی فوجیں شریک نہ ہوتیں تو اس کو روہیلوں پر مکمل فتح حاصل نہ ہوتی، اور شاید اس طریقہ سے ان کا نام بحیثیت حکمرانوں کی تاریخ کے صفحات سے اتنی جلد نہ مٹ جاتا، بلکہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ میں روہیلوں نے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کی رفتار اس سے بدلی ہوئی ہوتی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Dr Muhammad Baqir
PROFESSOR EMERITUS
UNIVERSITY OF THE PUNJAB

Tel : 850608
13 - G, Model Town,
Lahore (Pakistan),
5470

٦ دسمبر ١٩٨٩

عزیز محترم، السلام مسنونہ۔

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اور ساری زندگی میں پہلی مرتبہ ہے ہم ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے اور کن المناک حالات میں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مرحوم ڈاکٹر صاحب کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ میں نے آپ کو ہمیشہ کالج لائبریریوں میں ان کی مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے اور میرے دل میں آپ کے لئے بڑی عقیدت ہے۔ باری تعالیٰ آپ کو حوصلہ اور صبر دے۔ آمین۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

۲۔ میں ہر ممکن مدد کے لئے حاضر ہوں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے متعلق سوانحی کتاب کے لئے چند الفاظ ضرور لکھ بھیجوں گا۔ انشاء اللہ۔ ویسے ہم خود بھی خشک پتے کی طرح زندگی کے درخت سے لٹک رہے ہیں۔

عن قریب است که از ما اثری باقی نیست
شیشه شکسته و می ریخته و ساقی نیست

والسلام۔

محمد باقر

انگریزی کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز پر پارلیمینٹ میں مقدمہ چلایا گیا عاید شدہ الزاموں میں نواب وزیر اودھ کی اس موقع پر امداد دینا بھی تھا' لیکن آخر میں وہ سب الزاموں سے بری کردیا گیا تاریخ کا فیصلہ' پارلیمنٹ کے فیصلہ سے متصلق ہے۔

5 آئین اکبری میں بھی مرادآباد کا قدیم نام چوپالہ مرقوم ہے غالباً مرادآباد کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چار مختلف دیہات سے مل کر بنا ہے جن میں بھدورہ شامل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اطراف و جوانب سے بہت سے لوگ وہاں آکر آباد ہوگئے جن میں کسرول کے شیخ زادے۔ راجپوت۔ جاٹ اور قصاب شامل تھے۔ کسرول کے شیوخ کو کلال بھی کہا جاتا ہے جن میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے مجاہدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

6 شاہجہاں کے زمانے میں یعنی سنہ ۱۶۳۷ء میں ایک سردار مرزا یوسف چغتائی نے دریائے رام گنگا کے کنارے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس نے سنہ ۱۶۳۰ء میں پنج ہزاری منصب پر شاہجہاں کی ملازمت اختیار کی تھی۔ ایک موقع پر اس علاقے میں ایک بغاوت ہوئی تو شاہجہاں نے اس کی سرکوبی کیلئے مرزا یوسف کو سنبھل تعینات کردیا۔ اس نے نہ صرف اس علاقے میں باغیوں کی سرکوبی کی بلکہ دکن میں بھی مغلیہ حکومت کے نام پر فتوحات کیں' شاہجہاں نے بطور انعام اسے سنبھل کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا اور رستم خان کے خطاب سے سرفراز کیا۔

رستم خان شجاعت و بہادری میں لاثانی' علم دوست اور فقراء کا معتقد تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادہ داراشکوہ کی

باہمی آویزش میں اس نے آخرالذکر کا ساتھ دیا تھا۔ اورنگ زیب سے جو معرکہ سنہ ۱۶۵۸ء میں ساموگڑھ کے مقام پر ہوا تھا اس میں رستم خان اپنے بیٹے رفعت خان اور بھتیجے کے ہمراہ مارا گیا۔ مرادآباد کی جامع مسجد اور قلعہ کی مسجد رستم خان کی یادگار ہے اس نے قلعہ کے قریب تین بازار بھی آباد کئے تھے علاوہ ازیں شہر کے باہر عمدہ باغات بھی لگوائے۔

7 راقم الحروف کی دادی صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ رستم خان حضرت شاہ ابراھیم شاہ صاحب رح کا معتقد تھا' اور یہ مشورہ اس کو انہوں ہی دیا تھا' ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح ہو' مگر اس کے لئے تاریخی شہادت دستیاب نہ ہوسکی۔

8 ٹیپو سلطان کی خواہش تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ اور ان کے اقتدار سے برصغیر کو آزاد کرانے کے لئے سب ریاستوں کو متحد ہونا چاہیئے' مگر افسوس ہے کہ نظام حیدرآباد اور مرہٹے اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اگر یہ دونوں ٹیپو کے ساتھ ہوجاتے تو شاید تاریخ کا رخ بدل جاتا' بہرحال یہ نہ ہوا اور برصغیر کا یہ مجاہد اعظم' میدان جنگ میں لڑتا ہوا' شہید ہوگیا۔

9 اس کا ذکر صاحب انوارالعارفین نے کیا ہے جو سید احمد شہید کے معاصر تھے۔

10 تفصیلات کے لئے دیکھو راقم الحرف کی انگریزی تصنیف دی گریٹ ریولیوشن آف ایٹین ففٹی سیون' شایع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی۔

11 یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ انقلاب کے بانیوں نے گاؤوں کی آبادی میں چپاتیاں تقسیم کرکے اور فوج کے رسالوں میں کنول

کے بھول تقسیم کر کے لوگوں سے چھین لیا تھا یہ ایک ایسا راز تھا کہ آج تک راز کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

12 یہ دن ۳۱ مئی ۱۸۵۷ کا تھا۔

13 مثلاً مرہٹہ سردار تانتیا ٹوپی جو آخر تک لڑتا رہا اور ۱۸۵۹ کے شروع میں اس کا خاتمہ ہوا۔ نانا راؤ بھی آخر تک مقابلہ کرتا رہا۔ جھانسی کی رانی' اور کنور سنگھ نے بھی انتہائی شجاعت کے مظاہرے کئے اور آخر تک انقلابیوں کے ساتھ رہے۔

14 جو علماء مولوی منو کے مکان پر مشوروں کے لئے جمع ہوتے تھے خاندانی روایت کے مطابق جنگ کے خاتمہ پر ان کو گرفتار بھی کیا گیا تھا' لیکن کوئی خاص جرم نہ ہونے کی وجہ سے ان کو رہا کردیا گیا۔

15 شاہ بلاقی رح کا انتقال سنہ ۱۱۳۹ھ میں ہوا۔ ان کا عرس نہایت جوش و خروش کے ساتھ اب بھی منایا جاتا ہے۔

16 نواب مجدالدین خان عرف مجو خان ولد محمدالدین سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مرادآباد کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ ان کے اس دور میں والئی رام پور نواب یوسف علی خان جو انگریزوں کا پٹھو تھا ان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مرادآباد پر انگریز کا اقتدار بحال ہوگیا تو چند سپاہی نواب مجو خان کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کرنے گئے تو انہوں نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا بالآخر گرفتار ہوئے۔ بعد ازاں نواب مجو خان کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ ان کی کوٹھی اور دیگر جائداد کو ضبط کرلیا گیا۔ انگریزوں نے کوٹھی نواب مجو خان کو جو مرادآباد کے مشہور قدیم عمارات میں سے

ایک ہے گڑھوال کے راجہ ٹیڑھی کو خیرخواہئ سرکار کے صلہ میں بطور انعام دیدی۔

17 یہ ایک دلچسپ بحث ہے کہ مسلمانوں نے مغربی تعلیم اور تمدن کی طرف ہندوؤں کی طرح فوری توجہ نہیں کی' یہاں اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں' مگر یہ اشارہ کردینا' ضروری ہے کہ سیاسی اقتدار اور بالادستی کی چھوڑی ہوئی روایات کے علاوہ مسلمانوں کو ہمیشہ اپنے علمی و ادبی اور معاشری و روحانی ورثہ پر ناز رہا ہے اور وہ اپنی قومی زندگی کو اس ورثہ سے منقطع کرنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔

18 Divide and Rule افتراق پیدا کرو اور حکومت کرو۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اختلافات بڑھانے اور ان کو بنیادی حیثیت دینے کے لئے انگریز مورخین نے مسلمانوں کے عہد اقتدار کی تاریخ کو مسخ کرکے اس انداز سے پیش کیا کہ مسلم حکمرانوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں ظلم و استبداد کے علاوہ کچھ نہیں کیا' اور برطانوی حکومت ان کے مقابلہ میں نہایت منصف مزاج اور ہندوؤں کے لئے باعث رحمت و برکت اور ان کی فلاح کی خواہاں ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ اشارات ہم کو ایلیٹ کی مشہور تاریخ کے دیباچہ میں ملتے ہیں۔

19 وکالت کے پیشے میں پلیڈری کا درجہ ایل ایل بی سے کمتر ہوتا ہے۔ اس کا امتحان انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد دیا جاسکتا تھا۔

20 حصول آزادی کی دس سالہ کوشش (۱۹۳۷-۱۹۴۷ء) میں مسلمانوں کو ایک طرف تو برطانوی استعمار کے خلاف اور دوسری طرف ہندو رہنماؤں' خاص طور پر کانگریس سے اپنی قومی حیثیت اور

حقوق منوانے کے لئے اقدامات کرنے پڑے۔

21 یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ابتداہی سے مسلم یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہنا شروع کردیا تھا اس کی تفصیلات کا ذکر بعد میں ان صفحات میں کیا جائے گا۔

22 انریبل سرسید رضا علی کے حالات ان کی خودنوشت سوانح حیات ''اعمالنامہ'' میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور بہت سے مسائل پر اس میں مفید معلومات موجود ہیں۔ دهلی میں چھپی تھی' اب نایاب ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ان کے ورثاء اس کو دوبارہ چھپوادیں۔

23 وحدت وجود' تصور توحید کی انتہائی اور آخری شکل ہے۔ اسلامی عقائد میں توحید کا مرتبہ اول ہے۔ اس لئے صوفیہ نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ اور ان کے عظیم مفکرین نے وحدت وجود ہی کو اس کی آخری اور بلند ترین شکل قرار دیا ہے اس کے حق میں انہوں نے قران' حدیث نیز فلسفہ و منطق سے متعدد دلائل پیش کی ہیں۔ سادہ اور مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ وجود کا اطلاق صرف وجود حقیقی یا وجود مطلق یعنی اللہ کی ذات پر کرتے ہیں۔ تخلیق کی ہوئی ہستیاں جو فنا ہونے والی ہے' اسی ذات مطلق کا مظہر اور جلوہ ہیں۔ اس مسئلہ کو شیخ محی الدین ابن العربی (ف) نے جن کو شیخ اکبر کہا جاتا ہے انتہائی مفصل اور مدلل انداز میں پیش کیا اور اس وقت سے وہ دین اور فلسفہ دونوں کے اہم مسائل میں شمار کیا جانے لگا۔ صوفی شعرا نے جن میں سنائی' عطار اور مولانا رومی کو اعلیٰ ترین

مقام حاصل ہے' اس تصور کو شعر کا لباس پہنایا' چنانچہ مفکرین و مصنفین کے حلقوں سے نکل کر اب وہ' صوفیہ کی مجالس سماع اور ارباب علم و ادب کی محفلوں میں متعارف ہوگیا' اس کی وسیع اشاعت میں ایک عظیم خطرہ بھی مضمر تھا' وہ ایک ایسا نازک اور دقیق مسئلہ ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی اور بے سمجھی سے اس پر تقریر یا تحریر کرتے وقت شرک کا شائبہ شامل ہوجاتا ہے۔ اس لئے محتاط علماء اور بزرگوں نے اس پر گفتگو کرنے کی ہمت افزائی نہیں کی ہے' بہرحال اسلامی دنیا میں مثنوی مولانا روم کی عالمگیر اشاعت نے اس مسئلہ کا تعارف بھی عالمگیر کرادیا اور صوفیہ کے حلقوں میں اس کا ذکر عام نہیں تو بڑی حد تک مروج ہوگیا۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ غیر مسلم مفکرین' خاص طور پر نو افلاطونی فلسفیوں نے بھی ہمہ اوست کا تصور پیش کیا ہے لیکن اس میں اور صوفیہ کے عقیدہ میں عظیم فرق یہ ہے کہ اول الذکر کے نزدیک یہ عالم عدم کی حیثیت رکھتا ہے اور صوفیہ اسلام کے نظریہ یعنی خالق اور مخلوق اور عبد اور معبود کے فرق کو تسلیم کرتے ہیں جہلاء کے خیالات سے خواہ وہ صوفیہ کے طبقہ سے یا کسی اور طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں خدا محفوظ رکھے!

24 توشہ کی فاتحہ: شیخ عبدالخالق ردولوی رح چشتی سلسلہ کی صابری شاخ کے ایک بڑے بزرگ ہیں۔ یہ شاہان شرقیہ کے ہم عصر تھے اور ان کے ذریعہ اس سلسلہ کی اشاعت بہت زیادہ ہوئی' ان کی فاتحہ ایک خاص طریقہ سے تیار کئے ہوئے حلوہ پر دلائی جاتی تھی اور اس میں صرف اهل سلسلہ شریک

ہوتے تھے۔ اس کی بہت احتیاط کی جاتی تھی' کہ کوئی ایسا
شخص نزدیک نہ ہو جو حقہ یا سگریٹ پیتا ہو۔ یہ حلوہ وہی
لوگ خود اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے جو اس فاتحہ میں شرکت
کرتے۔ حلوہ کھانے سے پہلے اور بعد میں دونوں وقت شیخ مذکور
کی روح پر فاتحہ پڑھی جاتی اور ایصال ثواب کیا جاتا اس
مخصوص فاتحہ کو توشہ کہا جاتا تھا۔ والد صاحب حقہ
نوشوں کے علاوہ بچوں کو بھی شریک نہیں کرتے تھے' مگر
صوفی صاحب نے مجھے اور برادر بڑے بھائی کو شریک کرلیا۔
کہا جاتا ہے کہ خود ردولی میں یہ احتیاط نہیں کی جاتی اور
سب لوگ شریک ہوسکتے ہیں۔

25 ہماری تاریخ کا یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ مغلوں کی طویل
حکمرانی کے باوجود مسلمانوں کی آبادی میں مغل اور ترکی
النسل خاندانوں کی تعداد بہت کم تھی' روہیلکھنڈ میں تو
آخر دور میں پٹھانوں کی حکومت تھی مگر دوسرے مقامات پر
بھی مغل کم ہی تعداد میں ملتے ہیں۔

26 یہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے' حوززگری کا پیشہ کرتے تھے
اور شاید اسی فن میں استاد ہونگے' بہرحال جب ہم نے ان کو
دیکھا وہ یہ کام چھوڑ چکے تھے' اب ان کی شہرت اس لحاظ
سے تھی کہ وہ نہایت خوبصورت تعزیہ بناتے تھے' اور عاشورہ
محرم میں بچے بڑے اشتیاق سے ان کی مصروفیت اور کارگذاری
کو دیکھتے تھے۔

27 مولوی عالم علی والد کفایت علی مرادآباد کے نامور عالم اورکئی
کتابوں کے مصنف تھے سنہ ۱۸۷۸ء میں وفات پائی انہوں نے

ضلع بجنور کے شہر نگینہ سے آکر مرادآباد میں مستقل طور پر
سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے صاحبزادے مولوی قاسم علی
صاحب علم و فضل بزرگ تھے علاوہ ازیں بطور طبیب بھی انہیں
شہرت حاصل تھی۔ حکومت سے انہیں عہدہ طبابت کی باقاعدہ
تنخواہ ملتی تھی۔ دیوبندی مسلک کے حامل تھے لیکن کسی
کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ جامع مسجد کے خطیب تھے۔ (رضا)

28 اس واقعہ کا ذکر مولانا حالی نے حیات جاوید میں کیا ہے۔

29 لطیفہ۔ نماز جمعہ میں مسجد سے جوتیاں چوری ہوجانا ایک
ایسا واقعہ ہے جو مختلف شہروں میں رونما ہوتا رہتا ہے۔
یونیورسٹی کے صیغہ امتحانات میں ایک کلرک جناب ابراہیم خان
صاحب تھے' طالب علموں سے ان کے واقعات وسیع تھے' اور
اسٹاف میں بھی ہردلعزیز تھے۔ ایک مرتبہ وہ دہلی گئے اور
خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب مرحوم کے مکان پر ٹھہرے'
دہلی کی شاندار جامع مسجد میں نماز ادا کرکے واپس آئے تو
فرمانے لگے' مولوی صاحب آج ہماری جوتیاں کوئی پہن کر
چلا گیا' لیکن میں نے بھی ننگے پیر واپس آنا مناسب نہیں سمجھا
بلکہ وہ جو سب سے زیادہ نئی جوتیاں نظر آئیں وہ پہن کر آگیا۔
ابھی خان صاحب مرحوم یہ دلچسپ قصہ اور اس سلسلہ میں
اپنا کارنامہ بیان ہی کر رہے تھے کہ خان بہادر صاحب کا باورچی
آیا اور ہنس کر کہنے لگا سرکار "یہ جوتیاں تو میری ہیں' کل ہی
تو میں بازار سے لایا تھا اور آج جمعہ میں پہن کرگیا تھا کیا
خدا کی شان ہے' مسجد سے چوری گئیں اور پھر آگئیں"۔ یہ
کہہ کر اس نے جوتیاں اٹھالیں اور چلا گیا' سب ہنسنے لگے مگر

خان صاحب مرحوم کو ندامت ہوئی۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کی مثل ان پر پوری طرح صادق آرہی تھی۔

30 پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ایک برطانوی مستشرق، پروفیسر ڈنلپ کی کتاب 'عربک سائینس ان دی ویسٹ' شایع کی ہے۔ اس کا مطالعہ اس سلسلہ میں مفید ہوگا۔

31 مولانا نعیم الدین صاحب کو علمائے اہل سنت والجماعت میں اعلیٰ مقام حاصل رہا۔ بریلوی مسلک کے بانی حضرت احمد رضا خاں رح کے خلفاء میں شامل رہے۔ فاضل بریلوی رح کے مشہور ترجمہ قران کریم کنزالایمان کے حواشی مولانا نعیم الدین مرادآبادی کے تحریر کردہ ہیں۔ مشہور و معروف مبلغ دین تھے اور ہندوستان بھر میں دینی اجتماعات سے خطاب کیلئے انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ (رضا)

32 اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ زھد و رہبانیت میں قریبی رشتہ ہے قطعی غلط ہے۔ رہبانیت کو اسلام نے جائز نہیں رکھا ہے، اور اسلام میں متاہل اور کاروباری زندگی روحانی علویت کے رشتہ میں "رکاوٹ نہیں ڈال سکتی' حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی فقر یا تصوف میں یہی نمایاں امتیاز ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عقبیٰ کو جس کا تعلق روحانیت سے ہے، دنیا پر ترجیح دینا چاہئیے۔ حضرت علی رض نے ایک مرتبہ یہی ارشاد فرمایا کہ مومن کے لئیے لازمی ہے کہ دینی ذمہ داریوں کو دنیوی مقاصد کے حصول پر ترجیح دے۔ شہنشاہ عالمگیر کا ایک دلچسپ ذکر خافی خان نے اپنی تاریخ منتخب اللباب میں کیا ہے۔ ایران سے کچھ گھوڑے تحفہ میں آئے تھے، ان کی

پیشی کا جو وقت مقرر کیا گیا تھا، اس وقت متعلقہ افسر نے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ عالمگیر نے جو اس وقت تلاوت قران میں مصروف تھا یہ سوچ کر کہ معاینہ میں وقت لگے گا، اس لئے ارادہ کیا کہ قران بند کردے اور تلاوت ملتوی کردے۔ اسی وقت اتفاق سے وہ آیات آ گئیں جن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا گھوڑوں کے معائنہ میں دیر ہوجانے کے باعث عبادت کا وقت گذرجانے کا ذکر ہے (سورہ ص۔ آیات ۳۱-۳۳) عالگیر پر اس کا اثر بہت گہرا ہوا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ گھوڑوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت مساکین میں تقسیم کیا جائے

33 یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہمارے مورخوں نے عوام کی زندگی اور خاص طور پر اس کے معاشری پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان بزرگان دین کے حالات بہت کمی کے ساتھ تاریخوں میں ملتے ہیں جنہوں نے معاشرہ کی تشکیل اور نشو و نما میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بہرحال دور جدید کے مورخ کا یہ فرض ہے کہ اس موضوع پر تحقیق کریں۔

34 انوار العارفین کے مصنف' مرادآباد ہی کے رہنے والے تھے۔ درگاہ پیر غائب پر گھوڑے کے نعل کثرت سے نصب ہیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ سالار مسعود غازی کے ہمراہی سرداروں میں شامل تھے جو جہاد کیلئے ہندوستان آئے تھے اور مختلف مقامات پر کفار سے نبردآزما ہوئے۔ (رضا)

35 والد صاحب قبلہ وفات کے وقت (دسمبر ۱۹۴۰) علیگڈھ میں ہمارے پاس ہی تھے' ان کی وصیت تھی کہ ان کو شاہ ابراہیم رح کے مزار کے احاطہ میں پر دادا صاحب قبلہ کے برابر ہی دفن

کیا جائے۔ چنانچہ وفات کے بعد ان کے جسم مبارک کو لاری کے ذریعہ مرادآباد لیجایا گیا اور اسی جگہ دفن کیا گیا ہے۔

36 ان درویش کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ان کو بطور نذرانہ ملتا' وہ برآمدہ میں ایک کھلے ہوئے طباق میں رکھ دیتے۔ ایک شخص ایک رات کو یہ دیکھ کر کہ شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں وہاں آیا اور طباق پر ان کی رقم چرانے کی غرض سے ہاتھ ڈالا۔ فوراً ایک بچھو نے کاٹ لیا۔ یہ شخص بہت شرمندہ ہوا' شاہ صاحب کے پاس آ کر چوری کے پیشہ سے تائب ہوگیا اور ان سے معذرت کرلی۔

37 انوارالعافین میں ان کے حالات موجود ہیں۔

باب دوم

1 والد صاحب قبلہ کی ولادت کے سلسلے میں خاندانی روایت بہت دلچسپ ہے۔ اس کا ذکر تو کیا جاچکا ہے کہ دادا صاحب (سید ظہورالحق شاہ) ترک سکونت کر کے مرادآباد سے چلے گئے تھے۔ اور حضرت بو علی شاہ قلندر (ف۔   ) کے مزار پر معتکف ہوگئے تھے۔ ایک روز اپنے ایک مرید سے جو ساتھ رہتے تھے فرمانے لگے کہ رات قلندر صاحب کو میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ انھوں نے مجھے گلاب کا ایک پھول دیا ہے' اس کی تعبیر یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا اور پیدا ہوگا اور ہمیں مرادآباد جانا چاہئے' چنانچہ چند ماہ کے لئے وہ مرادآباد تشریف لائے' ابھی والد صاحب پیدا نہیں ہوئے تھے کہ وہ واپس چلے گئے۔

یہی سبب ہے کہ والد صاحب اور ان کے دوسرے بہن بھائیوں کی عمروں میں کافی تفاوت تھا۔

2 اس زمانہ میں ہوٹلوں کا رواج زیادہ نہ تھا' اور اکثر شہروں میں مسافرخانے اور سرائیں ہوتی تھیں' مرادآباد کی سرائے خاصی وسیع ہے اور اس کا شمار بڑی سراؤں میں ہوتا ہے تین جانب (شمال' مغرب اور جنوب) بلند اور شاندار دروازے ہیں۔ وسط عمارت میں سڑک سے ملحق ایک مسجد ہے جس میں ہم کھیل کے میدان سے لوٹتے وقت کبھی مغرب کی نماز بھی ادا کرلیتے تھے۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ رامپور سے واپسی میں غالب اسی سرائے میں مقیم تھے' سید احمد خان سے جو مرادآباد میں صدر اعلیٰ تھے اس زمانے میں ان سے تعلقات کشیدہ تھے چنانچہ یہ سن کر کہ غالب سرائے میں مقیم ہیں وہ آئے اور ان کو اپنے مکان پر لے آئے (؟)

3 موروثی جائداد اور شہر کے مکانات، دونوں بیویوں کی اولاد میں شرعی قانون کے لحاظ سے تقسیم کئے تھے' لیکن علمی ورثہ صرف مولوی وزیر علی کے حصہ میں آیا' چنانچہ ان کے دوسرے عزیز واقربا' صرف صاحب جائداد ہوکر رہ گئے۔ ان کے خاندان میں علم اور پیشہ کے لحاظ سے طب کا سلسلہ جاری رہا۔ یہی سبب ہے کہ مولویوں کا خاندان صرف ان ہی کا خاندان کہلاتا تھا۔

4 حکیم امیر علی صاحب کی سادہ مزاجی اور انسانی ہمدردی کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکتا ہے جو ہمارے خاندان میں مشہور ہے۔ ایک غریب کمہار ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے گھر پر ایک مریض ہے۔ اس کو دیکھ لیجئے'

لیکن مجھ میں اتنی استطاعت نہیں کہ سواری کا انتظام کرسکوں' وہ پیدل چلے گئے۔ واپسی کے وقت کمہار نے ان کی خدمت میں اپنا بنایا ہوا ایک مٹی کا گھڑا پیش کیا' اگرچہ یہ ایسی چیز نہ تھی کہ ضرور لائی جائے لیکن ان کی شان درویشی نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک غریب شخص کو شکستہ خاطر ہونے کا موقع دیں' چنانچہ وہ گھڑا لے لیا اور کاندھے پر رکھ کر اس کو گھر لے آئے۔ موجودہ معاشری زندگی میں یہ جذبہ اور دوسروں کا دل رکھنے کے لئے اتنی تکلیف برداشت کرنا' ناممکنات میں سے ہے۔

5 ان کا ذکر آگے کیا جائیگا۔

6 والد صاحب قبلہ مولوی اسد علی کے اعلیٰ اخلاق سے متعلق یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ ان کے دونوں شاگرد یعنی منشی توصیف حسین اور مولوی شریعت اللہ' حقہ پینے کے عادی تھے۔ چنانچہ وہ نماز فجر سے پہلے اٹھ کر باورچی خانہ میں آگ جلاتے اور جلتا ہوا ایک اپلا لے جا کر ان دونوں کی چارپائیوں کے قریب رکھ دیتے اور پھر ان کو جگا کر فوراً مسجد چلے جاتے۔ اس طرح ان کو حقہ تیار کرنے کے لئے آگ دستیاب ہوتی۔

7 والد صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ جب شام ہوتی تو والد صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ "تم سوؤ گے کہاں"؟ میں نے کہا "جہاں اپ سوتے ہیں"۔ انھوں نے فرمایا "میں تو یہیں اس چٹائی کے ٹکڑے پر پڑا رہتا ہوں' میں نے کہا کہ" "میں بھی یہیں سو رہوں گا" انھوں نے فرمایا کہ "یہاں سانپ بھی ہیں اور بچھو بھی" "میں نے کہا کہ وہ آپ کو کاٹتے نہیں" "کہا ہاں کبھی کاٹ بھی لیتے ہیں" "میں تو اپنا اسب لگالیتا ہوں' اللہ

شفا دیتا ہے"۔ میں نے فوراً جواب دیا' "تو ٹھیک ہے' میں یہیں رہوں گا"۔

8 والد صاحب ارشاد فرماتے تھے کہ روز اندھیری رات میں مولوی اسد علی' شہر کے باہر سے اس راستہ سے آرہے تھے جو محلہ مغلپورہ میں شاہ مصطفیٰ کی مسجد کے برابر سے گذرتا ہے۔ اس وقت یہ غیرآباد تھا' وہ یہاں کسی خیالی چیز سے ڈرگئے اور اس کا اثر ان کے قلب پر اتنا زیادہ ہوا کہ گھر پہنچ کر بخار میں مبتلا ہوگئے اور اسی بیماری میں رحلت فرما گئے۔

9 ان کی شادی بڑے تایا صاحب یعنی سید شمس الحق کے صاحبزادے سید سلطان الحق سے ہوئی تھی' ان کے ایک فرزند سید عطاالحق پیدا ہوئے بعد میں وہ انتقال کرگئے۔

10 مرادآباد شہر سے چند میل پر دو گاؤں' بھوجپور' پیپل سانہ واقع ہیں' یہاں ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

11 ماسٹر عبدالحامد خان صاحب جن کو ہمارے خاندان میں صرف خان صاحب کہا جاتا تھا بہت سی خصوصیات اور خوبیوں کے حامل تھے' وہ میتھمیٹکس میں ایم اے تھے جو اس زمانے میں مسلمانوں میں ایک نادر شے تھی' خان صاحب لاابالی مزاج رکھتے تھے' ڈاڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی منڈواتے لیکن ان میں دو چار بال رہنے دیتے تھے' شیروانی پہنتے تھے جس کے تمام بٹن کھلے رہتے تھے' ہندوؤں کی مخصوص فلٹ کی بیضاوی ٹوپی استعمال کرتے' اخبار بینی کا بے حد شوق تھا' اردو کا اخبار ہر وقت ہاتھ میں ہوتا تھا' نہایت آہستہ چلتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے تھے اپنے مضمون میں نہایت قابل

تھے اور ہر طالب علم کی جو آجاتا مدد کرتے، میں بھی بعض
وقت مشکل سوال حل کرانے کے لئے ان کے پاس جاتا تھا، بے حد
بخیل تھے، شاید ایک گرم اور دو ٹھنڈی شیروانیاں تھیں، ان ہی
پر اکتفا کرلیا تھا، نوکر نہیں رکھتے تھے کھانا بازار میں کھاتے تھے
بعد میں والد صاحب قبلہ کے اسرار پر ہمارے گھر پر کھانے لگے
تھے، عرصہ گذر جانے کے بعد شاید کچھ معاوضہ کے طور پر ادا
کرتے تھے۔ چائے کی یہ شکل تھی کہ چولھے پر دیگچی میں کسی
لڑکے سے جو پڑھنے کی غرض سے آتا پانی گرم کرنے کو کہتے اور
اسی میں چائے کی پتی ڈال دیتے، جب تک یہ ختم نہ ہوجاتی
ہر دفعہ گرم کرلی جاتی، حیرت کی بات یہ تھی کہ انڈا بھی اسی
چائے میں ابال لیتے، ان کے اس قسم کے لطیفے ہم سب لوگ
آپس میں بیان کرتے رہتے، رات کو ہمارے گھر پر کافی دیر تک
اخبار کی خبریں سناتے رہتے تھے۔

خان صاحب رامپور کے رہنے والے تھے، بیوی اور گھر کی طرف
لاپرواہی کرتے چنانچہ انہیں سخت شکایت تھی۔ ایک عرصہ کے بعد
والد صاحب کی کوشش سے وہ بھی مرادآباد آگئیں اور قریب ہی
مکان لے لیا، خان صاحب ان کے پاس جاتے اور دوپہر کا کھانا بھی
وہیں کھانے لگے تھے لیکن رہتے علیحدہ ہی مکان میں، مگر بیٹی
پیدا ہونے کے بعد وہ بیوی کے ساتھ ہی رہنے لگے۔

باب سوم

1 سلطان محمود کی اس پالیسی پر کہ وہ دور دراز علاقوں پر اپنی
حکومت قائم نہیں کرتا تھا بلکہ مال غنیمت لے کر واپس چلا جاتا

تھا، اکثر مورخوں نے غلط انداز پر تنقید کی ہے۔ اس کا مقصد
صرف دولت حاصل کرنا نہیں تھا، جیسا کہ بعض مورخین کا خیال
ہے بلکہ اہم اور دور رس نتائج کا حاصل تھا اس کا حوصلہ تھا کہ
اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی تجارت کے لئے نئے میدانوں تک
راستے کھول کر اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے کے مواقع بہم
پہنچادئے۔ اس مسئلہ کا اس پس منظر میں مفصل مطالعہ نہیں
کیا گیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آمد
کا سلسلہ بڑے پیمانے پر قائم ہوگیا تھا ہمیں ابن الاثیر کے
بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان معزالدین کے خلاف جنگ
میں راجہ قنوج کی فوج میں ایک دستہ مسلمانوں کا بھی
موجود تھا۔

2 اس مسئلہ پر ہم نے تفصیلی بحث اپنے انگریزی تصنیف دی گریٹ
ریولیوشن آف ایٹین ففٹی سیون مطبوعہ کراچی (۱۹۶۸) کی ہے

3 سیف اللہ خان، میرے چھوٹے بھائی عزیزی سید رشید الحق سے
بہت محبت کرتے تھے، ایک مرتبہ رشید ٹائفائڈ میں مبتلا ہوگئے
اور حالت نازک ہوگئی، سات ہفتہ تک وہ اس بیماری میں مبتلا
رہے۔ یہاں تک کہ زبان بھی بند ہوگئی تھی۔ اس وقت
خان صاحب مذکور مرادآباد میں بزرگوں کے مزارات پر جاکر
گریہ و زاری کے ساتھ دعائیں مانگا کرتے تھے، خدا کے فضل
و کرم سے سات ہفتہ کے بعد وہ رو بہ صحت ہونے لگے اور آخرکار
مکمل شفا پائی اس خاندان کا یہ رواج تھا کہ سب نام سے پہلے
بھیا لگایا جاتا تھا۔ اس میں عمر کی قید نہ تھی۔

4 شیخ الٰہی بخش اور ان کے برادر خورد حافظ عبدالکریم انیسویں

صدی میں انگریزی فوج میں ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے اور اس میں انھوں نے اس قدر ترقی کی تھی کہ دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں شاید سب سے بڑے مسلمان رئیس ہوگئے تھے۔ جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت نے جامع مسجد دھلی پر قبضہ کرلیا اور اس کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی' بعد میں یہ ارادہ ترک کردیا اور اسی کو فوجی بارکوں کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔ بعد میں مسلمانوں کی درخواست پر تین لاکھ روپیہ لے کر اس کو واگذاشت کردیا۔ یہ ساری رقم شیخ الہٰی بخش صاحب نے ادا کی تھی۔ کچھ تفصیلات کے لئے دیکھو راقم الحرف کی تصنیف The Great Revolution of 1857

5 حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح ضلع دیوبند کے قصبہ تھانہ بھون میں قیام فرماتے تھے' اپنے عہد کے مشہور صوفی بزرگ تھے' ان کے خلفاء اور مریدین میں دیوبند کے متعدد علماء بھی تھے مثلاً مولانا رشید احمد گنگوھی' مولانا محمد قاسم وغیرہ جنگ آزادی میں باقاعدہ جہاد میں شریک ہوئے بعدہٗ ھجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔ مہاجر مکی مرحوم حاجی صاحب کے نام کا جز ان گیا تھا اور یہی اب ابھی مشہور ہے ان کے کچھ حالات کے لئے دیکھو The Great Revolution

6 نواب جھجھر کے حالات The Great Revolutton of 1857 میں دیکھ سکتے ھیں۔

7 شیخ علاء الدین علی احمد صابری رح کے مختصر لیکن مستند حالات کے لئے ملاحظہ ھو راقم کی تصنیف:
Islamic Thought and Movements in the Subcontinent

8 ارشاد علی خان ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ ریاضی میں ایم اے تھے جو اس زمانہ میں مسلمانوں میں بہت کم ہوتے تھے' خود ولاولد تھے لیکن ان کے برادر خورد فرزند علی خان ان کے ساتھ رہتے تھے' میرے شاگرد بھی تھے اور بے حد احترام کرتے تھے۔ مرحوم کے صاحبزادے مکرم علی خان پروفیسر نیشنل کالج کراچی' میں اپنے اجداد کی خصوصیات موجود ھیں' اور وہ مجھ کو اپنا بزرگ ھی سمجھتے ھیں' اگرچہ شاگرد نہیں ھیں۔ پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی کے معاملات میں دلچسپی لیتے ھیں اور اس کی انتظامیہ کے رکن بھی ھیں۔

ارشاد علی خان انتہائی سادہ مزاج رکھتے تھے۔ اپنے احباب سے بے حد محبت رکھتے تھے' انسانی ھمدردی ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ انگیزی لباس نہیں پہنتے تھے اور ڈاڑھی بھی رکھتے تھے' ان کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ریاضی میں ایم اے ھوں گے' بلکہ یہ معلوم ھوتا تھا کہ کوئی مولوی صاحب ھوں گے۔ پٹھانوں کی خصوصیت یعنی غصہ کی جھلک مزاج میں ضرور تھی اور گاہ بہ گاہ اس کا اظہار بھی ھوتا تھا' ویسے خوش مزاج تھے اور احباب کے درمیان گفتگو میں دلچسپ باتیں کرتے تھے طلبا سے ھمدردی کی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی طالب علم زیادہ بیمار ھوتا تھا تو مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر پہنچ جاتے تھے' ھفتہ میں ایک یا دو بار بھیاجی سے ملنے ضرور آتے تھے' اور اس سلسلہ میں مجھ سے خصوصی تعلقات بڑھ گئے تھے۔

[پروفیسر مکرم علی خان نیشنل کالج کے پرنسپل ھوگئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۹۳ء میں سرطان کے موذی مرض میں

انتقال فرما گئے۔ انصار]

9 مولوی ظفر حسن صاحب مرحوم کا کتب خانہ نہایت قیمتی اور قابل قدر ذخیرہ کتب تھا۔ اس میں کلام پاک کے چند نسخے تھے جو خطاطی اور نقاشی کے بہترین نمونے کہے جاسکتے تھے، ۱۹۴۷ کے قیامت خیز ہنگاموں میں جبکہ دہلی اور دیگر مقامات پر ہندو اور سکھوں بلوائیوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر کے مسلمانوں پر زندگی تلخ کردی تھی تو مولوی صاحب مرحوم کو بھی مع اہل و عیال ایک دن کے نوٹس پر وطن چھوڑنا پڑا۔ اس افراتفری میں کتب خانہ بھی دوسرے سامان کے ساتھ وہیں چھوڑنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر کتابوں کے لئے وہ بے تاب رہتے تھے، حالات بہتر ہوجانے پر انہوں نے اپنے داماد مسمی مظفر الملک ہاشمی کو دہلی بھیجا کہ اگر کچھ کتابیں مل سکیں تو لے آئیں۔ دہلی جاکر ان کو معلوم ہوا کہ دوسرے سامان کے ساتھ لوگ کتابیں بھی لوٹ کر لے گئے۔ چند نسخے جن کو لٹیروں نے اپنی دانست میں بے کار اور کم قیمت سمجھ کر چھوڑ دیا تھا وہ ایک کمرے میں جس کو انہوں نے اپنا کتب خانہ بنایا تھا، زمین پر پڑے تھے، یہ نسخے بڑی کوشش سے وہ اپنے ہمراہ لے آئے۔ ان میں بھی بعض نہایت نادر اور کمیاب تھے، مثلاً ثمرات القدس۔ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قران شریف، اور چند چھوٹی تقطیع کے خوش خط اور مزین اجزاء وہ اپنے ہمراہ لے آئے تھے، اب یہ نسخے قومی عجائب خانہ کراچی میں محفوظ ہیں۔

باب چہارم

1 اس کی کچھ تفصیلات اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ (شایع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی) میں موجود ہیں۔

2 ان تمام مسائل کا تفصیلی ذکر اور تاریخی پس منظر ہسٹری آف فریڈم مومنٹ اور دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ ہم نے صرف مختصر اشارات پر اکتفا کیا ہے۔

3 پاکستان کی تاریخ کا یہ ایک عظیم المیہ ہے کہ ہماری بعض سیاسی لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی اور مفاد پرستی کی بدولت بنگال یعنی مشرقی پاکستان میں علاقائیت کے تصور نے جنم لیا اور بنگالی قومیت کا جذبہ ابھرا۔ گورنر جنرل غلام محمد کی ہوس اقتدار نے ایسے حالات پیدا کردئے کہ بنگالیوں کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنا پڑا کے اردو کے ساتھ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان مان لیا جائے۔ اس وقت جن لوگوں کا اقتدار اور سیاسی قیادت پر قبضہ تھا ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ ایک ملک میں دو قومی زبانوں کا وجود درحقیقت قوم کے دو حصوں میں تقسیم ہوجانے کی بنیاد ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد دور آمریت میں اس تصور کو برابر قوت پہنچتی رہی، بالآخر اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ علیحدگی کی تحریک مشرقی پاکستان میں ابھری اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

4 ص - ۹۴

5 مولانا محمد علی جوہر نے بھی اپنے کانگریس کے خطبہ صدارت میں جس کا اجلاس ۱۹۲۳ میں کوکونڈا کے مقام پر ہوا تھا

اس کو Command Performance ہی کہا ہے۔ اس کی بعض توجیہات بھی پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس وقت تک کانگریس کے ساتھ مولانا کی عقیدت میں تزلزل پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ سے ان کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

[دراصل اس محاورہ کا مطلب ہے "بہترین کارکردگی پیش کرنا" دیکھیں Hodson, The Great Divide, p. 14 انصار]

6 اس ریاست کی بنیاد ایک کاکڑزئی پٹھان' نجابت خان نے ڈالی تھی' وہ محمد شاہ کے زمانے میں یہاں آئے تھے' ابتداً میں ریاست کا علاقہ وسیع تھا لیکن سکھوں نے اپنے دور اقتدار میں کافی حصہ پر قبضہ کرلیا اور محدود علاقہ نجابت خان کے جانشینوں کے پاس رہ گیا۔ کچھ تفصیل حیات آفتاب' مؤلفہ حبیب اللہ خان (مطبوعہ علیگڈھ) کے باب اول میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

7 مصنف "حیات آفتاب" حبیب اللہ خان مرحوم نے غلام احمد خان کو دادا صاحب رہ کی ہدایت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ انھوں نے صرف سولہ سال کی عمر تھی کہ انگریزی رسالہ میں فوجی نوکری کرلی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک درویش کے ارشاد کی تکمیل میں یہ فوجی نوکری چھوڑدی۔ مشیت کے راز انسان نہیں سمجھ سکتا۔ دو یا تین ہی ہفتے گذرنے پائے تھے کہ ۱۸۵۷ کا ہولناک غدر شروع ہوگیا اور غلام احمد خان کے بڑے بھائی اور چند قریب کے رشتہ دار جو رسالہ میں نوکر تھے مارے گئے" دیکھو حیات آفتاب (علیگڈھ ۱۹۴۷ مطبوعہ الہ آباد۔ ص۔ ۳۔

اس بیان سے جو آفتاب احمد خان کی ڈائری کے "اندراجات کی بنیاد پر مبنی ہے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ واقعہ کی تفصیل اور "درویش" کا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے' یہ بھی ممکن ہے کے مولف نے ان تفصیلات کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کردیا ہو۔

8 آفتاب احمد خان صاحب نے جس انداز سے مشائخ صوفیہ پر تنقید کی اس کا اثر والد صاحب قبلہ پر ظاہر ہے اچھا نہیں ہوا بہر حال انہوں نے اس سلسلہ میں مجھ سے کچھ زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن یہ ضرور کہا کے صاحبزادہ صاحب نے بزرگان دین کو بغیر کسی سبب اور جواز کے برا کہا ہے' یہ مناسب نہ تھا اور مجھے خطرہ ہے کہ ان کو کہیں مصائب اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اتفاق دیکھیئے کہ یونیورسٹی کے مختلف حلقوں میں وہ نا مقبول ہوتے گئے اور زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا' کہ ان کو وائس چانسلری سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کی تفصیلات آئندہ بیان کی جائیں گی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ عظیم مصیبت جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا یہ تھی کہ ان پر نہایت شدید فالج کا دورہ پڑا اور عرصہ تک وفات سے پہلے وہ صاحب فراش اور حرکت کرنے سے معذور رہے' یاد نہیں کہ کس کے ہمراہ لیکن ایک مرتبہ میں بھی ان کے ایام علالت میں ان کو دیکھنے گیا' اسقدر کمزور اور نحیف تھے کے بات بھی نہیں کرسکتے تھے' صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتے تھے۔

9 ان وقعات کو قدرے تفصیل سے لکھنے کا جواز یہی ہے کہ چشم دید ہیں اور ایسے ہمے کی شکل میں رونما ہوئے کہ اب تک

پیش نہیں ہوسکا۔

10 حیات آفتاب (مرتبہ حبیب اللہ خان) اور ضیائے حیات (مولفہ محمد امین زبیری) میں علی ترتیب، صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے حالات اور کارکردگی کی تفصیلات موجود ہیں لیکن دونوں کی نمایاں خصوصیات مداحی اور مبالغہ آمیزی کی جھلکیاں ہیں۔

11 ڈاکٹر شفاعت احمد خان نے مجھے نینی تال بلا کر ڈاکٹر تعلیمات یو پی، مسٹر میکنزی سے ملایا۔ لیکن اول تو وہ علیگڈھ کے خلاف تھا بلکہ اس کو مخاصمت سی پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ انٹر کالج کی سروس میں مجھے لینے کے لئے تیار نہ تھا اس نے صاف کہہ دیا کہ پہلے ایل ٹی کا امتحان پاس کرو۔

12 مولوی طفیل احمد منگلوری (ضلع سہارنپور یو پی) ایک پنشن یافتہ بزرگ تھے جو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اور ایجوکیشنل کانفرنس سے دلچسپی رکھتے تھے، اکثر علیگڈھ آتے اور خان بہادر حبیب اللہ خان، رٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کی کوٹھی پر قیام فرماتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مولوی طفیل احمد مسلمانوں کے اس اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو آنکھیں بند کر کے انڈین نیشنل کانگریس کی تائید کے قائل تھے۔ ان کی تصنیف جو مفید معلومات پر ہے، ان کے سیاسی خیالات کی آئینہ دار ہے، وہ مسلم لیگ تحریک علیگڈھ اور ان اداروں سے ناراض معلوم ہوتے ہیں اور ہر موقع پر ان پر تنقید کرتے ہیں جو کانگریس کے دامن سے خود کو وابستہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

13 افسوس ہے کہ اس یادداشت کے مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا۔

14 اردو میں سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت ہی کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا تصور لادینیت سے زیادہ وسیع ہے، اس لئے ہم انگریزی اصلاح کو بجنسہ ہی استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

باب پنجم

1 وائس چانسلر منتخب ہوجانے کے بعد مزمل اللہ خان کے طریقہ کار میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ طلبہ میں یہ مشہور تھا کہ نواب صاحب کی نظر میں پولس کے ایک سب انسپکٹر کا وقار وائس چانسلر سے زیادہ تھا۔ وہ دفتری کام اپنی کوٹھی پر کیا کرتے تھے، اگر اتفاق سے پولس افسر اور وائس چانسلر دونوں ایک ہی وقت ملاقات کے لئے آگئے تو اول الذکر کو پہلے موقع دیا جاتا تھا۔

2 اس کا انگریزی ترجمہ Open Letter to Gandhi پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شایع ہوچکا ہے۔

3 راس مسعود کے حالات کے لئے دیکھو ''شعلہ مستعجل'' مرتبہ جلیل احمد قدوائی۔

4 ہیکٹر بولا ٹیتھو: جناح دی کری ایٹر آف پاکستان۔ ص۔ ۹۰

5 قائداعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ کی تنظیم کا سلسلہ سنہ ۱۹۳۱ سے شروع ہوا، پہلا عمومی اجلاس بمبئی میں ہوا، دوسرا لکھنؤ میں ۱۹۳۷ میں اور تیسرا پٹنہ میں، دسمبر ۱۹۳۸ میں ہوا، اس کے بعد چوتھا اجلاس لاہور میں ہوا بعد ازاں عملی اجلاس مندرجہ ذیل مقامات میں ہوئے۔ مدراس (۱۹۴۱)

الہ آباد (۱۹۴۲) دهلی اپریل (۱۹۴۳) کراچی دسمبر (۱۹۴۳) خصوصی اجلاس کلکتہ اپریل سنہ (۱۹۳۸)۔

6 مثال کے طور پر دیکھو پروفیسر شریف المجاهد : قائداعظم جناح (کراچی: ۱۹۸۱) صفحہ ۱۰۱: نوٹ۔

7 تفصیلات کے لئے دیکھو، محمد امین زبیری : ضیائے حیات، کراچی ۱۶ تا ۱۵۲

8 سر اکبر حیدری اور سکندر حیات کے متعلق مولوی محمد امین زبیری نوٹ میں لکھتے ہیں : "سر اکبر جو پہلے موئدین کی صف اول میں تھے اور ان کے همراہ کورٹ کے ممبروں کی معقول تعداد آئی تھی، اب محض اس لئے مخالف ہوگئے تھے کہ ان کو خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں، ان کے خلاف اور نظام کی تائید میں پروپاگنڈا کرتے ہیں۔ انی زمانہ میں دونوں کے مابین سخت اختلاف تھا اور نظام کی خواهش تھی کہ سر اکبر وزارت عظمیٰ سے سبکدوش کردئے جائیں"

سر سکندر حیات کی مخالفت کا سبب یہ بتلاتے ہیں کہ "ڈاکٹر صاحب نے ذاتی تحقیقات کر کے پرائیوٹ طور پر ان مظالم کی ایک یاد داشت وائسرائے کو بھیجی تھی، اور وائسرائے نے اس کو سر سکندر کے پاس بھیج دیا۔ اس کے علاوہ اپنے سیاسی مصالح کی بناء پر سر شیخ (عبدالقادر) کو صوبہ پنجاب سے باہر رکھنا چاہتے تھے" دیکھو ص۔ ۱۵۸

9 حفیظ الرحمٰن، باقاعدہ وکالت کرتے تھے، اور اکثر مسلمان وکلاء کی طرح کچہریوں میں ان کو مولوی ہی کہا جاتا تھا۔

10 برصغیر کی جنگ آزادی کے دوران جو ایک لحاظ سے ۱۸۵۷

کے کچھ عرصہ بعد ہی سے شروع ہوگئی تھی، اس میں ہندو اور مسلم، دونوں قوموں نے کوشش کی اور قربانیاں دیں۔ کبھی متحد ہو کر اور کبھی علیحدہ راستے اختیار کرکے۔ لیکن ہندو قوم نے مکمل طریقہ پر مسلمانوں کی طرف وہ برادرانہ رویہ اختیار نہیں کیا جس کی ایک اکثریتی قوم سے توقع کی جاتی تھی اس زمانہ میں بھی جب دونوں میں اتحاد کے عہد نامے تھے، ہندو لیڈروں میں چند ہی ایسے ہوتے تھے جن کا رویہ منصفانہ کہا جاسکتا تھا، اور جب ان کو موقع مل جاتا وہ بھی معاندانہ انداز اختیار کرلیتے۔ مثال کے طور پر موتی لال نہرو جب دستور سازی کمیٹی کے چیرمین ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق ختم کردیا۔

باب ششم

1 ان میں قابل ذکر یہ ہیں: ڈاکٹر ظفرالحسن (فلسفہ)۔ ڈاکٹر عابد احمد علی (عربی) ڈاکٹر ایم ایم احمد (فلسفہ)۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری (زولوجی)۔ جمیل الدین (انگریزی)۔ مسٹر عنایت علی (زولوجی)۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (تاریخ)۔ مسٹر حفیظ الرحمٰن (قانون)۔ راقم الحروف (تاریخ)۔

2 لیگ کی شاخیں ہر ضلع اور ہر شہر میں ہوتی تھیں اور ان کا تعلق براہ راست صوبائی لیگ سے ہوتا تھا، لیکن مسلم یونیورسٹی کی اہمیت کے پیش نظر آل انڈیا مسلم لیگ نے یونیورسٹی میں علیگڈھ شہری لیگ سے علیحدہ لیگ کی شاخ قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

3 مولوی اشفاق علی صاحب پھوپی زاد بھائی ہونے کے علاوہ میرے خسر بھی تھے' دھلی کے لال قلعہ میں عجائب خانہ کے کیوریٹر تھے' رٹائر ہونے کے بعد دھلی ھی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور دریاگنج کے علاقے میں اپنا مکان تعمیر کرلیا تھا' نہایت وسیع الاخلاق' دوست نواز اور خوش مزاج تھے۔ ان کی بڑی صاحبزادی اختر زمانی (مسز شکور) محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کرچکی تھیں اور یہ کوارٹر ان ھی کو ملا تھا۔

4 غلام علی تالپور' ٹنڈو محمد خان کے ایک بڑے جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے' انہوں نے میٹرک میں داخلہ علیگڈھ انٹر کالج میں لیا۔ پرنسپل عبدالمجید قریشی نے مجھ سے کہا کہ یہ دونوں صاحبزادے ھاسٹل کی زندگی سے گھبراتے ھیں' تم اپنے گھر میں تنہا رھتے ھو' میں تم کو ان کا گارجین (سرپرست) مقرر کئے دیتا ھو۔ ایک کمرہ ان کو دے کر اپنے ساتھ رکھ لو' چنانچہ ایک سال وہ وھیں قیام پزیر رھے۔ اس کے بعد وہ علیگڈھ سے واپس سندھ آ گئے۔

5 آج ھی (۱۳ فروری سنہ ۸۶ء) کے اخبار میں ایک اھم سیاسی لیڈر نے اپنی تقریر میں اس کی شکایت کی ھے کہ حکومت پاکستان تعلیم اور صحت پر اپنے بجٹ کا صرف ۴ فیصد حصہ خرچ کرتی ھے۔ یقیناً یہ امر تکلیف دہ ھے- لیکن اس سے قابل اعتراض بات یہ ھے کہ جن لوگوں نے پرایویٹ تعلیمی ادارے کھولے ھیں وہ ان کے ذریعہ روپیہ کمارھے ھیں- اور فیس اس قدر زیادہ ھے کہ صرف امیر لوگ ھی اپنے بچوں کو وھاں بھیج سکتے ھیں اور ظاھر ھے کہ ان کی تعداد غرباء کے مقابلہ میں بہت کم ھے۔

6 پاکستان کی تاریخ کے پہلے چھہ سال میں جب کہ اس نوزائیدہ مملکت کو بہت سی مشکلات اور نہایت پیچیدہ اور نازک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رھا تھا تین عظیم المیوں کا اشارۃً ذکر ضروری ھے کیونکہ ان کے نتیجہ میں ملک کی سیاسی اور دستوری تاریخ میں ایسے واقعات اور انقلابات رونما ھوئے' جنہوں نے قوم کے لئے لاتعداد دشواریاں پیدا کردیں۔

سب سے پہلا اور سب سے بڑا المیہ' قائداعظم کی وفات تھی- بانی پاکستان اس کی تخلیق کے بعد صرف تیرہ ماہ زندہ رھے' اور ستمبر سنہ ۱۹۴۸ میں ان کی وفات حسرت آیات واقع ھوئی- دوسرا المیہ پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کی شہادت تھی' جو سنہ ۱۹۵۱ میں ایک سازش کے نتیجہ میں واقع ھوئی- قائداعظم کی وفات پر خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ھوئے تھے- لیاقت علیخان کی شہادت کے بعد' ان کو وزیراعظم مقرر کیا گیا تھا' اور غلام محمد گورنر جنرل بنے تھے' انہوں نے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کی منظوری سے جو اس وقت مملکت کی برائے نام سربراہ تھیں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کردیا-

———:o:———

NOTE

"The sacred *aayat* from the Holy Qur'ān and *aḥādīth* have been printed for *Tabligh* and for increase of your religious knowledge. It is your duty to ensure their sanctity. Therefore, the pages on which these are printed should be disposed of in proper Islamic manner".

ACKNOWLEDGMENT

The Society is grateful to the Ministry of Education Govt. of Pakistan for its aid in the publication of this Work.

Khurshid condoles Hamidullah's death

Our correspondent

ISLAMABAD: Professor Khurshid Ahmad, naib amir of the Jamaat-e-Islami, has expressed sorrow over the death of Dr. Hamidullah and described him as one of the greatest scholars produced by the 'Ummah' in the twentieth century.

He said that Dr. Hamidullah dedicated his life to research and da'wah and not only the Muslim 'Ummah' but even non-Muslims have benefited from his scholarship and articulation of the Islamic message.

Professor Khurshid Ahmad said that he had the honour of translating Holy Qur'aan into French language and also writing a book on 'Seerat' of Prophet Muhammed (peace be upon him) in French. He had command over nine languages and wrote directly in at least five languages of the world, he said.

روزنامہ مساوات - لاہور ۲۰ جولائی سنہ ۹۴ء

کتابوں پر تبصرہ

معین بیتی

پاکستان کے مایہ ناز مورخ اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن ڈاکٹر سید معین الحق مرحوم کی خودنوشت۔
ترتیب و تدوین۔ ڈاکٹر انصار زاہد خان اور مسز ممتاز معین الحق
صفحات ----- ۳۴۰
قیمت ----- ۲۰۰ روپے
شائع کردہ --- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۳۰ ڈاکٹر معین الحق روڈ، بی ای سی ایچ ایس

تبصرہ نگار ----- رضا علی

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں معاشرے کو اپنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس اعتبار سے داستان گوئی اور تاریخ نویسی میں نمایاں فرق ہے۔ داستان گو اپنے قارئین یا سامعین کی تفریح طبع کی خاطر ماضی کے واقعات کو مناسب رنگ آمیزی کے ساتھ ڈرامائی انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس کے برعکس مورخ واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے وقت حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے اور ان واقعات و رجحانات کا سائنٹفک انداز میں تجزیہ بھی کرتا ہے تاکہ معاشرہ ان تشریحات کی روشنی میں اپنے لئے فکر و عمل کی راہیں متعین کرسکے۔ ماضی کے ان واقعات اور رجحانات کی تشریح و توضیح میں مورخ کے ذاتی تجربات، مشاہدات، مخصوص نکتہ نظر اور ذاتی پسند و ناپسند کا بھی دخل ہوتا ہے اس اعتبار سے مورخین کی شخصیت کے ہمہ جہتی مطالعے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں تاریخ کے تجزیاتی مطالعے اور تحقیق کا ذوق و شوق اور شعور اجاگر کرنے نیز قومی تاریخ سے متعلقہ اہم موضوعات پر غور و فکر کے لئے موزوں و مناسب ماحول فراہم کرنے میں ملک کے نامور مورخ "استاذ الاساتذہ" ڈاکٹر سید معین الحق نے مجاہد اول کا کردار ادا کیا ہے۔ مرحوم تحریک پاکستان پر ایک معرکتہ الآرا کتاب "روڈ وے ٹو پاکستان" کے علاوہ برصغیر کی تاریخ سے متعلق موضوعات پر متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے۔ پاکستان میں تاریخ کے مطالعے اور تحقیق کے لئے انفرادی کاوشوں کو مربوط کرنے کی خاطر ڈاکٹر صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ۵۰ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہوئی جس کے وہ تاحیات جنرل سیکرٹری رہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مورخ ہی نہیں تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اس دوران رونما ہونے والے تاریخ ساز واقعات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ دنیائے حکمت و دانش کی مقبول و معروف یگانہ روزگار شخصیت حکیم محمد سعید نے جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر بھی ہیں ڈاکٹر معین الحق کی علمی و ادبی خدمات نیز فن تاریخ نویسی میں اعلیٰ مہارت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کو "مورخ عصر" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی حیات مستعار کے آخری ایام میں بزبان انگریزی کی ایک معرکتہ الآرا کتاب تصنیف کی جو بقول حکیم صاحب سیرت نگاری کی ایک منفرد شان رکھتی ہے اور حسن خیال نیز تاریخ کے جمال فکر کی آئینہ دار ہے۔ مرحوم نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اس شاہکار تصنیف کا پیش لفظ تحریر کیا اور اگلے ہی روز یعنی بروز جمعہ ۲۰ اکتوبر اس توشۂ آخرت کے ساتھ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ سیرت پاک ﷺ پر فکر و تدبر اور تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب تاریخ کا قرض چکانے کے لئے اپنی پرہنگام لیکن بامقصد زندگی کے شب و روز پر مشتمل یادداشتیں قلم بند کرتے رہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے اس سرگزشت کو "معین بیتی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس مسودے پر نظر ثانی کی مہلت نہیں مل سکی تھی اس لئے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے موجودہ جنرل سیکرٹری ڈاکٹر انصار زاہد خان اور مرحوم کی اہلیہ محترمہ نے جو خود بھی تاریخ دان کی حیثیت سے معروف شخصیت کی حامل اور سوسائٹی کی نائب صدر ہیں ترتیب و تدوین کا فرض انجام دیا تاہم خود عائد کردہ پابندی کے سبب اصل مسودے میں کوئی بنیادی ترمیم نہیں کی۔

"معین بیتی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر معین الحق کی خودنوشت سوانح ہے لیکن عملاً یہ مسلمانان برصغیر کے ایک اہم اور پرہنگام دور یعنی تحریک پاکستان کی ایسی روداد ہے جس میں قیام پاکستان کے تاریخی پس منظر اور مسلمانوں کے سیاسی و سماجی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ معین بیتی کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک سن رسیدہ مورخ جس کا درس و تدریس سے جذباتی تعلق ہے اور تحریک پاکستان کا پرجوش کارکن بھی رہا ہے۔ شاگردان رشید کی محفل میں اپنی داستان حیات بیان کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک راسخ العقیدہ مسلمان، عاشق وطن اور علم پرور استاد کی حیثیت سے اپنی روحانی اولاد کے ذہن و قلب میں سرزمین پاک کی محبت و عظمت کے نقوش مرتسم کرنا چاہتا ہے۔ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بہ مشکل چالیس فیصد مواد ڈاکٹر صاحب کی اپنی ذات، آباؤ اجداد اور دیگر اہل خاندان سے متعلق ہے جبکہ باقی ماندہ صفحات میں اس خطہ ارضی کے کوائف و حالات بیان کئے گئے ہیں، جہاں سرسید احمد خاں نے دو قومی نظریئے کی روشنی میں اصلاحی تحریک کا آغاز کیا، جہاں علامہ اقبال نے خطبۂ الہ آباد کی صورت میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا نظریہ پیش کیا اور جہاں قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں حصول پاکستان کی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔

امر واقعہ ہے کہ قیام پاکستان کی مخالفت بعض بیرونی و داخلی قوتیں تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی اس مملکت خداداد کے وجود کے خلاف مذموم سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایک قومی المیہ یہ بھی ہے کہ اس طویل مدت کے دوران حکمران طبقے کی ریشہ دوانیوں، بداعمالیوں اور غلط کاریوں کے سبب پاکستان میں اسلامی فلاحی معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آسکا جس کا خواب اسلامیان ہند، بالخصوص تحریک پاکستان کے بے لوث کارکنوں نے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ مذہبی، نسلی، لسانی، سماجی، ثقافتی، طبقاتی اور قبائلی گروہ بندیوں کا شکار ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بعض دانشور حلقوں میں قیام پاکستان کے جواز کو موضوع بحث بنا کر وطن عزیز کی نظریاتی بنیادوں کو غیر محسوس طور پر نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ نظریہ پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات اور سیاستدانوں کی مسلسل ناکامیوں کے نتیجے میں معاشرتی و اخلاقی انحطاط کا عمل روز بروز شدت اختیار کر رہا ہے۔ پاکستانی عوام پاکستان بے گانہ ہو رہے ہیں، قومیتوں کے حوالے سے شناخت کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور علاقائی خودمختاری کے نام پر علیحدگی پسندی کے مہلک جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس نے اپنی جوانی کے لیل و نہار حصول پاکستان کے لئے صبر آزما جدوجہد میں بسر کئے ہوں اور تقسیم برصغیر کے بعد اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر میلائے پاکستان کی زلفیں سنوارنا اپنا مقصد حیات بنا لیا ہو مذکورہ بالا صورت حال کس قدر کرب ناک اور اعصاب شکن ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود بھی ایسے ہی اذیت ناک تجربے سے گزر رہے ہوں۔ بہ ایں ہمہ مقام حیرت ہے کہ زیر نظر کتاب یا متعلقہ موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کی کسی بھی تصنیف میں مایوسی، ناامیدی اور قنوطیت کا خفیف سا تاثر بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس مرحوم کے تحریری رجحانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے اس المیے کو بطور چیلنج قبول کیا اور نئی نسل کو کسی نہ کسی بہانے تاریخ کا آئینہ دکھا کر حق و باطل میں امتیاز کرنے کا شعور اجاگر کیا اور مستقبل کے لئے راہ عمل متعین کرنے میں بالواسطہ طور پر رہنمائی کی۔ انہوں نے تحریک پاکستان اور دو قومی نظریئے کے حوالے سے مسلمانان برصغیر کی حالیہ تاریخ کی اس انداز سے تشریح کی ہے کہ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے وہ عناصر جو اپنی مشترکہ قومی شناخت کو فراموش کرکے انفرادی یا گروہی شناخت کی تلاش میں تاریک راہوں پر بھٹک رہے ہیں اپنی حقیقی منزل کا نشان پاسکیں۔

ایک مورخ پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ قومی مسائل کا کوئی حل بتائے یا مختلف معاشرتی امراض سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی تیر بہ ہدف نسخہ تجویز کرے۔ وہ معروضی کیفیت حالات سے مشابہ تاریخی واقعات کا تجزیہ اور تشریح کرکے ابنائے وطن کو غلط روی اور گمراہی کے منطقی نتائج یعنی انحطاط اور زوال کے خدشات سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر معین الحق نے اس قومی ذمہ داری کو خلوص نیت کے ساتھ نبھایا ہے۔ زیر نظر خودنوشت معین بیتی میں مسلمانان برصغیر کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ سے متعلق موضوعات پر تحقیقی مضامین اور تبصرے شامل ہیں جن میں حسب ذیل خاص طور پر قابل توجہ ہیں --- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مراد آباد (مرحوم کا وطن مالوف) کا حصہ، علی گڑھ تحریک کا سیاسی پہلو، انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمان زمینداروں کی تباہ حالی، اسلامی معاشرے کی تشکیل میں صوفیاء کا حصہ، علی گڑھ کی مرکزی حیثیت، اردو ہندی قضیہ، آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام، تحریک خلافت، ترک موالات، علامہ اقبال کا خطبہ۔ تحریک و تخلیق پاکستان ----

تحریک پاکستان میں مسلم یونیورسٹی کے ہراول دستے کی اہمیت حاصل تھی۔ قائداعظم کی براہ راست راہنمائی میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء نے مجاہدانہ جوش و خروش، ایثار و قربانی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور مسلم لیگ کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے تحریک پاکستان کے مختلف مراحل کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس دوران انہیں قائداعظم اور قائد ملت سمیت مختلف سربرآوردہ شخصیات کے ساتھ براہ راست روابط کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ معین بیتی میں انہوں نے اس تاریخ ساز واقعات کا اجمالاً "ذکر کیا ہے اور تاریخ پاکستان کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک نظروں سے مخفی رہے ہیں۔

دو قومی نظریئے اور تخلیق پاکستان کی مخالفت پر کمربستہ بعض عناصر وطن عزیز کی نظریاتی اساس کے بارے میں شکوک و شبہات اور وسوسے پیدا کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کر رہے ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے بعض نام نہاد دانشور مسلمہ تاریخی حقائق کے برعکس یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ برصغیر میں اقلیتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے اپنے معاشی، سماجی اور سیاسی مفادات کی خاطر تحریک و تشکیل پاکستان کا ڈرامہ رچایا تھا جبکہ اکثریتی صوبوں کا اس منصوبے سے کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اسی وجہ سے انہوں نے تحریک میں سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر معین الحق نے اپنی سوانح حیات میں تحریک پاکستان کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے جو مذکورہ دانشورانہ بددیانتی کا واقعاتی اور منطقی اعتبار سے مسکت جواب ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمان یہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود کہ پاکستان میں وہی علاقے شامل ہوں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور انہیں خود ہندو اکثریت والے علاقوں میں بحیثیت اقلیت رہنا ہوگا اس تحریک میں نہایت خلوص اور دل و جان سے حصہ لیا۔ قائداعظم نے علی گڑھ میں کارکنوں کے ایک پرجوش اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کو جو حصول پاکستان کے لئے اپنی جانیں پیش کر رہے ہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ پاکستان کی تخلیق کے بعد اس سے انہیں کوئی مادی اور دنیاوی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ خودمختار ریاست قائم ہونے کے بعد مادی فوائد ان ہی لوگوں کے حصے میں آئیں گے جو اس ریاست کے باشندے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول اس قسم کے مواقع پر جاں نثار ہمیشہ یہی جواب دیتے تھے کہ وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہوئے تحریک پاکستان کے لئے اس مقصد سے کام کر رہے ہیں کہ اس نئی مملکت میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اسلامی نظریات کی بنیاد پر معاشرہ قائم ہوگا۔ اسلامی عقائد کی رو سے یہ کار خیر ہے اور ان کے اس ایثار اور قربانیوں کا ثواب اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور ملے گا۔" ڈاکٹر صاحب نے ان حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے سبب اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں نے بہ حالت مجبوری ترک وطن کا فیصلہ کیا اور ہجرت کی صبر آزما مشکلات کو سنت رسول ﷺ سمجھ کر دل و جان سے قبول کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب حیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں مسلم یونیورسٹی سے وابستگی اور نقل مکانی کے بعد کراچی میں رہائش کے دوران بعض معروف شخصیات کی جانب سے خلاف توقع سرد مہری، بے مروتی یہاں تک کہ بغض و عناد پر مبنی طرز عمل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ہجرت کے بعد نامساعد حالت میں یہ کیفیت یقیناً صبر آزما تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے دل برداشتہ ہونے کی بجائے بے مہری زمانہ کو مشیت ایزدی سمجھا اور اپنی سرگزشت میں ان بزرگوں اور شناساؤں کا ذکر کرتے ہوئے کوئی ایسا تاثر نہیں دیا جس سے ذاتی مخالفت یا تعصب کا شبہ پیدا ہو۔ ایک مورخ کے کردار میں اعلیٰ ظرفی اور وضع داری کے یہ اوصاف بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

معین بیتی کا پیش لفظ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے مربی اور تاحیات صدر حکیم محمد سعید کا تحریر کردہ ہے جبکہ سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر انصار زاہد خاں نے اپنے ممدوح یعنی ڈاکٹر معین الحق کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی یادگار یعنی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی کارکردگی کا مختصر جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے ضمیمے میں ڈاکٹر معین الحق کا نسب نامہ اور گیارہ کتابوں کی ایک فہرست شامل ہے جس میں مرحوم کے مورث اعلیٰ سید نا حضرت شاہ ابراہیمؒ کے حالات و مشاغل کی تفصیلات موجود ہیں بہتر ہوتا کہ ان کتابوں کے مصنفین کے اسمائے گرامی بھی درج کردیئے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سرگزشت میں متعدد معروف و غیر معروف مقامات کا ذکر کیا ہے اس لئے ضروری تھا مراد آباد شہر اور ارد گرد کے موضع جات کا خصوصی نقشہ بھی کتاب میں شامل ہوتا۔ بعض شخصیات اور مقامات کی تصاویر بھی ضروری تھیں علاوہ ازیں کتاب کے گرد پوش کی عدم موجودگی بھی قابل توجہ ہے۔

معین بیتی کا مطالعہ نہ صرف ڈاکٹر معین الحق کے عزیز و اقارب، احباب اور مداحین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا بلکہ سابق ساکنان مراد آباد و میرٹھ کو بھی اس کتاب میں اپنے دور ماضی کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مزید برآں تاریخ پاکستان کے مطالعے سے شغف رکھنے والے حضرات کے لئے بھی مورخ پاکستان کی یہ سرگزشت مفید ثابت ہوگی۔

معین بیتی

رضا علی

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں معاشرے کو اپنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے اس اعتبار سے داستان گوئی اور تاریخ نویسی میں نمایاں فرق ہے داستان گو اپنے قارئین یا سامعین کی تفریح طبع کی خاطر ماضی کے واقعات کو مناسب رنگ آمیزی کے ساتھ ڈرامائی انداز میں بیان کرتا ہے اس کے برعکس مورخ واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے وقت حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے اور ان واقعات و رجحانات کا سائنٹیفک انداز میں تجزیہ بھی کرتا ہے تاکہ معاشرہ ان تشریحات کی روشنی میں اپنے لئے فکر و عمل کی راہیں متعین کر سکے۔ ماضی کے ان واقعات اور رجحانات کی تشریح و توضیح میں مورخ کے تجربات مشاہدات مخصوص نکتہ نظر اور ذاتی پسند و ناپسند کا بھی دخل ہوتا ہے اس اعتبار سے مورخین کی شخصیت کے ہمہ جہتی مطالعے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں تاریخ کے تجزیاتی مطالعے اور تحقیق کا ذوق و شوق اور شعور اجاگر کرنے نیز قومی تاریخ سے متعلق اہم موضوعات پر غور و فکر کے لئے موزوں و مناسب ماحول فراہم کرنے میں ملک کے نامور مورخ استاد الاساتذہ ڈاکٹر سید معین الحق نے مجاہد اول کا کردار ادا کیا ہے مرحوم تحریک پاکستان پر ایک معرکتہ الاراء کتاب "روڈوے ٹو پاکستان" کے علاوہ برصغیر کی تاریخ سے متعلقہ موضوعات پر متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے۔

پاکستان میں تاریخ کے مطالعے اور تحقیق کے لئے انفرادی کاوشوں کو مربوط کرنے کی خاطر ڈاکٹر صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہوئی جس کے وہ تاحیات جنرل سیکرٹری رہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مورخ ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اس دوران رونما ہونے والے تاریخ ساز واقعات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ دنیائے حکمت و دانش کی مقبول و معروف یگانہ روزگار شخصیت حکیم محمد سعید نے جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر بھی ہیں ڈاکٹر معین الحق کی علمی و ادبی خدمات نیز فن تاریخ نویسی میں اعلیٰ مہارت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کو مورخ عصر قرار دیا ہے ڈاکٹر صاحب نے اپنی حیات مستعار کے آخری ایام میں سیرت طیبہ پر محققانہ اور عالمانہ انداز میں بزبان انگریزی ایک معرکتہ الاراء کتاب تصنیف کی جو بقول حکیم صاحب سیرت نگاری کی ایک منفرد شان رکھتی ہے اور حسن خیال نیز تاریخ کے جمال فکر کی آئینہ دار ہے۔ مرحوم نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اس شاہکار تصنیف کا پیش لفظ تحریر کیا اور اگلے ہی روز یعنی بروز جمعہ ۲۰ اکتوبر اس توشہ آخرت کے ساتھ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ سیرت پاک پر فکر و تدبر اور تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب تاریخ کا قرض چکانے کے لئے اپنی پرہنگام لیکن بامقصد زندگی کے شب و روز پر مشتمل یادداشتیں قلم بند کرتے رہے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے اس سرگزشت کو معین بیتی کے نام سے شائع کیا ہے ڈاکٹر صاحب کو اس مسودے پر نظر ثانی کی مہلت نہیں مل سکی تھی اس لئے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے موجودہ جنرل سیکرٹری ڈاکٹر انصار زاہد خان اور مرحوم کی اہلیہ محترمہ نے جو خود بھی تاریخ دان کی حیثیت سے معروف شخصیت کی حامل اور سوسائٹی کی نائب صدر ہیں ترتیب و تدوین کا فرض انجام دیا تاہم خود عائد کردہ پابندی کے سبب اصل مسودے میں کوئی بنیادی ترمیم نہیں کی۔

معین بیتی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر معین الحق کی خود نوشت سوانح ہے لیکن عملاً یہ مسلمانان برصغیر کے ایک اہم اور پرہنگام دور یعنی تحریک پاکستان کی ایسی روداد ہے جس میں قیام پاکستان کے تاریخی پس منظر اور مسلمانوں کے سیاسی و سماجی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے معین بیتی کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک سن رسیدہ مورخ جس کا درس و تدریس سے جذباتی تعلق ہے اور تحریک پاکستان کا پرجوش کارکن بھی رہا ہے شاگردان رشید کی محفل میں اپنی داستان حیات بیان کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک راسخ العقیدہ مسلمان عاشق وطن اور علم پرور استاد کی حیثیت سے اپنی روحانی اولاد کے ذہن و قلب میں سرزمین پاک کی محبت و عظمت کے نقوش مرتسم کرنا چاہتا ہے۔ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بہ مشکل چالیس فیصد مواد ڈاکٹر صاحب کی اپنی ذات آباؤ اجداد اور دیگر اہل خاندان سے متعلق ہے جبکہ باقی ماندہ صفحات میں اس خطہ ارضی کے کوائف و حالات بیان کئے ہیں۔ جہاں سرسید احمد خان نے دو قومی نظریے کی روشنی میں اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جہاں علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد کی صورت میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا نظریہ پیش کیا اور جہاں قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں حصول پاکستان کی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔